حرف و اثر
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

حرف واثر

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

○

والدہ مرحومہ کی یاد میں

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

○○○

حرف واثر

(مجموعہ مضامین)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

ترتیب

مضامین

ضمیمہ

•••

دیباچہ

''حرف واثر'' میرے علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی مضامین کا ساتواں مجموعہ ہے۔
اس سے پہلے ناچیز راقم کے درج ذیل مجموعہ ہائے مضامین ومقالات شائع ہو چکے ہیں:

۱۔عظمت کے نشاں	۲۰۰۵ء	اتر پردیش اردو اکادمی انعام یافتہ
۲۔متعلقات شبلی	۲۰۰۸ء	اتر پردیش اردو اکادمی انعام یافتہ
۳۔مطالعات ومشاہدات	۲۰۱۰ء	
۴۔عکس واثر	۲۰۱۳ء	
۵۔شبلی اور جہان شبلی	۲۰۱۵ء	
۶۔قد اور سائے	۲۰۱۹ء	

الحمدللہ ان مجموعہ مضامین نے بڑی مقبولیت پائی۔اہل علم اور ارباب کمال نے سراہا اور انہیں مفید مطلب قرار دیا۔کئی ادبی و تعلیمی اداروں نے انعامات سے نوازا۔یہی وجہ ہے کہ بعض مجموعوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی نکلے۔اور اب بھی ان کے تقاضے آتے رہتے ہیں۔

۲۰۱۶ء میں راقم الحروف شدید بیمار ہوا اور نوبت بائی پاس سرجری تک جا پہنچی۔آپریشن کے بعد بعض احباب نے متوجہ کیا کہ جو علمی و تحقیقی اور تصنیفی منصوبے نامکمل ہیں انہیں ترجیحی بنیاد پر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔چنانچہ اللہ نے توفیق بخشی اور کئی ادھورے کام پایۂ تکمیل کو پہنچے۔اور ملک و بیرون کے مشہور اشاعتی اداروں سے شائع ہوئے۔ان میں نوادرات شبلی، نقوش شبلی، کلام شبلی کے اعلام واشخاص، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ، علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو، تصانیف شبلی کے تراجم، خطبات شبلی نو دریافت، افادات شبلی اور علامہ شبلی کے فارسی خطوط ایک

مطالعہ قابل ذکر ہیں۔

اسی دوران بعض احباب نے رسائل میں منتشر مضامین کے جمع وترتیب کا بھی مشورہ دیا اور نہ صرف مشورہ دیا بلکہ رسائل وجراید سے انہیں یکجا کرنے میں اپنا تعاون بھی پیش کیا۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر کل ۳۱ر مضامین یکجا ہوگئے۔ ان میں سے ۲۵ر مضامین ''حرف واثر'' میں شامل ہیں۔ بقیہ چھ مضامین جو اس میں شامل نہیں کئے گئے ہیں ان کے عناوین یہ ہیں۔

۱۔ ازواج مطہراتؓ اور عہد حاضر کی خواتین

۲۔ فن قرات کی اہمیت اور ضرورت

۳۔ قرائے سبعہ اور ان کے رواۃ کا تعلق بالقرآن

۴۔ قرائے سبعہ اور ان کے رواۃ کی علمی ودینی خدمات

۵۔ ایوان علم وادب: دارالمصنّفین اعظم گڑھ

۶۔ فتاویٰ دارالعلوم۔ ایک تاثر

ان میں اول وآخر کے دونوں مضامین کا اس مجموعہ سے کوئی میل نہیں تھا، اس لئے انہیں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ بقیہ مضامین میری قدیم مطبوعہ کتب تذکرۃ القراء، قرائے عظام کی علمی و دینی خدمات اور دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات مطبوعہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے ماخوذ ہیں۔ ناظرین انہیں ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

گذشتہ مجموعہ ہائے مضامین کی طرح اس نئے مجموعہ میں بھی بڑا تنوع، طرفگی اور گونا گونی ہے۔ اس میں اردو زبان وادب کے نامور ادیب ونقاد، شاعر اور محققین ومصنفین اور ان کی کاوشوں کا ذکر قدرے تفصیل سے ہے۔ اس کا آغاز سرسید احمد خاں کے اعظم گڑھ سے تعلق اور ان کی ایک نادر تقریر سے ہوا ہے، جو انہوں نے اعظم گڑھ میں امراء ورؤسا اور ملت کے بہی خواہوں کے سامنے ۱۸۷۴ء میں کی تھی اور انہیں ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اور اس کتاب کا خاتمہ آبروئے اردو اور نامور نقاد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے ذکر پر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں جن ادبا وشعرا اور اہل علم وکمال کا ذکر آیا ہے وہ اردو کے ممتاز ترین اشخاص میں شمار ہوتے ہیں۔ البتہ اس میں دو اشخاص استثنائی صورت کے حامل ہیں۔ ان میں ایک مصر کے سابق

صدر حافظ ڈاکٹر محمد مرسی ہیں، جبکہ دوسرے اعظم گڑھ کے ایک گمنام مجاہد آزادی حاجی افضال اللہ قادری کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں ناموروں کا تذکرہ محض جذباتی تعلق کی بنا پر لکھا گیا ہے۔

''حرف واثر'' میں نسبتاً ضلع اعظم گڑھ کے شعر وادب، صحافت اور متعدد گمنام ادبا وشعرا کا ذکر زیادہ آ گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی، مولوی اقبال احمد خاں سہیل، مولوی محبوب الرحمٰن کلیم اور اعظم گڑھ کے دیگر ادبا وشعرا کی متعدد نئی تحریریں اور نئی تخلیقات دستیاب ہوئیں جو اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا تحفظ بہر حال ضروری تھا۔ علاوہ ازیں انور اعظمی، محمد فاروق اعظمی، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر ابرار اعظمی اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی وغیرہ اسی دیار اور اسی خطہ اعظم گڑھ کی خاک سے اٹھ کر سپہر علم وادب پر مہر وماہ بن کر چمکے تھے۔ چنانچہ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شخصیت اور کارناموں کے تمام خال وخط سامنے آ جائیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں بعض ایسی ہستیاں شامل ہیں جن کے ذکر کے لئے دفتر بھی ناکافی ہوتا۔

ہمارے کرم فرما اور نامور ادیب ومحقق پروفیسر حنیف نقوی، ممتاز مورخ پروفیسر احمد سعید، مشہور ادیب اور افسانہ نگار محمد حامد سراج اور پروفیسر آدم شیخ سابق ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کی وفات پر لکھی گئی وفیاتی تحریریں بھی شامل ہیں جو اگر چہ ان سے محبت آمیز اور گہرے مراسم کا پتہ دیتی ہیں، تاہم ان کی گراں قدر علمی وادبی اور تاریخی خدمات کا ایک عمدہ اور صحیح مرقع بھی ان مضامین میں آ گیا ہے۔

ایک مضمون میں اعظم گڑھ کے چند گمنام شعرا کا نو دریافت کلام یکجا کیا گیا ہے، اسی طرح ایک دوسرے مضمون میں اعظم گڑھ میں اردو صحافت اور قدیم مطابع کا پہلی بار ذکر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس میں اہل علم کو تشنگی کا احساس ہو، مگر دراصل یہ مضمون اپنے موضوع پر نقش اول ہے۔ اب اس کو بنیاد بنا کر کوئی اہل قلم اعظم گڑھ میں اردو صحافت کی تاریخ سپرد قلم کر سکتا ہے۔

ایک اور مفصل مقالہ اسلامیات کے چند اہم اردو رسائل وجراید کے اشاریوں کے تعارف پر مشتمل ہے جو پندرہ سال پہلے ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی فرمائش پر مجلّہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ کے خصوصی شمارہ کے لئے لکھا گیا تھا اور جسے اس وقت بے حد سراہا کیا گیا تھا۔ افادیت کے پیش نظر وہ اس مجموعہ کی زینت ہے۔ البتہ اس میں اب بہت کچھ

اضافہ ہو چکا ہے۔ضروری تھا کہ اسے اضافہ کے بعد شامل کیا جاتا مگر عدیم الفرصتی کے سبب کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا جا سکا ہے۔اس کے لئے ناچیز اہل شوق سے معذرت خواہ ہے۔

''حرف واثر'' میں میری کتاب زندگی کا ایک باب ''میری علمی ومطالعاتی زندگی'' بھی شامل ہے۔ یہ ماہنامہ النخیل کراچی کے احوال مطالعہ نمبر کے لئے اس کے مدیر کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ ماہنامہ النخیل میں اشاعت کے بعد احباب کی طرف سے اس کی تکمیل کا تقاضہ بہت بڑھ گیا تھا۔محض ان احباب کی تسکین کے لئے یہ قصہ ناتمام بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ زندگی نے ساتھ دیا تو احباب کی یہ خواہش بھی پایہ تکمیل کو پہنچے گی۔ان شاءاللہ۔

''حرف واثر'' کے سلسلہ میں ناچیز کو کسی قسم کا دعویٰ نہیں۔البتہ یہ یقین ضرور ہے کہ اس کے مطالعہ سے قارئین کے علم اور معلومات میں مفید اضافہ ضرور ہوگا۔اس لئے کہ اس میں متعدد ایسے علمی وتحقیقی مضامین شامل ہیں جو میرے برسوں کے مطالعہ وتحقیق کا حاصل ہیں۔اللہ تعالی کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اس نے ان مضامین کے لکھنے کی سعادت بخشی۔

اس کی اصلاح وتصحیح استاذ گرامی ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی صاحب نے فرمائی ہے۔احباب میں حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی رفیق دارالمصنّفین، ڈاکٹر محمد ارشد خاں، مولوی سلیم جاوید ناظر کتب خانہ دارالمصنّفین اور مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی نے ہر موقع پر حق تعلق نبھایا۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان سب کا ممنون ہوں۔ دعا ہے کہ ان کی محبتوں کا چراغ ہمیشہ روشن رہے اور ان کی سعی و کوشش کو شرف قبولیت نصیب ہو۔

اہلیہ شائستہ فلاحی بندولی اور میرے بچے بالخصوص لخت جگر عثمان وعلی اور حبیبہ الیاس سلمہا نے بڑے ذوق وشوق سے متعدد کاموں میں حصہ لیا اور راحت وآرام پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔اللہ تعالی انہیں دین ودنیا میں سرخ رو کرے۔آمین

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
شہر اعظم گڑھ

۱۶/مارچ ۲۰۲۲ء

سرسید اور اعظم گڑھ

اعظم گڑھ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔احاطہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے جنوب مشرق میں چند قدم کے فاصلے پر یہاں کا قدیم چوک ہے، جہاں انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں ایک مشن اسکول قائم کیا تھا جو ویسلی انٹر کالج کے نام سے معروف ہے اور آج بھی قائم ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ۱۱ر جولائی ۱۸۷۴ء کو یہاں ایک مجلس سجائی گئی تھی، جس میں عمائدین، رؤسا اور باشندگان اعظم گڑھ نے شرکت کی تھی۔آپ کو سن کر حیرت واستعجاب ہوگا کہ یہ مجلس اردو زبان میں ناول نگاری کے بنیاد گذار اور توبۃ النصوح، ابن الوقت اور بنات النعش کے مصنف ڈپٹی نذیر احمد دہلوی [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] نے آراستہ کی تھی۔ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک ضلع اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز رہے۔جس طرح ان کے اعظم گڑھ میں قیام کی بات دلچسپ ہے اسی طرح یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ ان کا مشہور ومقبول ناول ''توبۃ النصوح'' یہیں اعظم گڑھ میں لکھا گیا۔

یہ مجلس ضلع اعظم گڑھ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں اعظم گڑھ اور اس کے مردم خیز قصبات ومواضعات کے سربرآوردہ اشخاص بالخصوص مخلصین سرسید اور ہمدردان تحریک علی گڑھ نے شرکت کی تھی۔ان میں چند کے نام یہ ہیں۔

شیخ محمد سلیم پھریہا، محمد شیر خاں، طالع یار خاں، منشی عبدالرحمٰن خاں، منشی علی حسین خاں، منشی غلام حسین خاں، منشی گوہر علی، مولوی سید محمد، حاجی محمد ہدایت اللہ اور شیخ حبیب اللہ پدر علامہ شبلی نعمانی وغیرہ۔

اس مجلس کے روح رواں ڈپٹی نذیر احمد تھے۔اس اجلاس کی صدارت اعظم گڑھ کے راجہ

سلامت خاں [م:۱۹۱۲ء] نے کی تھی جو اپنے عہد میں وجاہت کا ایک نمونہ اور یہاں کے سرکردہ اشخاص میں سے تھے۔ یہ مجلس دراصل مدرسۃ العلوم، علی گڑھ کی امداد و عانت کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ باشندگان ضلع اعظم گڑھ کے لئے یہ بہت بڑے فخر کی بات ہے کہ اس مجلس میں خود محسن قوم کوکب الہند خان بہادر سرسید احمد خاںؒ [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] نے شرکت کی اور اس موقع پر نہایت عمدہ اور بڑی بصیرت افروز تقریر کی۔ صدر اجلاس راجہ سلامت خاں نے اس تقریر دل پذیر کی داد دی ہے۔ اس طرح ہم فخر یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے جن مقامات کو خود براہ راست تحریک علی گڑھ سے وابستہ کیا اس میں ہمارا ضلع اعظم گڑھ بھی شامل ہے۔ اس تقریب میں ڈپٹی نذیر احمد نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ''مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں اس کوشش میں ہیں کہ ایک مدرسہ قائم کریں خاص مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے، اکثر مسلمان اس مدرسہ کے حالات سن چکے ہیں یا اخباروں میں پڑھ چکے ہیں ان صاحبوں کی خدمت میں کچھ زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جن صاحبوں نے مطلق نہ اخبار میں پڑھا ہے نہ اور کسی طرح سے اس کے حال سے واقف ہوئے ہیں ان کو جاننا ضروری ہے۔
>
> ہماری قوم میں مولوی سید احمد خاں صاحب بڑے لائق شخص ہیں اور اگرچہ ان کی نسبت مسلمانوں کو بہت سے شبہات ہیں مگر تاہم وہ بس غنیمت ہیں ان کے افعال ذاتی اور اقوال گو کسی قسم کے ہوں مگر ان کو مدرسۃ العلوم سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ مدرسۃ العلوم کا طریقۂ تعلیم سید صاحب کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ کل مسلمانوں کے اختیار میں ہے جس طرح وہ مناسب سمجھیں ویسا طریقۂ تعلیم پسند کریں چنانچہ اب سید صاحب اس کی نسبت کچھ ارشاد فرمائیں گے۔ سب صاحبوں سے امید ہے کہ وہ اس کو تامل سے سنیں اور اس پر توجہ فرماویں۔(۱)

سرسید احمد خاں نے اس موقع پر جو خطاب کیا تھا اور صدر جلسہ راجہ سلامت خاں نے جس

کی بڑی ستائش کی تھی وہ خطبہ کہیں دستیاب نہیں تھا۔خطبات وتقاریر سرسید کے مرتبین نے بھی اس سے خدا معلوم کیونکر چشم پوشی کی۔گذشتہ دنوں حسن اتفاق سے سائنٹی فک سوسائٹی میں اس کا سراغ لگا اور وہ نایاب خطبہ ہاتھ آ گیا۔بلاشبہ یہ سرسید کی بڑی اہم تقریر ہے۔اس لئے مکمل تقریر یہاں نقل کی جاتی ہے۔یہ ہمارے لئے خوش قسمتی سے کم نہیں کہ ڈیڑھ صدی بعد یہ خطبہ اہل علم بالخصوص قدر دانان سرسید کی خدمت میں پیش کرنا ہمارا مقدر تھا۔تقریر حسب ذیل ہے:

صدر انجمن ونائب صدر انجمن وتمام رئیسان اعظم گڑھ

اول میں آپ کا شکرادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ مسافر کی درخواست کو قبول فرمایا اور اس وقت اپنے اوقات گراں بہا خارج کر کے یہاں جمع ہوئے لیکن میں اس بات کی تمنا رکھتا ہوں کہ آپ سب صاحب اس بات پر غور کریں کہ میں نے آپ کو یہ تکلیف کیوں دی اور یہاں آپ سب صاحبوں کا جمع ہونا کس غرض سے ہے۔اگر یہہ جمع ہونا اور یہاں تکلیف کرنا اس لئے ہے کہ کچھ اپنی قوم کی بھلائی اور ہمدردی اور خیر خواہی کے واسطے کوشش کریں تو شاید اس تکلیف سے زیادہ کوئی چیز راحت بخش نہ ہوگی نہ صرف ہمارے لئے بلکہ آئندہ نسلوں اور نسلوں کی نسلوں کے واسطے۔

اس ضلع میں اکثر مسلمان رئیس ہیں اور ایک نہایت ہی خوش کرنے والی بات یہ ہے کہ خاص اس ضلع میں اور اس کے قریب گورکھپور و غازی پور جون پور میں اکثر ذی علم اور نامی آدمی ہیں۔ایک زمانہ تھا کہ یہ اضلاع معدن علم فضل تھے۔یہاں کثرت سے ایسے گھرانے تھے جن کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ہر ایک خاندان میں ایک سے ایک اولوالعزم تھا اور ہر ایک کو اپنے علم وفضل کا دعوی ہوتا تھا جو بچے پیدا ہوتے تھے ان کے خوبصورت چہروں سے یہ امید ہوتی تھی کہ یہ اپنے باپوں سے بھی زیادہ نام آور ہونگے لیکن آج وہی ضلع اعظم گڑھ اور وہی ضلع گورکھپور اور غازی پور و جون پور ہے ہر ایک خاندان کا شخص اور ہر ایک متنفس اپنے باپ دادا کی لیاقت اور عزت اور شہرت

کا خیال کرے اور پھر خود اپنی حالت پر غور کرے کہ کیسی جہالت اور تاریکی میں مبتلا ہے لیکن اس قدر خیال کر لینا بس نہیں ہے بلکہ اتنا اور بھی ان کو سوچنا چاہئے کہ اس وقت جو لوگ اچھے خاندانوں کے ہیں اور جن میں اس وقت کچھ علم دکھلائی دیتا ہے ان کو کچھ نہ کچھ ذریعہ اس علم کے حاصل کرنے کا ملا ان کے باپ دادا اور مورث اکثر صاحب علم تھے کچھ ایسے بھی تھے جو گو خود علم نہ رکھتے تھے مگر علم کی قدر کرتے تھے اور اپنی اولاد کو تعلیم دینے کی آرزو رکھتے تھے۔ بڈھے اور قریب المرگ جو اپنی نیکی اور علم سے ممتاز تھے ان کے اخیر وقت کی نصیحتوں اور ترغیبوں کا لوگوں میں کچھ اثر تھا۔ مگر باوجود ان سب ذریعوں کے ان خاندانوں کی تعلیم کا ایسا ابتر حال ہو گیا جیسا آپ دیکھتے ہیں۔ اب غور کرو آئندہ زمانہ کا اور سوچو کہ جو ذریعہ تمہاری تعلیم کا تمہارے مورث چھوڑ مرے تھے وہ تمہاری اولاد کے لئے بھی باقی نہیں ہے جو لوگ اچھے گھرانوں کے ہیں اور کسی قدر مقدور اور دولت بھی رکھتے ہیں وہ مجھ کو بتلائیں کہ کیا طریقہ ہے ان کے ہاتھ میں اپنی اولاد کو نیک اخلاق اور عمدہ تعلیم دینے کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کے پاس اب ایسا ذریعہ نہیں ہے بعض جو فضل الٰہی سے دولتمند ہیں وہ شاید یہ خیال کرتے ہونگے کہ ہم ذی مقدور ہیں کسی ملاں یا مولوی کو نوکر رکھ کر اپنی اولاد کی تعلیم کر لینگے لیکن جس نے اولاد کی تعلیم کو نہیں معاف کیجئے اپنی قوم کی تعلیم کی کچھ بھی قدر جانی ہوگی وہ کبھی اس رائے کو تسلیم نہ کریگا۔ اولاد کی تعلیم و تربیت ہرگز دولت کے زور سے نہیں ہو سکتی۔ ایک بڑے سے بڑے راجہ اور بڑے سے بڑے نواب کو فرض کر لو مگر یہ ہرگز ممکن نہیں۔ نہ وہ اس طرح سے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کر سکے، ہم پوچھتے ہیں کہ اس وقت ایک شخص نہایت ذی علم بھی ہے اور تجربہ بھی اس کا اچھا ہے خیال بھی اس کے اچھے ہیں مثلاً میں اس وقت صاف کہتا ہوں کہ مولوی نذیر احمد صاحب جو تمام علوم سے واقف ہیں اولاد کی تعلیم اور اس کی پرورش کے طریقہ کو بھی خوب جانتے ہیں۔

اولاد کی کی عمدہ تربیت کی قدر بھی ان کو خوب معلوم ہے اور انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں جس کی خدا عمر دراز کرے کافی طرز سے توجہ کی بھی ہے لیکن اولاد کی تعلیم صرف کتابیں پڑھا دینے سے تو نہیں ہوتی اور اب مولوی صاحب ہی مجھ کو بتلا دیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں اور کہاں تک وہ نفروں کی صحبت سے اپنے گھر پر اپنے لڑکے کو بچا سکتے ہیں آخر وہ کہیں باہر کو جاویگا اس وقت ضرور ایک خدمت گار اس کے ساتھ ہوگا مگر کیا وہ ایسا شخص ہوگا جس کے الفاظ اور عادتیں لڑکوں کی طبیعت میں نیک اخلاق پیدا کر سکیں۔ آخر لڑکوں کو تفریح طبع بھی ضروری ہے جس میں پھر ان کو ماماؤں اور سائیسوں اور خدمت گاروں اور ان کے لونڈوں سے کام پڑتا ہوگا۔ بولنا چالنا بات چیت جو کچھ ہے سب انہیں نامہذب نفروں سے ہے لڑکے جب بازاروں میں گذرتے ہیں اور وہاں دیکھتے ہیں کہ کمین قوم کے لڑکوں میں کوئی جھگڑا ہو رہا ہے تو اچھے اچھے خاندانوں کے لڑکے بھی اس کا تماشہ دیکھنے کو ٹھہر جاتے ہیں اور تماشہ کیا ہوتا ہے سوائے گالیوں اور وحشیانہ بد الفاظ کے جس کو لڑکے بڑے شوق سے سنتے ہیں بتلایئے کہ کیا تعبیر ہے ان سب خرابیوں سے اپنے بچوں کے بچانے کی۔ علم نہایت عمدہ چیز ہے اور انسان کے لئے بڑی ترقیوں کا ذریعہ ہے لیکن اس کی خوبی اس وقت ہے جبکہ اس کے ساتھ تربیت بھی عمدہ ہو اگر تربیت نہیں ہے تو علم سے کچھ فائدہ نہیں۔ اگر تربیت ہے اور علم سے نہیں تو بھی آدمی اپنی ترقی نہیں کر سکتا۔ ان دونوں چیزوں کا ایسا ساتھ ہے کہ اگر ایک نہیں تو دوسری بھی نہیں کے برابر ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے جس پر سب اہل ہند نہایت کم غور کرتے ہیں وہ ایک اور چیز ہے اور تعجب نہیں کہ اس کے بیان کرتے وقت مجھ کو دیوانہ بتلاویں اور وہ لڑکوں کی تندرستی اور صحت جسمانی ہے۔ قوا کو طاقت ور ان کے دماغ قوی رکھنا خراب خیالوں کو اس سے نکالنا ان کی طبیعت کو تر و تازہ رکھنا یہی اصل جڑ ہے

جس سے آئندہ عمر میں انسان کا دل ودماغ نہایت قوی رہتا ہے۔اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی اور باریک سے باریک خیال جوانسان پیدا کرتا ہے وہ سب اس ابتدائی احتیاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔اب بتلاؤ کہ کس کے لڑکے اس طریقہ سے پرورش پاتے ہیں ان کو بجز اپنے گھر میں پڑے رہنے کے اور کچھ کام نہیں ہوتا۔ورزش کا عمدہ طریقہ ان کے لئے کوئی نہیں ہے۔تفریح طبع کا کوئی عمدہ موقع ان کو نہیں ملتا جس سے بدن تندرست رہے عقل بڑھے اور بالفرض اگر کسی خاص دولتمند نے اسباب میں کوشش بھی کی کہ وہ اپنے لڑکے کو اپنے گھر پر نہایت احتیاط سے تیار کرے اور اس کی تربیت اور صحت جسمانی کے لئے ہر قسم کا اہتمام کرے۔ اگرچہ یہ بالکل ممکن نہیں ہے لیکن ہمارا پھر یہ سوال ہے کہ کسی خاص شخص کی ایسی کوشش سے ہماری قوم کو کیا فائدہ ملے گا۔ہم نہایت خوش ہوں اگر ہماری کل قوم اسی طرح اپنی اولاد کو تعلیم کر سکے۔لیکن یہ امکان سے باہر ہے ہماری یہ خواہش ہے کہ ہماری قوم کی قوم ذلت سے نکلے اور پھر اپنی پہلی سی ناموری حاصل کرے اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک کل قوم کی عام تعلیم وتربیت درست نہو اور یوں ایک دو شخص فرض کرلو کہ ان کی تعلیم بھی اچھی ہو اور تربیت بھی اچھی ہو مگر ان سے قومی عزت نہیں ہوسکتی بلکہ جب تک عام قوم کی تعلیم وتربیت درست نہوگی ان ایک دو آدمیوں کو بھی نہایت غیرت اور شرم کا مقام ہوگا جب کبھی کوئی ذکر آویگا تو ان کی نسبت بھی یہی کہا جاویگا کہ یہ بھی اسی قوم کے ہیں تو حقیقت میں انہوں نے بھی باوجود اپنی عمدہ تعلیم وتربیت کے کوئی قومی عزت حاصل نہیں کی اور نہ کوئی اس طرح کی عزت حاصل کرسکتا ہے جب تک کہ تمام قوم درجہ بدرجہ ترقی نہ کرے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ ہماری قوم میں اب کوئی ایسا ذریعہ باقی ہے جس سے ہم امید کرسکیں کہ ہماری قوم تعلیم وتربیت میں ترقی کر سکے گی۔جواب یہ ہوگا کہ نہیں تمام ہندوستان میں جس قدر مدارس مسلمانوں کے باقی تھے اور

بعض بزرگوں کے نام سے ان کا کام چلتا تھا جتنی خانقاہیں ان متبرک انسانوں کے نام سے قایم تھیں جن کے نام کا اب تک بھی لوگ ادب کرتے ہیں وہ اب سب برباد ہوگئیں ایک باقی نہیں شاہ عبدالعزیز جو دہلی کے ایک نامی بڑے نامی علماء میں سے تھے ان کے خاندان میں اب تو کوئی بھی باقی نہیں ہے لیکن جب باقی تھے تو ان میں بھی سوائے ایک دو کے اور کوئی پڑھا لکھا نہ تھا میں نے اپنی آنکھ سے ان کے کتب خانہ کو دیکھا ہے جو بالکل مٹی کا ایک ڈھیر تھا۔ میں نے ماماؤں اور چھوکروں کو ان کتابوں کو بیچتے ہوئے دیکھا ہے اور ان کے خاندان میں کوئی اتنا نہوا جو کتابوں کو بھی بچا سکتا یہ تمام ان کی عمدہ کمائی اس طرح پر برباد ہوئی۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ دہلی میں ایک عمدہ اور قابل یادگار خانقاہ تھی وہ تمام ہندوستان کی سجدہ گاہ بلکہ ملائک کی بھی سجدہ گاہ تھی مگر اب دیکھو کہ بالکل بے چراغ ہے تمام خانقاہ میں ایک متنفس بھی پڑھنے یا پڑھانے والا اب نہیں ہے۔غرض تمام ہندوستان میں جو بڑے بڑے ذریعے مسلمانوں کی تعلیم کے خیال کئے جاتے تھے ان کا اب یہ حال ہے۔

اس کے علاوہ بہت بڑا ذریعہ تعلیم کا گورنمنٹ کے کالج ہیں اس میں کچھ شبہ نہیں کہ گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کی تعلیم پر بہت توجہ کی اور حقیقت میں جس قدر ہماری تعلیم پر ہندوستان میں گورنمنٹ نے توجہ کی شاید دنیا میں کوئی ایسی سلطنت نہیں ہے جس نے اپنی رعایا کی تعلیم کا ایسا اہتمام کیا ہو لیکن میرا سوال یہ ہے کہ وہ سلسلہ اور وہ طریقہ تعلیم ہم مسلمانوں کی حالت اور ان کی تمام ضرورتوں کے لئے بھی کافی ہے یا نہیں اگر ہے بھی تو میں پوچھتا ہوں کہ تمام ہندوستان کے کالجوں میں کے مسلمان پڑھتے ہیں اگر ان کالجوں میں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی اغراض کے لئے وہ کالج کافی نہیں ہیں اور میں اس تعداد کے دریافت کرنے کے واسطے شمال ومغربی

اضلاع پر بس نہ کروں گا۔ بمبئی کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے کالجوں میں ۱۸/ طالب علموں میں ایک طالب علم مسلمان ہے اور اسکولوں میں ۳۱/ میں سے ایک ہے۔ اب خیال کیجئے گا کہ یہ ہونا نہونے کے برابر ہے۔ جب سو میں تین مسلمان ہوں اور وہ بھی غالباً کسی رئیس اور نامی خاندان کے نہیں تو نہایت صاف دلیل ہے کہ ہماری تمام اغراض کے لئے گورنمنٹ کے اسکول و کالج کافی نہیں ہیں۔ میرے اس بیان سے یہ منشاء نہیں ہے کہ کوئی الزام گورنمنٹ پر لگایا جاوے۔ گورنمنٹ پر یہ فرض ہے کہ تمام احکام اور تجویزیں جو وہ صادر کرے وہ اصول گورنمنٹ کے منشاء کے مطابق ہوں۔

ہمارے اغراض میں سے ایک مذہبی تعلیم ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی تعلیم میں مذہبی تعلیم شامل نہو تو حقیقت میں وہ تعلیم ایک جسم بے جان کی مانند ہوتی ہے اور شاید گورنمنٹ کے کالجوں سے زیادہ تر مسلمانوں کو فائدہ نہیں ہوتا اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ گورنمنٹ کالجوں میں لڑکوں کو مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی اور مذہبی تعلیم کسی طرح انگریزی کالجوں میں نہیں ہوسکتی بلکہ گورنمنٹ حقیقت میں ایسا کر نہیں سکتی۔ اس کے کالجوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب قسم کے لوگ تعلیم پاتے ہیں اور ان سب کا درجہ مساوی ہے۔ پس گورنمنٹ پر یہ فرض ہے کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے اور وہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ گورنمنٹ مذہبی تعلیم سے دست کش ہو چنانچہ نہایت تعریف اور بے انتہا توصیف کے قابل ہے ہمارے گورنمنٹ کی یہ کارروائی نہ کہ جس طرح اس نے اپنے کالجوں میں اوروں کے مذہبی تعلیم کو داخل نہیں کیا اسی طرح اس نے اپنے مذہب کو بھی علاحدہ رکھا۔

غرض اس میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ گورنمنٹ کا مذہبی تعلیم سے دست کش ہونا بالکل بجا تھا لیکن کلام اس میں ہے کہ آیا گورنمنٹ کے کالج اور اسکول ہمارے اغراض کے لئے بھی کافی ہیں یا نہیں اور جیسا ہمنے اوپر ثابت کیا

ہے ہم کو یقین ہے کہ وہ کافی نہیں ہے اور جب تک کسی کالج میں دنیاوی اور
مذہبی دونوں قسم کی تعلیم نہو اس وقت تک وہ مسلمانوں کے لئے مفید نہیں
ہوسکتا۔ انہیں حالات کے لحاظ سے ہمنے ایک ایسے کالج کی بنیاد ڈالنی چاہی ہے
جس میں مسلمانوں کو علوم دنیاوی کے ساتھ ان کی مذہبی تعلیم بھی دی جاوے اور
ہر قسم کی تعلیم کا مناسب اہتمام کیا جاوے یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان یہہ
چاہے کہ میرا لڑکا مذہبی علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی استعداد حاصل کرے تو اس
کو مدرسہ میں یہ موقع ملے اگر کوئی مسلمان یہہ چاہتا ہے کہ میرے لڑکے کو ایسی
تعلیم دی جاوے جس سے وہ سرکاری نوکری کے قابل ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ
عہدے اس کو مل سکیں یہاں تک کہ سول سروس پاس کرنے کا موقع بھی اس کو
ملے تو یہ سب اغراض اس کالج سے حاصل ہوں۔ اگر کوئی شخص زمینداری کے
کاروبار کے متعلق یا تجارت کے اصول کی تعلیم چاہے تو اس کو بھی موقع ملے۔
حاصل یہ کہ جب تک ہم ایسا ایک کالج نہ بناویں جس سے مسلمانوں کے تمام
اغراض حاصل ہوں تب تک کوئی تدبیر مفید نہ ہوگی۔ ہر شخص کی ایک غرض اور
ایک مدعا ہوتا ہے۔ غرضیں مختلف ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں پس ہم کو ضرور ہے
کہ سب باتوں کا انتظام ایک جگہ کریں۔

اب آپ صاحب ذرا اس بات پر غور کریں کہ یہ ایک ایسا عظیم الشان
کام ہے کہ جب تک تمام قوم مددگار نہ ہو اس وقت تک اس کا سرانجام نہیں ہو
سکتا اگر ایک دو کی بات ہوتو خیر اس کو ایک بھگتیں جب قوم کی بات ہے تو کل
قوم کو مدد کرنا چاہیئے ابھی اعظم گڑھ میں اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ تمام شہر کو کھانا
پکا کر دیوے دیکھیئے کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ حالانکہ تمام شہر والے جب
مصروف ہوتے ہیں تو ہر روز سب کو پکا پکایا کھانا مل جاتا ہے اور کسی کو معلوم بھی
نہیں ہوتا اسی طرح جو کام ایک قومی کام ہے جب تک سب اس میں مدد نہ دیں
گے تب تک اس کا سرانجام نہ ہوگا اور اگر قوم نے مدد نہ کی اور چند آدمیوں کی

کوشش تنہا کارگر نہ ہوئی تو یادرکھو یہ سب ڈوبیں گے اورسب کے واسطے ذلت اورخرابی کے دن آرہے ہیں۔

میری عمر اب آخر ہونے آئی اور اب بہت زیادہ مجھ کو اپنی زندگی کی توقع نہیں ہے اگر چہ اور کسی کو بھی نہیں ہے لیکن میں اپنی عمر کا بہت حصہ ختم کر چکا ہوں۔ ہماری قوم کے معزز آدمی آج کی میری یہ بات یادرکھیں جو میں اس وقت کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری قوم کو اس خراب خستہ حالت سے نکال سکتے ہیں لیکن اگر اس وقت ہماری قوم متوجہ نہوئی تو خوب یادرکھنا چاہئے کہ چندروز بعد سب لوگ چاہیں گے کہ کچھ کریں مگر کچھ کر نہ سکیں گے۔

اگر کوئی نہایت دیندار ہے تو سوچے کہ جس وقت مسلمانوں کی ذلت و نکبت اس درجہ پر پہونچ جاویگی جو اس وقت ایک گھسیارہ اور چمار کی حالت ہے تو کیا عزت ہوگی اسلام کی، اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں ہے جس کو دیکھ کر لوگ اسلام کی خوبی سے واقف ہوں۔ اسلام اس کے پیرؤں کی صورتوں اور ان کے اخلاق اور ان کے مزاجوں اور ان کی حالت سے پہچانا جاتا ہے جس وقت خدانخواستہ یہ نکبت جو مجھ کو دکھلائی دیتی ہے ہماری قوم پر حاوی ہو جاوے تو اس وقت اسلام کے نہایت عمدہ طرفداروں کی کیا حالت ہوگی۔ نہایت افسوس ہے کہ ہم اس آنے والی آفت کے روکنے کے لئے اس وقت کچھ تدبیر نکریں جس کی خرابی بتدریج اب تک ہم دیکھتے آتے ہیں اور جس کی مثال پر آئندہ کی حالت کو نہایت اچھی طرح سے قیاس کر سکتے ہیں۔ کیا افسوس ہے ہم پر کہ آج ہم اپنے گھر میں آرام سے سوویں اور جو آفت ہماری اولاد اور ہماری قوم پر آتی ہوئی دکھلائی دیتی ہیں اس کی کچھ فکر نکریں۔

یہ کام جس کا میں نے ذکر کیا صرف قوم ہی کی مدد پر منحصر ہے اور ایک نہایت عظیم الشان کام ہے۔ ہارون رشید جو ایک بہت بڑا نامور بادشاہ گذرا۔ یا اس نے یہ ارادہ کیا تھا یا مجھ ایک فقیر نے ہی یہ ارادہ کیا ہے۔ اس نے اپنے

بے شمار خزانہ اور روپیہ پر بھروسہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اس نے اس کو خرچ کیا مگر یہ کام پورا نہوا میں ایک مفلس ہوں لیکن اپنی قوم پر بھروسہ کرتا ہوں اور اگر میری قوم میری مدد کرے تو جو کام ہارون رشید نے کیا تھا اس سے سو حصہ زیادہ کر سکتے ہیں اور ہماری اولاد اس کو اس سے بھی زیادہ ترقی دے سکتی ہے۔

میں ابھی گورکھپور سے آتا ہوں۔ وہاں خاص ایک یہ خیال لوگوں کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ اگر علی گڑھ میں کالج قایم ہوا تو اس سے گورکھپور کو کیا فائدہ ہوگا اس لئے انہوں نے خیال کیا تھا کہ اگر گورکھپور میں یہ کالج قائم ہوتو زیادہ مفید ہوگا لیکن انہوں نے مطلق غور نہ کیا ان ضرورتوں پر اور مشکلات پر جو قوم میں علم پھیلانے کے لئے ضروری ہیں۔ نہ اس خرچ کا کچھ خیال کیا جو ایسے کاموں میں ہونا چاہئے کیا اسی طرح اعظم گڑھ علی گڑھ گورکھپور اور اور ضلعوں کے لوگ یہ چاہیں کہ ہر ایک ضلع میں وہ ایسا کالج قائم کریں تو کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

اس ضلع اور اکثر اضلاع میں اس وقت دو قسم کے مدارس موجود ہیں۔ ایک گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا مشنریوں کی طرف سے۔ ہم پوچھتے ہیں آپ لوگ اگر کوشش بھی کریں تو کیا کوئی ایسا اسکول یا کالج اپنے ضلع میں قائم کر سکیں گے جیسا گورنمنٹ اسکول یا جیسا مشنری اسکول۔ کبھی نہیں۔ گورنمنٹ اسکول کا خرچ بارہ سو یا ہزار آٹھ سو روپیہ ماہواری کے قریب ہوتا ہے کیا آپ اس ضلع سے آٹھ سو روپیہ ماہواری کا چندہ کر لیں گے جو برابر وصول بھی ہوتا رہیگا اور کبھی کوئی اس میں عذر نہ کریگا اور تمام عمر آپ کا اسکول اسی چندہ کے روپیہ سے جاری رہ سکے گا۔ کبھی نہیں ممکن نہیں۔ گورنمنٹ پڑھانے کی چیزیں مہیا کرتی ہے جن میں اکثر چیزیں ولایت سے آتی ہیں۔ روز بروز نئی کتابیں چھپ کر مدرسوں میں چلی آتی ہیں کیا اعظم گڑھ میں کوئی ان سب مراتب کو پورا کر لیگا۔

اس وقت فرض کرو کہ آپ ایک اسکول قایم کر بھی لیں لیکن اب بتلائیے کہ اس میں کون سی کتابیں پڑھائی جاوینگی آیا وہی کتابیں جو اگلے زمانہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مذہبی کتابوں میں ہم کو عذر نہیں ہے بے شک وہی پڑھائی جاویں لیکن اور علوم کی نسبت بتلائیے کہ ان میں آیا اسی پرانی منطق و فلسفہ کی تعلیم ہوگی۔ وہ علوم اب کسی کام کے بھی نہیں رہے اور صرف ایک بات کی بات بات رہ گئی ہے۔ جس زمانہ میں وہ علوم بہ کار آمد تھے اس وقت میں تھے مگر اب بتلاؤ کہ ایک مولوی صاحب جو نہایت عمدہ فلسفی اور منطقی بن گئے، ان کو دنیا کا کیا نتیجہ حاصل ہوا، بھلا اگر دنیا کی مفید تعلیم سے بھی مسلمانوں کو غرض نہو نہ سہی حالانکہ یہ غلط ہے مگر خیر یہی بتلاؤ کہ اس مدرسہ سے دینی ترقی کیا ہوگی میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ مدرسہ ایسا ہوگا جس میں بڑے بڑے لائق محدث اور اصولی پیدا ہوسکیں گے۔ کبھی نہیں۔ کیا کوئی ضلع اس لائق ہوسکتا ہے کہ جو اپنے ضلع کے تمام لوگوں کے لئے کافی اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا بندو بست کر سکے۔ کبھی نہیں۔ ضرور ہے کہ اگر ہم آسمان پر چڑھنا چاہیں تو اس کے لئے پہلے سیڑھیاں بناویں۔ یہہ ہم قبول کرتے ہیں کہ ابتدائی مدرسہ ہر ضلع میں ہونا مناسب ہے لیکن ان کی جڑ قائم ہونی چاہئے کبھی کوئی شاخ سرسبز نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کی جڑ مضبوط نہو۔ اول ہم کو ایک بڑا خزانہ میٹھے پانی کا جمع کرنا چاہئے۔ اس میں سے پھر جس قدر نہروں کی ضرورت ہو نکالنی چاہیں لیکن بغیر اس خزانہ کے قائم کئے ایسی نہریں کیونکر نکل سکینگی کیا سوکھے تالاب میں سے تم نہریں نکالوگے۔

چند روز ہوئے کمیٹی نے ایک تجویز مشہور کی جس میں ان تمام علوم و فنون کی تصریح مندرج ہوئی ہے جو ہماری قوم کو پڑھائے جاوینگے اس میں ہر قسم کی تعلیم قرار پائی ہے۔ ایک دنیاوی علوم کی دوسری مذہبی علوم کی۔ دنیاوی علوم میں دو قسم کی تعلیم ہے ایک قسم کی کل تعلیم انگریزی زبان میں ہوگی اور

دوسری قسم میں اردو زبان میں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے بیٹے کو جس شاخ میں داخل کرنا چاہے داخل کرے اور یہہ اندازہ کیا گیا ہے کہ دسویں برس سے اگر تعلیم شروع ہوتو بیسویں برس بالکل فراغت ہو جاویگی۔ اگر کسی کی خواہش سول سروس پاس کرنے کی ہوتو وہ اسی وقت امتحان دے سکے گا۔ پہلا امتحان وہ بیس برس کی عمر میں دے سکے گا اگر اس میں کامیاب نہو تو پھر دوسرا امتحان اکیسویں برس دیگا۔ اگر اس پر بھی کامیاب نہو تو وہ قسمت کی بات ہے اور مجبوری ہے۔ علاوہ اس کے گورنمنٹ نے ایک سرکلر اس حکم سے جاری کیا ہے کہ جو بڑے بڑے معزز خاندان نوکری پیشہ ہیں ان کو چاہئے کہ پچیس برس کی عمر سے پہلے اپنی اولاد کو سرکاری نوکریوں کے سلسلہ میں داخل کر دیں ہم نے جو بیس برس کی عمر کا اندازہ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کا کیا ہے اس کا منشاء یہ بھی ہے کہ اس تعلیم سے فراغت حاصل کر کے تین چار برس تک ان صیغوں اور محکموں کے قوانین اور ضوابط سیکھے جنمیں نوکری تلاش کرنا چاہتا ہے اور اطمینان سے نوکری حاصل کرنے کا بندوبست کرے۔

دوسرا درجہ ایسا مقرر کیا گیا ہے جس سے ہماری عام قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس درجہ میں انگریزی کا لٹریچر جس کو ادب کہتے ہیں اس قدر سکھایا جاویگا جس سے عدالت کی کارروائی حرج نہ ہو، باقی تمام علوم وفنون اردو زبان میں پڑھائے جاوینگے تاکہ ہماری قوم میں سے کوئی شخص ان علوم سے محروم نہ رہے اور اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جب تمام علوم کی کتابیں ہماری زبان میں ہوجاویں تو شاید ہم بڈھوں کو بھی ان سے فائدہ حاصل ہو اور آخر یہ ایک عام ذریعہ قوم میں علوم وفنون پھیلانے کا ہوگا۔

ہمارے ملک کے بعض انگریزی داں صاحبوں نے جو انگریزی کے زیادہ شایق ہیں اردو میں عام علوم وفنون کی تعلیم پر اعتراض کیا ہے لیکن میں ایک قول فیصل کہے دیتا ہوں کہ جب ہم نے یونانی علموں میں ترقی کی تو اس کا

ذریعہ کیا تھا۔ یہی تھا کہ جو زبان ابراہیم کی نسل کی تھی اس میں ہم نے ان علوم کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کے ذریعہ ہماری قوم میں ان علوم وفنون نے یہاں تک ترقی پائی کہ اب تک بھی اس کا اثر بڑی سرگرمی کے ساتھ ہماری قوم میں موجود ہے پس اسی طرح اگر ان علوم وفنون کا جو آج ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہیں اردو زبان میں ترجمہ ہو جو بے شبہ ایک شاخ ہے ہمارے بڑے باپ ابراہیم کی تو پھر وہی نتیجہ حاصل ہوگا۔

اس سے زیادہ میں اپنے قول کی تائید میں ایک صاف مثال بیان کرتا ہوں اس وقت جو انگریزوں کی قوم کو اپنے علم وفضل اور اپنی صناعی اور لیاقت پر بڑا فخر ہے ان سے پوچھو کہ اگر وہ تمام علوم وفنون جن پر آج تم کو فخر ہے اگر انگریزی زبان میں نہ ہوتے تو کیا کبھی اس نتیجہ کے حاصل ہونے کی امید ہوسکتی تھی کبھی نہیں۔

اب چلو فرانس میں جرمن میں اور ان سے پوچھو کہ اگر تمہارے ہی ملک کی زبان میں تمام علوم موجود نہ ہوتے تو کیا تم یہ ترقی کر سکتے تھے جو آج تم کو حاصل ہے۔ جواب ملے گا کہ کبھی نہیں۔ رشیا یعنی روس کی زبان میں علوم و فنون کی ترقی بہت کم ہوئی اس وقت اس زبان میں صرف چودہ سو کتابیں مختلف علوم کی ہیں جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ یورپ میں بہ نسبت اور قوموں کے تمام چیزوں میں اور علم وفضل میں پست ہیں۔ غرض یہ ہے کہ تمام قوموں کے پچھلے حال پر اور موجودہ حالت پر غور کرنے سے بہت بڑا عمدہ نتیجہ نکل آتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم نے غیر علموں کو غیر قوموں کے علموں کو اپنی زبان کے ذریعہ حاصل کیا، اس نے ترقی پائی اور جس قوم نے اس میں جتنی کوتاہی کی اسی قدر اس کی ترقی میں کمی ہوئی۔ خدا کے فضل سے مسلمانوں کے لڑکے نہایت ذہین ہوتے ہیں ان کا دل ان کا دماغ بہت اچھا ہوتا ہے جب ان کو مختلف قسم کے علموں پر آسانی سے دست رس ہوگی تو امید ہے کہ وہ ان

علموں میں اور بہت زیادہ ترقی اور باریکیاں دکھلائیں گے یہی وجہ ہے جو دوسرے درجہ میں ہرایک قسم کے علوم وفنون جدید کا اپنی زبان کے ذریعہ سے پڑھانا تجویز کیا گیا ہے۔

تیسرا درجہ ہے تعلیم مذہبی کا اس میں کوئی چیز کوئی شرط کسی قسم کا انتخاب کتب مذہبی ہرگز کمیٹی خزینۃ البضاعۃ سے متعلق نہیں ہے جیسا لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے اور جولوگ یہہ بیان کرتے پھرتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم کے واسطے کتب مذہبی کا کچھ انتخاب ہوگا کچھ کچھ مطالب کتابوں کے کم کئے جاوینگے کچھ جدید مسائل زیادہ کئے جائیں گے یہ بالکل جھوٹ اور بالکل اتہام ہے اور حقیقت میں ایسے لوگ جو ایسی بے اصل خبریں مشہور کرتے ہیں اپنی قوم کے اپنے مذہب کے دشمن ہیں۔ کمیٹی خزینۃ البضاعۃ میں بجز اس ایک فقرہ کے مذہبی تعلیم کی نسبت کبھی کچھ نہیں کہا گیا نہ اصول وفقہ حدیث تفسیر پڑھائی جاویگی۔سنیوں کو مطابق مذہب اہل سنت و جماعت کے اور شیعوں کو مطابق مذہب شیعہ اثنا عشریہ کے اور اسی واسطے مذہبی تعلیم مدرسۃ العلوم میں سنیوں کے واسطے جدا قرار دی گئی ہے اور شیعوں کے واسطے جدا۔

حال ہی میں گورکھپور میں ایک مباحثہ ہوا۔ جولوگ مدرسۃ العلوم کے مخالف تھے انہوں نے کہا کہ ہاں تم یہہ بات کہتے تو ہو کہ مذہبی تعلیم میں کچھ کمی بیشی نہ ہوگی۔لیکن اگر تم آئندہ اس سے پھر جاؤ تو اس وقت کا کیا علاج ہے۔ ہم نے کہا کہ بابا اگر تم چاہتے ہو تو ہم ایک اقرارنامہ لکھ کر رجسٹری کرادیں اگر اس پر بھی اطمینان نہو تو پینل کوڈ کے بموجب جو سزا اس انحراف کے واسطے ہو سکتی ہو اس کے لئے ہم حاضر ہیں لیکن اس میں ہمارا کچھ اختیار نہیں کہ تمہارے دل کا خطرہ کبھی موقوف ہی نہو۔اس وقت کمیٹی کے چونسٹھ ممبر ہیں۔ یہہ مولوی منشی محمد اکرام صاحب بیٹھے ہیں یہہ بھی ممبر ہیں ان سے پوچھو کہ کیوں صاحب کیا تم بھی ایسے ہی رائے دیدو گے۔منشی محمد خلیل صاحب اور مولوی نذیر احمد

صاحب موجود ہیں جواب کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے ممبر ہونے والے ہیں ان سے پوچھئے کہ اگر میں کافر ہوں تو کیا یہہ میرے کفر کا ساتھ دینگے۔ پھر اور بھی جس قدر ممبر ہیں سب مسلمان ہی ہیں۔ مولوی وحید حسین صاحب مولوی سید فرید الدین احمد صاحب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب مولوی محمد امانت اللہ صاحب جو جناب مولوی محمد فصیح صاحب کے بیٹے ہیں کیا یہہ سب کے سب اور ان کے ساتھ اور تمام مسلمان ممبر ایسے بے ایمان ہو جاوینگے ہاں اگر ان میں سے کوئی بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے تو ہم مجبور ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھ میں خدا ہوتا تو ہم اس کی ضمانت بھی کرا سکتے تھے مگر لاچاری ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ جب بہت پوچھا گیا کہ پھر آخر اس کی کوئی راہ بھی ہے جو آپ کی طمانیت ہو اس وقت انہوں نے یہ فرمایا جو ہمیشہ سے ہم کو مدنظر رہا ہے اور جو ہمیشہ بیان کیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی کوئی کمیٹی علاحدہ ہو اس کے ممبر علیحدہ ہوں اور وہ ایسے لوگ ہوں جن کو مسلمان عموماً نہایت عمدہ و نیک جانتے ہوں۔ ہم نے کہا تو اس کو مہربانی سے لکھ دیجئے انہوں نے نہایت نیکی اور مہربانی اور فیاضی سے یہ مضمون ایک کاغذ پر ہم کو لکھ بھیجا جو ممبر وہاں موجود تھے انہوں نے منظور کیا جو وہاں موجود نہ تھے ان کو میں نے خط لکھے جس قدر جواب میرے پاس آچکے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سب ممبروں نے بھی اس کو دل سے پسند کیا اور یقیناً تمام ممبر کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے بغیر کسی استفتاء کے اس کو منظور کرتے ہیں انہوں نے برابر یہ جواب ہے کہ ہمیشہ سے کمیٹی کا یہی ارادہ تھا اور ہمیشہ اس کا شمار بھی ہوتا رہا ہے کسی شخص کو اس بات کا وہم اور گمان بھی نہیں ہوا کہ مذہبی تعلیم میں کبھی کچھ تبدیلی اور فتور واقع ہوگا۔

شاید ان لوگوں کو میری شامت اعمال کا خیال ہوا۔ میں نہایت گنہگار سہی میرے اعمال میرے افعال سب برے سہی۔ میرے لیئے کفر کے الحاد کے ارتداد کے فتویٰ لکھو اور مشتہر کرو مجھکو کچھ شکایت نہیں لیکن یہہ بتلاؤ کہ

مدرسہ سے اس کو کیا تعلق ہے اس وقت کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کے چونسٹھ ممبر ہیں کیا
میرے پاس کوئی جادو ہے کیا ان کے اوپر میرا کچھ زور ہے کہ جو میں کہوں وہ
بھی کہنے لگیں جو میں کروں وہ بھی کرنے لگیں گے۔ پوچھو منشی محمد اکرام سے کیا
جو میں کہونگا اور جو میں کرونگا وہی یہہ بھی کہنے اور کرنے لگیں گے اور اپنے
مذہب کی کچھ پروانہ کریں گے۔

علاوہ اس کے ایک اور بات بھی غور کرنے کی ہے یعنی اگر میں برا
ہوں تو کیا تم اپنی قوم کو میرے لئے تباہ ہونے دینا پسند کروگے۔ میں نہایت
خوش ہوں کہ میری قوم کا کوئی نیک خواہش کھڑا ہو اور اس سب کام کو انجام
دے۔ میں آج ہی علیٰحدہ ہوتا ہوں۔ مگر میں یہہ نہیں دیکھ سکتا اور اس کو اگوارا
نہیں کرسکتا کہ نہ آپ ہی ایک کام کریں نہ مجھ کو ہی کرنے دیں اور اپنی قوم کو
مرنے دیں اور ڈوبنے دیں لیکن اب نہایت شکر کا مقام ہے کہ جو لوگ پہلے
ایک وقت میں مدرستہ العلوم کے مخالف تھے اب وہ متفق ہیں بلکہ معاون ہیں
اور امید ہے کہ اب کوئی شبہہ لوگوں کو باقی نہیں رہا ہے اور اب انشاءاللہ جلد یہ
سب آپس کا اختلاف دور ہوا جاتا ہے۔

اب مجھے اپنی تقریر کو مختصر کرنا چاہئے اس وقت تک ایک لاکھ ستر ہزار
روپیہ کے قریب مدرستہ العلوم کے واسطے چندہ ہو چکا ہے جس میں سے لاکھ
روپیہ کے قریب وصول بھی ہوگیا ہے باقی بھی بتدریج وصول ہوتا جاتا ہے
جنہوں نے چندہ دیا ہے ان میں سے اکثروں نے اپنے مقدور اور ہمت سے
زیادہ چندہ دیا ہے اور گو میں یہ نہ بھی کہہ سکوں کہ اپنی ہمت سے زیادہ چندہ
دیا لیکن یہہ ممکن نہیں تھا کہ وہ سب کا سب چندہ یکمشت وصول ہوجاتا جو رقم
انہوں نے چندہ میں لکھی ہے وہ بہ اقساط ماہواری یا سہ ماہی وصول ہوتی جاتی
ہے اور ایک سال یا ڈیڑھ سال یا دو سال میں وہ سب قسطیں وصول ہو جاویں
گی، ہماری درخواست مسلمانوں سے یہہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس

قدر اس کی ہمت ہو اس قدر چندہ دے، اگر کوئی ہماری فہرست چندہ کی دیکھے تو نہایت تعجب کریگا کہ ایک صفحہ پر ایک ایک شخص سے چالیس ہزار اور دس ہزار پانچ ہزار ہزار پانچ سو درج ہیں لیکن دوسرے صفحہ پر پیسہ پیسہ اور دو دو پیسے بھی لکھے ہیں۔ کنجڑوں سے جولاہوں سے مانگنے میں ہم کو شرم نہیں آئی ہم نے ایک ایک پیسہ اور ایک ایک پائی تک بھی جو لوگوں نے اپنی مرضی اور دلی مہربانی سے دیا نہایت شکر گذاری اور احسان مندی کے ساتھ لیا۔ نہایت تعریف کے قابل ہے وہ شخص جو یہ سن کر کہ میری قوم ایک کام کے واسطے دس لاکھ روپیہ جمع کرنا چاہتی ہے اپنے ٹوکرہ پر سے اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر ایک پیسہ دیا یقیناً وہ جانتا تھا کہ میرے ایسے ایک پیسہ سے دس لاکھ روپیہ کا جمع ہونا بہت دشوار ہے لیکن اس نے اس بات کا خیال کیا کہ جس کام میں میری قوم کوشش کر رہی ہے میں بھی شامل ہو جاؤں اس نے وہ پیسہ دیکر اپنے دل کو خوش کیا۔ بے شک ہزاروں اور سیکڑوں کی رقمیں جو اکثر چندہ میں وصول ہوتی ہیں اس ایک پیسہ سے بہت بڑی ہیں لیکن میرے نزدیک وہ ایک پیسہ جو سچی ہمدردی کے ساتھ دیا گیا ان ہزاروں اور سیکڑوں کی رقم سے کچھ کم قدر کے قابل نہیں۔

چندہ جو وصول کیا گیا ہے اس میں سے جس چندہ دینے والے نے کوئی قید کوئی شرط نہیں لگائی اس کی بابت کمیٹی کو اختیار ہے چاہے جائداد خرید کرے چاہے پرامیسری نوٹ لیوے اس کے محاصل پر بھی کمیٹی کو اختیار ہے کہ خواہ تعلیم دنیاوی میں لگاوے خواہ تعلیم مذہبی میں لیکن جو لوگ یہہ بات کہہ دیتے ہیں کہ ان کے روپیہ سے پرامیسری نوٹ نہ خرید کئے جاویں ان کا روپیہ ان نوٹوں کی خریداری میں صرف نہیں کیا جاتا وہ روپیہ ویسے ہی امانت رکھا جاتا ہے اور اس سے جائداد ہی خریدی جاویگی۔ اور اس کی آمدنی مدرسے کے کاروبار میں صرف ہوگی۔ علاوہ اس کے چندہ دینے والوں کو یہہ بھی اختیار ہے کہ اپنے چندہ کو کسی کام کے لئے خاص کر دیں مثلاً جو لوگ اس شرط سے چندہ

دیتے ہیں کہ ہمارے روپیہ کی آمدنی خاص دنیاوی علوم کی تعلیم میں صرف کی جاوے وہ اسی غرض کے واسطے صرف ہوگی اور اس کا حساب جداگانہ رہیگا اسی طرح مذہبی تعلیم کی مد جدا ہے جنہوں نے مذہبی تعلیم کے لئے چندہ دیا ہے وہ اسی کام کے واسطے جمع ہوا ہے اور اس کی آمدنی اسی میں صرف ہوگی پھر اس میں بھی دو مدیں ہیں ایک اہل سنت و جماعت کی تعلیم مذہبی کی دوسری مذہب شیعہ اثنا عشریہ کی تعلیم مذہبی کی اور جو روپیہ جس مد کے متعلق آیا ہے وہ اسی میں جمع ہوا ہے۔ اسی طرح اور بھی دو کام ہیں ایک تعمیر مدرسۃ العلوم کی دوسرے دو مسجدوں کی تعمیر ایک سنیوں کے لئے دوسری شیعوں کے لئے۔ بعض نے مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لئے جدا چندہ دیا ہے وہ جدا جمع ہے مسجدوں کی تعمیر کا چندہ جدا جمع ہوگا۔ جناب عالی نواب صاحب بہادر والی رام پور دام اقبالہم نے علاوہ اپنے پانچ ہزار چندہ کے، سابق کے دس ہزار روپیہ مدرسہ کی تعمیر کے واسطے مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ جس دن مدرسہ کی بنیاد رکھنے کا دن ہوگا اس دن بحضور ویسرائے نواب گورنر جنرل بہادر کو بلایا جاویگا۔ ان اخراجات کا تخمینہ پانچ ہزار ہے وہ بھی جناب نواب صاحب ممدوح دام اقبالہم نے علیٰحدہ منظور فرمایا ہے۔

اب میں تمام رئیسوں سے جو اس وقت موجود ہیں یا موجود نہیں ہیں یہ التماس کرتا ہوں کہ اگر یہہ سب باتیں جو میں نے بیان کیں آپ کے نزدیک بھی صحیح ہوں تو آپ سب صاحب بھی خالصۃً للہ اپنی قوم کی بھلائی میں شریک ہوں اور جس کو جو مقدور ہو وہ چندہ دے۔ (۲)

اس اجلاس کے انعقاد سے پہلے سرسید احمد خاں کے روابط باشندگان اعظم گڑھ سے قائم ہو چکے تھے۔ سرسید احمد خاں جس زمانہ میں غازی پور میں مقیم اور سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے لئے کوشاں تھے اس زمانہ میں علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل ان سے ملنے غازی پور جایا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے بھی انہوں نے کئی سفر کئے اور سرسید سے بار ہا ملے۔

اخیر دور کی ایک ملاقات کی روداد خود سرسید احمد خاں کے قلم سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ

''چندروز ہوئے کہ ہمارے مدرستہ العلوم میں جناب شیخ حبیب اللہ مع اپنے فرزندار جمند، ادیب اریب ذوالنجد والفضل جناب مولوی محمد شبلی صاحب کے علی گڑھ میں تشریف لائے اور چند روز مدرستہ العلوم میں مقیم رہے۔ان کے دوسرے فرزند سعید مہدی حسن صاحب مدرستہ العلوم میں پڑھتے ہیں اور بالفعل انٹرنس کلاس میں شامل ہیں۔ہم کو نہایت خوشی ہے کہ دونوں باپ بیٹوں نے مدرستہ العلوم کو اور طریق معاشرت طلبہ کو حد سے زیادہ پسند فرمایا۔''(۳)

اسی سفر میں علامہ شبلی نے سرسید کی شان میں عربی زبان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ وہ قصیدہ بھی سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۵/اکتوبر ۱۸۸۱ء ج ۱۶ نمبر ۸ ص ۱۱۷۵) میں شائع کیا ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے اس قصیدہ کو حیات شبلی میں (ص ۱۷۱-۱۷۲) مع ترجمہ شامل کیا ہے۔

ایک سال بعد فروری ۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوئے اور پھر ۱۶/سال تک وابستہ رہے اور سرسید کی وفات کے بعد مئی ۱۸۹۸ء میں کالج سے علاحدہ ہوئے۔علامہ شبلی کا کالج میں قیام اور سرسید سے وابستگی تحریک علی گڑھ کا روشن ترین باب ہے۔ سرسید اور شبلی کے روابط کے مطالعہ و تجزیہ پر ایک درجن سے زائد تحقیقی مضامین و مقالات اور اس سے زیادہ کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ایک کتاب بھی ''سرسید اور شبلی'' کے نام سے لکھی جا چکی ہے، اس لئے اس کی تفصیل سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی نے ایم اے او کالج علی گڑھ کی علمی و تعلیمی ترقی میں بھرپور حصہ لیا تو ان کے والد شیخ حبیب اللہ [م: ۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء] وکیل اعظم گڑھ نے کالج کی عمارتوں کی تعمیر میں تعاون کیا اور اس زمانہ میں ۱۲۵/روپئے کالج کو پیش کئے۔اسی طرح سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد جب نواب وقار الملک [۱۸۴۱-۱۹۱۷ء] کی زیر قیادت سرسید کے احباب و اعزہ نے سرسید کی یادگار قائم کرنی چاہی تو اس موقع پر بھی شیخ حبیب اللہ نے پچاس روپئے دے کر اس میں حصہ لیا۔

علامہ شبلی سرسید کی قائم کردہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس سے ۲۷ رسال وابستہ رہے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اور بھائی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد بھی کانفرنس کے رکن رہے۔ اور مالی تعاون کرتے رہے۔اسی طرح ایم اے او کالج میں تعلیمی کانگریس کے تعاون کے لئے اعظم گڑھ میں ایک سب کمیٹی منتخب ہوئی اور ان کی فیس رکنیت بھی طے کی گئی تھی، اس کمیٹی کے ارکان میں منشی محمد اکرام، راجہ ریاست حسین، خواجہ مغل، شیخ حبیب اللہ، حکیم حفیظ اللہ، مولوی عبد الحمید (امام حمید الدین فراہی) اور علامہ شبلی کے نام شامل ہیں۔ (۴) یہ بعد کا قصہ ہے۔اس سے پہلے سرسید کے صاحبزادے سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] جب الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو ان کی تقرری پر خوشی کا اظہار کرنے اور انہیں مبارک باد دینے کے لئے ۳۱ رجولائی ۱۸۸۲ کو اعظم گڑھ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اعظم گڑط کے قصبات سرائے میر، محمد آباد اور مبارک پور وغیرہ کے بااثر اور ممتاز اشخاص نے شرکت کی تھی۔اس تقریب میں بھی شیخ حبیب اللہ شریک تھے۔(۵)

یہ ایک بڑی اہم بات ہے کہ علامہ شبلی نعمانی متعدد اشتراک کے باوجود سیاسی معاملات میں سرسید کے حامی نہیں رہے۔خود انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔'' (۶)

مگر ان کے والد شیخ حبیب اللہ سرسید کی یونائیٹیڈ انڈین پیٹریاٹک سوسائٹی کے رکن تھے، جب ۱۸۹۲ء میں پنجاب، بہار اور اودھ وغیرہ میں اپنے کرسپانڈنگ رکن نامزد کئے تو ضلع اعظم گڑھ میں شیخ حبیب اللہ کو کانفرنس کا کرسپانڈنگ رکن نامزد کیا گیا۔(۷)

علامہ شبلی نعمانی سیاسیات میں اپنے عہد کی کانگریس کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے بڑے زبردست داعی تھے۔کانگریس کی حمایت کے معنی دوسرے لفظوں میں مسلم لیگ کی مخالفت تھی۔مسلم لیگ اس دور میں زمینداروں کی تنظیم اور انگریز نواز خیال کی جاتی تھی۔شیخ حبیب اللہ بھی ایک زمیندار تھے اور سرسید کی پیٹریاٹک سوسائیٹی کی رکنیت سے بھی واضح ہے کہ ان کا جھکاؤ

مسلم لیگ کی طرف رہا ہوگا، تاہم دونوں اپنے اپنے موقف پر اخیر تک قائم رہے۔ البتہ سرسید کے دونوں متوالے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ۷؍سال بعد ملک میں جس دوسرے مدرسہ عربیہ کی بنیاد شیخ حبیب اللہ نے اعظم گڑھ میں رکھی تھی اور جس میں مولوی فیض اللہ مئوی [م: ۱۸۹۷ء] اور مولانا فاروق چریاکوٹی [م: ۲۷؍اکتوبر ۱۹۰۹ء] نے درس دیا تھا اور جس سے علامہ شبلی اور ڈاکٹر مختار انصاری [۱۸۸۰-۱۹۳۶ء] کے بھائی حکیم عبدالوہاب نابینا نے فیض پایا تھا، بہت جلد اس کا وجود مٹ گیا، جسے ہم بہت بڑے خسارے سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں، تاہم اس زیاں کے بعد بھی شبلی اور خانوادہ شبلی نے تحریک علی گڑھ سے سرمو انحراف نہیں کیا اور ہمیشہ تعلق قائم رہا۔

اس موقع پر تحریک علی گڑھ کی ایک اور روح پرور مجلس یاد آتی ہے اور وہ ہے مدرسۃ العلوم کے افتتاح کی مجلس، جو اعظم گڑھ کے اجلاس کے ایک سال بعد علی گڑھ میں ۲۴؍مئی ۱۸۷۵ء کو منعقد ہوئی تھی اور جس کی صدارت ضلع اعظم گڑھ کے ایک اور فرزند ارجمند ڈپٹی محمد کریم صاحب [۱۸۳۵-۱۸۹۲ء] نے کی تھی۔ ڈپٹی صاحب محمد آباد کے رہنے والے تھے اور علی گڑھ میں اس دور میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر تعینات تھے۔

سرسید اپنے عہد کے یونان قصبہ چریاکوٹ تو بارہا آئے اور مولوی عنایت رسول [۱۸۲۸-۱۹۰۲ء] سے استفادہ کیا، مگر شہر اعظم گڑھ میں سرسید کے دوبارہ آنے کی اطلاع نہیں ملتی۔ البتہ باشندگان اعظم گڑھ سے سرسید اور علی گڑھ میں جو لازوال رشتہ درد و محبت استوار ہوا وہ نہ صرف حیات سرسید یا حیات شبلی تک بلکہ آج تک قائم ہے۔ اس موقع پر اگر یہ بات کہی جائے کہ علی گڑھ تحریک کے فروغ میں اعظم گڑھ کا بہت بڑا حصہ ہے تو کسی کے لئے انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔

عہد سرسید میں تعلیمی اعتبار سے طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد کالج میں داخل ہوئی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ممتاز عہدوں پر فائز ہوئی۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا نام علامہ شبلی کے منجھلے بھائی محمد مہدی حسن [م: ۱۸۹۷ء] کا ہے جو اعظم گڑھ کے پہلے فرد تھے جنہوں نے علی گڑھ جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی، پھر یورپ جاکر بیرسٹری کی سند لی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ علی گڑھ کالج کی تاریخ میں بھی پہلے ایسے طالب علم تھے جو بیرسٹری کی تعلیم کے لئے یورپ گئے۔ بیرسٹر سید عبدالرؤف جو قصبہ محمد آباد کے رہنے والے تھے، وہ بھی علی گڑھ کالج کے بالکل ابتدائی دور کے طلبہ میں تھے اور

انہوں نے یورپ جا کر تعلیم حاصل کی اور واپس آ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

عہد سرسید میں اعظم گڑھ کے متعدد طلبہ کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے وہاں تعلیم حاصل کی اور پھر ملک میں بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔لیکن ایک طالب علم کا سرسری ہی سہی ذکر ضروری ہے۔ اعظم گڑھ کے ایک طالب علم داخل ہوئے تو سرسید نے پرنسپل کو لکھا کہ ایک طالب علم کو داخلہ کے لئے بھیج رہا ہوں جو عربی و فارسی علوم سے مستثنیٰ ہوگا، کیونکہ ان علوم میں وہ اساتذہ سے کم رتبہ نہیں۔ پرنسپل کی ناگواری کے باوجود اس کا داخلہ ہوا اور پھر اس نے ممتاز درجہ میں امتحانات پاس کئے اور علی گڑھ کا نام روشن کیا۔آپ جانتے ہیں یہ کون شخص تھا۔ یہ ہمارے علامہ حمید الدین فراہی تھے۔ جنہیں دنیا ترجمان القرآن اور صاحب نظام القرآن کے نام سے جانتی ہے۔

یہ عہد سرسید میں باشندگان اعظم گڑھ کی دامے درمے شمولیت کا ایک سرسری منظر نامہ ہے۔اس کی روشنی میں ہم یہ جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے جدید تعلیم کی باد بہاری میں کتنا حصہ لیا اور کتنا اہم کردار ادا کیا۔اور پھر ہم میں وہ کون سی کمی در آئی کہ ہم زمانہ کے مطابق قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکے اور محرومیوں نے گاؤں گاؤں بسیرے ڈال دئے۔

حوالے:

(۱) اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۱/اگست ۱۸۷۴ء ص ۵۳۰

(۲) ایضاً ص ۵۳۰-۵۳۶

(۳) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۱ء (ج ۱۶، نمبر ۸) ص ۱۱۷۵

(۴) مکتوبات شبلی ص ۲۰-۲۱

(۵) ماہنامہ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۱ء

(۶) مکتوبات شبلی ص ۲۷۱

(۷) ماہنامہ تہذیب الاخلاق، مشاہیر علی گڑھ حصہ چہارم ص ۲۷۴۔

○○○

مولانا سید سلیمان ندویؒ

اور جمعیۃ الطلبائے ہند

مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کی شخصیت گوناگوں اوصاف وکمالات کی حامل تھی۔ان کا شمار ہندوستان کی نامور اور ہمہ گیر شخصیات میں ہوتا ہے۔ان کا اگرچہ سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ سیرۃ النبیؐ کی تکمیل و اشاعت ہے، تاہم دوسرے موضوعات پر ان کی تصنیفات وتالیفات اور دیگر تحریریں بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔تقریباً ایک صدی قبل ۱۹۲۳ء میں ان سے جمعیۃ الطلبائے ہند کے سلسلہ میں مولوی سید محمد الیاس رضوی آنریری جنرل سکریٹری جمعیۃ مرکزیہ ہند نے جمعیۃ الطلباء کے طرزِ عمل کے متعلق رہنمائی چاہی تھی۔ چنانچہ اس کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں جو خط لکھا تھا اسے رضوی صاحب نے ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار لاہور میں شائع کرایا ہے۔ یہ خط کیا ہے؟ اس کی حیثیت جمعیۃ الطلباء کے منشور کی ہے اور یہ اب بھی اہم اور قابل عمل ہے۔

مولوی سید محمد الیاس رضوی چارجوی سابق سکریٹری جنرل جمعیۃ الطلبائے ہند سول انجینئرنگ کالج رڑکی کے سند یافتہ انجینئر اور امپیریل ورکس دہلی کے ہیڈ ڈرافٹس مین تھے۔انہوں نے انجینئرنگ سے متعلق چند کتابیں بھی لکھی ہیں۔ان میں ''فن انجینئری'' اور ''تصویر عروس'' [م: ۱۹۲۹ء] کے نام معلوم ہو سکے۔ اول الذکر تعمیرات سے متعلق ہے، جبکہ دوسری کتاب مغربی معاشرت سے متعلق ہے۔ یہ دونوں کتابیں دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ سید محمد الیاس رضوی کے بارہ میں کسی قسم کی معلومات دستیاب نہ ہو سکیں۔حتیٰ کہ وہ کس طلبہ تنظیم کے سکریٹری تھے

اس کی بھی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ البتہ وہ جس طلبہ تنظیم کے جنرل سکریٹری تھے اس کے مقاصد حسب ذیل تھے:

۱۔ مسلم جماعت طلبہ خصوصاً طلبائے عربیہ کی تنظیم

۲۔ جماعت طلبہ کی فلاح و بہبود کی سعی

۳۔ تعلیمی ترقی واصلاح کی کوشش

۴۔ نظام شریعت کی خدمت

۵۔ خلافت وسوراج کی خدمت

۶۔ جمعیت العلماء ہند، مرکزی خلافت کمیٹی، انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ خصوصاً علماء ہند کی امداد (۱)

افادیت کے پیش نظر مولوی سید محمد الیاس رضوی کا استفسار اور مولانا سید سلیمان ندوی کا جواب یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

استفسار

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا یہ گرامی نامہ نیاز مند کے ایک عریضہ کے جواب میں صادر ہوا تھا۔ چونکہ اس کا تعلق جمعیت کے اغراض و مقاصد سے تھا اس لئے مصلحتاً اس کو اب تک شائع نہیں کیا گیا۔ اب چونکہ جمعیت مرکزیہ کا سالانہ اجلاس قریب آرہا ہے اس لئے اس کی اشاعت ضروری سمجھی گئی۔ امید کہ جمعیت کے ارباب حل وعقد اور طلبہ اس پر غور فرمائیں گے اور آئندہ اجلاس میں جمعیت کے طریق عمل کے متعلق ایک صحیح اور مناسب راہ تجویز فرمائیں گے۔

سید محمد الیاس رضوی

آنریری جنرل سکریٹری جمعیۃ مرکزیہ

مولانا سید سلیمان ندوی کا مکتوب گرامی

از دفتر دارالمصنّفین اعظم گڑھ

۸؍جولائی ۱۹۲۳ء

برادرم سلمک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم

جمعیۃ الطلبہ سے مجھے یقیناً دلچسپی اور ہمدردی ہے لیکن میں شروع سے یہ کہہ رہا ہوں کہ جس روش پر یہ چلائی گئی اور جن مقاصد کے ساتھ یہ اٹھی وہ صحیح نہیں۔ طلبا ان افراد کا نام ہے جو ابھی قوم کے رجال نہیں بنے ہیں بلکہ آئندہ بنیں گے اس لئے ان کے لئے وہ محاذ جنگ نہیں جو آزمودہ کار سپاہیوں کا ہے۔ طلبہ ابھی وہ سپاہی ہیں جو فنون جنگ ہنوز سیکھ رہے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ قوم کی کیا ضروریات ہیں؟ مثلاً:

۱۔ ماہر علوم اشخاص کی جماعت

۲۔ کام کرنے والے بااخلاص لوگوں کی جماعت

پس ہمارے حال، مستقبل کو ان دونوں جماعتوں میں داخل ہونے کے لئے تیار ہونا چاہئے تاکہ اس وقت ان دونوں گروہوں میں جو جتھے کام کر رہے ہیں ان کی خالی شدہ جگہوں کو معمور کرنے کے لئے اشخاص تیار رہیں۔ میں نے کان پور کے اجلاس میں اپنے خیالات مفصل پیش کئے تھے۔ ابھی چند ہفتے ہوئے چودھری شریف احمد صاحب سے لکھنؤ میں گھنٹوں اس مسئلہ پر گفتگو رہی۔ سیاسیات ضروری عنصر حیات قومی ہیں مگر تمام تر قومی حیات کی ترکیب کا صرف یہی ایک عنصر نہیں۔ اس باب میں صرف یہ کہنا ہے کہ طلبا صحیح وغلط راستہ میں تمیز کر سکیں اور وقت پر صحیح راستہ پر چلنے کے لئے تیار ہوں اور ان کا دماغ سموم آب وہوا سے محفوظ رہے۔

جمعیۃ کے مقاصد یہ ہونے چاہئیں:-

۱۔ ہندوستان کے تمام طلبہ میں باہم ربط واتحاد قائم کرنا
۲۔طلبہ میں علمی وعملی سرگرمی پیدا کرنا۔
۳۔ ان میں تعلیم کا وہ صحیح اصول رائج کرنا اوران کو بیکارانہ زندگی، تضیع اوقات بیہودہ لہولعب اورغیر مفید عمل ومطالعہ سے محفوظ رکھنا وغیرہ

اس کے لئے ایک سالانہ اجتماع ہوجس میں انہیں مقاصد پر گفتگو ہو۔ ملک کے مسلم علمی یا عملی افراد کامل اس کی صدارت کریں۔ اعلیٰ مضامین پڑھے جائیں۔ طلبہ سال میں ایک دفعہ بیٹھ کر اپنے روبرو مقاصد بالا کے مطابق احتساب کریں۔ مقاصد بالا کو پیش نظر رکھ کر ایک عہد نامہ مرتب کیا جائے جس پر اپنے ممبروں سے عہد واثق لیجئے۔ ان خیالات کی اشاعت کے لئے طلبہ کا ایک رسالہ ہو۔ میں آج کل ممالک اسلامیہ کے مدارس اوران کے مختلف نظام اورنصاب علوم کے لئے ممالک اسلامیہ کے لوگوں سے مکاتبت کر رہا ہوں۔ ٹرکی، مراکش، مصراور ٹیونس میں میں نے اپنے دوستوں کو خط لکھے ہیں۔ جوابات کا انتظار ہے۔ والسلام

سید سلیمان

۸؍جولائی ۱۹۲۳ء(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ خط آثار سلیمانی میں ایک قیمتی اضافہ ہےاوراس لائق ہے کہ طلبہ تنظیمیں اسے پیش نظر رکھ کر اپنا لائحہ عمل طے کریں۔

حوالے :

(۱) روزنامہ زمیندار لاہور۔۱۳؍دسمبر ۱۹۲۳ء

(۲) ایضاً

ooo

علامہ اقبال کا ایک خط

آگرہ سے ماہنامہ شمع پروفیسر محمد حبیب [۱۸۹۵-۱۹۷۱ء] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور حسن عابد جعفری آکسن بیرسٹرایٹ لا کی مشترکہ ادارت میں جنوری ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اور کئی برس تک بڑی شان سے نکلتا رہا۔ اس عہد کے تقریباً تمام بڑے اہل قلم کی تحریریں اس کے صفحات کی زینت بنیں۔ اوراس نے اردو کی بڑی خدمت انجام دی۔ اس کے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک کے شمارے ہماری نظر سے گذرے ہیں۔

شمع دہلی کے برعکس شمع آگرہ ایک علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی اور تحقیقی ماہنامہ رسالہ تھا۔ اس کے دسمبر ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں گذشتہ دوسال میں شائع ہونے والی تحریروں کے اعداد وشمار پیش کئے گئے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

تاریخی مضامین	۲۵
سیاسی مضامین	۶
ادبی مضامین	۸
ڈرامہ اور افسانے	۱۱
مذہبی اور تمدنی مضامین	۵
سائنس، فلسفہ اور تعلیم پر مضامین	۱۱
فارسی	۳
غزلیں	۲۸
نظمیں	۲۰

دسمبر ۱۹۲۵ء یعنی ایک سال پورے ہوتے ہوتے اس رسالہ نے ملک گیر شہرت حاصل

کر لی تھی اور اس وقت کے تمام بڑے نمایاں اہل قلم اور ادبا و شعرا اس میں اپنی تحریریں شائع کرانے لگے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایک سال مکمل ہونے کی خوشی کے موقع پر ماہنامہ شمع کے بارے میں اس کے مدیر نے اہل علم اور ارباب کمال کے خیالات و تاثرات شائع کئے ہیں۔ یہ تاثرات دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں بطور ضمیمہ علاحدہ شائع کئے گئے ہیں۔ ان صفحات کے نمبر شمار بھی فہرست سے علاحدہ ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ ضمیمہ کم نظروں تک پہنچ سکا۔ اس میں جن ارباب کمال کے تاثرات شامل ہیں ان میں شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کا نام بھی شامل ہے۔ ان کا دوسطری خط درج ذیل ہے۔

> ''رسالہ شمع نہایت دلچسپ ہے۔ تاریخی مضامین کی ندرت کے اعتبار سے اس شمع کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ
>
> ''روشن از روئے وی شب وہم امشب است''(۱)

علامہ اقبال کے علاوہ بھی متعدد اہل علم و فضل کے تاثرات شامل اشاعت ہیں۔ ان میں آنریبل سر فضل حسین، شمس العلما امداد امام، نواب سر ذوالفقار علی خاں، میاں محمد شفیع، مہاراجہ سر محمد علی خاں، مشیر حسین قدوائی اور مرزا احسان احمد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

علامہ اقبال کا یہ مختصر خط ان کے کسی مجموعہ ہائے مکاتیب میں شامل نہیں ہے۔ ناچیز نے تلاش و تحقیق میں کوئی فروگذاشت نہیں کی ہے، اس لئے راقم کا یہ خیال ہے کہ علامہ اقبال کی یہ تحریر مکاتیب اقبال پر کام کرنے والوں کی نظر سے نہیں گذری ہے اور یہ خط اب تک غیر مدون اور غیر مرتب ہے۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ اس سے پہلے اس خط کا ذکر کہیں اور ہوا ہے یا نہیں۔

اس خط کی افادیت پر اگرچہ سوال قائم کیا جا سکتا ہے کہ اس دوسطری خط سے کوئی ادبی و تنقیدی نکتہ یا اور کوئی ادبی پہلو سامنے نہیں آتا ہے۔ تاہم اس بات سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حروف علامہ اقبال کے قلم کے موتی ہیں۔ اور ان سے علامہ اقبال کی کم از کم ماہنامہ شمع آگرہ کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہی ہے۔

حوالے

(۱) ماہنامہ شمع آگرہ، دسمبر ۱۹۲۵ء، ضمیمہ ص ۸-۹

مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک نایاب رسالہ

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ

علامہ شبلی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے شاگرد اور مولانا ابوالکلام آزاد[۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے دوست، ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندوی[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] دبستان شبلی کے مایہ ناز عالم و مصنف ادیب وانشا پرداز، اور شاعر ونقاد تھے۔ تصنیف وتالیف کے لئے علامہ شبلی نے ندوہ میں جن طلبہ کی تربیت کی تھی ان میں ایک مولانا عبدالسلام ندوی بھی تھے۔ چنانچہ وہ ایک بڑے مصنف کی حیثیت سے دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے تاریخ پر پہلا مضمون دور طالب علمی میں ماہنامہ الندوہ میں لکھا تھا جو مئی ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے خوش ہو کر علامہ شبلی نے انہیں انعام سے نوازا۔ اور پچاس برس بعد ۱۹۵۶ء میں جب انہوں نے وفات پائی تب بھی قلم ان کے ہاتھ میں تھا۔ گویا ان کی تصنیفی زندگی پچاس برس کے دورانیہ پر محیط ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسے طویل المدت خدمت گذار کم ہی ملیں گے۔ انہوں نے تقریباً دو درجن بلند پایہ علمی ودینی اور ادبی وتنقیدی کتابیں اور سیکڑوں مضامین ومقالات لکھے۔ جن کے ایک سے زاید مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں ادبی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ ''مقالات عبدالسلام'' خاص اہمیت وشہرت رکھتا ہے۔ اسے دارالمصنّفین نے شائع کیا اور وہاں سے ابتک مسلسل شائع ہورہا ہے۔ ان کی تصنیفات وتالیفات اور مضامین و مقالات کی تفصیل کے لئے ناچیز کی کتاب ''یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ہمارے کرم فرما ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری[۱۹۴۲-۲۰۰۶ء] نے ''آثار عبدالسلام'' کے نام سے کتابیات بھی تیار کی ہے جو مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی سے شائع شدہ کتاب ''مقالات سمینار'' میں شامل ہے۔

ادیب شہیر، صاحب شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیفات، تالیفات، تراجم اور ادبی، تنقیدی اور تاریخی مقالات اردو دنیا کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اسوۂ صحابہؓ وصحابیاتؓ، اقبال کامل، امام رازی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، حکمائے اسلام اور شعرالہند وغیرہ ان کی ایسی عظیم الشان تصنیفات ہیں جن کا ذکر احترام سے کیا جاتا ہے اور جو مولانا مرحوم کے نام اور کام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی سیرت و شخصیت اور علمی و ادبی، تنقیدی و تاریخی کارناموں پر کئی اہم کتابیں اور تحقیقی مقالات سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ ان میں پروفیسر کبیر احمد جائسی کا مونوگراف مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر گلشن طارق کی کتاب مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر شباب الدین صاحب سابق صدر شعبہ اردو شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کا مقالہ ''عبدالسلام ندوی حیات وخدمات'' اور ناچیز کی کتاب ''یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی کے سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کے دو مجموعے بھی مولانا مرحوم کی حیات وخدمات پر بے حد اہمیت کے حامل تحقیقی مطالعات پر مبنی ہیں۔ ان کتابوں میں مولانا عبدالسلام ندوی کی مختلف حیثیتوں کا مطالعہ و جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کی کتابوں میں تقریباً تمام کتابوں کا بالتفصیل تعارف وتجزیہ آ گیا ہے، لیکن ان کے ایک رسالہ ''حضرت عبداللہ ابن عمرؓ'' کا جو صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاءالدین گجرات سے شائع ہوا ہے، اس کا ذکر وتعارف مولانا مرحوم پر لکھی جانے والی کسی کتاب میں شامل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کی کتابیات ''آثار عبدالسلام'' میں بھی اس کا اندراج نہیں ہے۔ البتہ اسی عنوان سے دو صفحے کا ایک مضمون ماہنامہ الندوہ لکھنو میں ان کے قلم سے شائع ہوا ہے جسے ہم نودریافت رسالہ ''حضرت عبداللہ ابن عمرؓ'' کا تخم قرار دے سکتے ہیں۔

صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی بہاءالدین گجرات، آزادی سے پہلے علمی و دینی اور ادبی و تاریخی کتابوں کی اشاعت کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس نے اردو کے متعدد نامور اہل قلم اور مصنّفین کی کتابیں شائع کیں۔ ان میں ایک اہم نام مولانا عبدالسلام ندوی کا ہے۔ دارالمصنّفین کے ایک اور نامور مصنف اور شاعر و ادیب مولانا سعید انصاری [۱۸۹۴- ۱۹۶۲ء] صاحب صوفی پرنٹنگ اینڈ

پبلشنگ کمپنی کے رکن تھے۔ان کی بعض کتابیں بھی وہاں سے شائع ہوئی ہیں۔ناچیز نے ان پر ایک مفصل مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو میرے مجموعہ مضامین ''مطالعات ومشاہدات'' میں شامل ہے۔ اس میں ان کتابوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین سے مولانا عبدالسلام ندوی کے اس تذکرہ کے علاوہ چار اور کتابیں فقرائے اسلام،فطرت نسوانی،ابن یمین اور تاریخ الحرمین الشریفین بھی شائع ہوئی ہیں۔ راقم نے ہارون اعظمی مرحوم کی توجہ ان کتابوں کی اشاعت کی طرف بارہا دلائی،مگر خدا جانے وہ کیوں کر ان کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔میرا خیال ہے کہ جس طرح صوفی پرنٹنگ کمپنی ختم ہوگئی اسی طرح اگر یہ کتابیں بھی ضائع ہوگئیں تو پھر ہم تاسف کے سوا کچھ نہ کرسکیں گے۔

نودریافت رسالہ ''حضرت عبداللہ ابن عمرؓ'' بھی مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک اہم یادگار ہے۔آج سے پہلے اس رسالہ کا ذکر ہم نے کہیں نہیں سنا تھا۔نہ ان پر لکھی جانے والی کتابوں میں اور نہ ماہنامہ معارف کے صفحات میں۔ یہ رسالہ ریختہ پر یکا یک نظر آ گیا جو بلاشبہ مولانا عبدالسلام ندوی کے ذخیرہ علم وادب میں ایک بے حد قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس رسالہ میں حضرت فاروق اعظمؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی سوانح عمری قلم بند کی گئی ہے۔ یہ محض ۳۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔اس رسالہ پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ قیاس سے بھی اس کے سنہ اشاعت کی نشاندہی ممکن نہیں ہوئی۔البتہ یہ طے ہے کہ یہ مولانا مرحوم کی زندگی میں شائع ہوا تھا،اس لئے کہ سرورق پر ان کے نام کے ساتھ ''مدظلہ العالی'' لکھا ہوا ہے۔

سرورق پر سوائے سنہ اشاعت کے اور بہت سی تفصیلات درج ہیں۔مثلاً یہ رسالہ زمیندار اسٹیم پریس لاہور میں طبع ہوا۔اور راجہ غلام قادر خاں منیجر و پرنٹر کے اہتمام میں چھپا۔ قیمت ۲ر روپئے ہے،اور اس کی تعداد اشاعت ۲ر ہزار تھی۔

اس میں دیباچہ وفہرست شامل نہیں ہیں۔البتہ ابتدا میں جو تمہیدی عبارت ہے اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ رسالہ دراصل ایک اصلاحی سلسلہ سوانح حیات کے تحت لکھا گیا ہے، جسے

کارپردازان صوفی کمپنی پنڈی بہاءالدین نے شروع کیا تھا۔اور یہ بھی کہ اس کے علاوہ بہت سے علماء وفضلاء اور صوفیائے کرام کے حالات لکھے اور شائع کئے جا چکے ہیں۔اس کے تعارف میں مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ

''علمی حیثیت سے اگر چہ مسلمانوں نے اور علوم وفنون کی طرح فلسفہ اخلاق میں بہت کچھ نکتہ آفرینیاں کیں۔اور اس کے متعلق نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں۔لیکن عملی حیثیت سے اخلاق اور تزکیہ نفس کے بہترین نمونے صرف صحابہ کرام کے زمانہ میں نظر آتے ہیں۔(۱)

مولانا عبدالسلام ندوی نے اس تمہیدی تحریر میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ اب مسلمانوں کو علم سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''مسلمانوں کو آج علم سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔اس بنا پر ہم چاہتے ہیں کہ سلسلہ صحابہؓ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کریں اور اس سلسلہ میں تمام صحابہ کبار کے حالات،ان کے فضائل ومناقب،اخلاق وعادات،غرض ان کی پاک زندگی کے تمام واقعات درج کئے جاویں۔اس سے ایک طرف تو مسلمانوں کو ان پاک مثالوں کی اقتدا کا شوق پیدا ہوگا۔دوسری طرف یہ معلوم ہوگا کہ جناب رسالت پناہ کی مقدس ذات کن عجیب وغریب اور غیر محدود اوصاف کا مجموعہ تھی،جس کے فیض تربیت سے اس قسم کا مقدس گروہ پیدا ہوا۔''(۲)

یہاں یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل مولانا عبدالسلام ندوی تین حصوں میں اسوۂ صحابہ وصحابیات کی تدوین کر چکے تھے اور جس سے اردو میں صحابہ کرامؓ کے مقدس حالات اور کارناموں پر بحث وتحقیق کے اسلوب وانداز کا ایک نیا سلیقہ منظر عام پر آ چکا تھا،جس کی علی العموم پذیرائی ہوئی۔غالباً اسی سلسلہ کی کامیابی سے متاثر ہو کر مولانا مرحوم نے صوفی اینڈ کمپنی کے سلسلہ تذکرہ صحابہ سے دلچسپی لی اور یہ تذکرہ قلم بند کیا۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اسلوب نگارش میں اپنے استاذ علامہ شبلی کے اسلوب کی نقل کرنے کی شعوری کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب رہے۔یہی وجہ ہے کہ اس رسالہ کی

کوئی تحریر یا عبارت گنجلک اور ثقیل نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اسلوب سادہ وسلیس اور رواں دواں ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کی تفہیم میں کہیں دشواری پیش نہیں آتی۔

اسلوب نگارش سے بڑھ کر اس کے مشمولات ہیں، جس میں ان کی پوری زندگی اور تمام خصوصیات سمٹ آئی ہیں۔ اس کے ذیلی عناوین یہ ہیں۔

۱۔اتباع سنت ۲۔مواقع ریا سے اجتناب

۳۔زہد ۴۔استغناوقناعت

۵۔فیاضی اور ایثار نفسی ۶۔تواضع وانکسار

۷۔حق گوئی

ان ذیلی عناوین سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس رسالہ کے لکھنے میں مولانا نے کن امور کو پیش نظر رکھا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ رسالہ واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ اسلام کے چند اہم اور ان بنیادی مسائل ومعاملات کو قلم بند کیا گیا ہے جن سے ایک صالح معاشرہ کی تعمیر ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات کو مصنف نے زیادہ اہمیت دی ہے۔ جن سے مسلمانوں کا معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن جائے ۔ بالفاظ دیگر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی سوانح زندگی کے جن پہلوں سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں انقلاب آسکتا ہے ۔ فاضل مصنف نے ان کی تفصیلات سے زیادہ دلچسپی لی ہے۔ مثلاً ان کی حق گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''حضرت عبداللہ ابن عمرؓ متضاد اخلاق کے جامع تھے۔ ایک طرف تو ان میں یہ تواضع وانکسار تھا کہ حبشی تک کے سلام سے دریغ نہ کرتے تھے، لیکن دوسری طرف یہ حق گوئی تھی کہ حجاج، امیر معاویہ، عبدالملک جیسے بادشاہوں سے بھی نہیں دبتے تھے۔ یاد ہوگا کہ وہ عبدالملک بن مروان کی بیعت پر راضی ہوگئے تھے، کیوں کہ اسلام نے ظالم سے ظالم بادشاہ تک کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ رضامندی اسی حد تک تھی کہ جہاں تک شرعی احکام اجازت دیتے تھے۔ ورنہ امور خلاف شریعت میں وہ ان بادشاہوں کا ذرا بھی خوف نہیں کرتے تھے۔''(۳)

پورا رسالہ اسی انداز تحقیق وتصنیف سے عبارت ہے۔اس کے مطالعہ سے اسلام بالخصوص عہد صحابہؓ کی خصوصیات اور امتیازات کا ایک خوب صورت مرقع سامنے آجاتا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ

''بہرحال حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ذات اسلام کی تمام خوبیوں کا مجموعہ تھی۔جن کے حالات پڑھ کر اسلام کی خوبیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔''(۴)

جن مقاصد کے تحت یہ رسالہ لکھا گیا تھا اور صوفی اینڈ کمپنی نے شائع کیا تھا۔بلا مبالغہ اس رسالہ سے آج بھی وہ کام لیا جا سکتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اس کی افادیت میں اب بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

یہ کتابچہ ''حضرت عبداللہ ابن عمرؓ'' سیرت وسوانح، علم وعمل اور فکر ونظر ہر لحاظ سے ایک عمدہ اور مفید کتابچہ ہے۔اس کے مطالعہ سے جذبہ عمل ابھرتا ہے۔خاص طور پر مولانا مرحوم کے دلکش اور سادہ وشگفتہ اسلوب نگارش نے اس کی افادیت دوچند کر دی ہے۔ضرورت ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اس یادگار تحریر کو دوبارہ اہتمام سے شائع کیا جائے تاکہ ہر خاص وعام کے لئے اس سے استفادہ آسان ہو جائے۔

حوالے

(۱) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، ص ۶

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً ص ۲۳-۲۴

(۴) ایضاً ص ۲۶

◆◆◆

اقبال احمد خاں سہیل کی
دو نادر تحریریں

علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے تلامذہ میں ایک بڑا اہم نام علامہ اقبال احمد خاں سہیل [۱۸۷۴-۱۹۵۵ء] کا ہے۔ تلامذہ شبلی کی ایک بڑی اہم اور قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے استاد پر ایمان کی حد تک یقین رکھتے تھے، جہاں استاد کا نام آیا انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ سوائے بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] کے یہ خوبی علامہ شبلی کے کم و بیش تمام تلامذہ میں پائی جاتی ہے۔ اقبال احمد خاں سہیل میں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی، اس کے بہت سے واقعات ہیں لیکن ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اقبال سہیل ہمارے شعر و ادب کا بڑا قیمتی نگینہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑا تنوع اور طرفگی ہے۔ ایک طرف وہ زبردست عالم دین اور ماہر علوم دینیہ تھے اور ربوٰ کیا ہے جیسی کتاب لکھی تو دوسری طرف شعر و ادب میں یکتائے روزگار تھے۔ ان کی شخصیت کا تیسرا پہلو ان کی قانون دانی تھی۔ وہ ایک بڑے ماہر قانون داں اور کامیاب وکیل تھے۔ اور اسی قانونی داؤ پیچ اور وکالت میں زندگی بسر کی۔ اور چوتھی خوبی ان کا غضب کا حافظہ تھا۔ ان کی قوت حافظہ کی داد بڑے بڑے اہل علم ارباب کمال نے دی ہے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک ذکر کیا ہے کہ ضلع اعظم گڑھ کے مشاہیر علم و ادب میں ان سے بڑا قوی الحافظہ پیدا نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال سہیل صاحب جیسے صاحب کمال مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور بلاشبہ وہ ایسے ہی نادر روزگار شخص تھے، مگر ان کی وکالت نے ان کی تمام صلاحیتوں کو مار ڈالا اور وہ ابھر کر سامنے نہیں آسکیں اور شعر و ادب کے میدان میں وہ جو جلوے دکھا سکتے تھے مستور ہی رہ گئے۔ تاہم انہوں نے نظم و نثر کا جو وقیع

سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ ان کا نام روشن رکھنے کے لئے کافی ہے۔

علامہ اقبال احمد خاں سہیل ۱۸۸۴ء میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بڑہریا میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد بنارس میں ثانوی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کے ہم درسوں میں رشید احمد صدیقی [۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں [۱۸۹۷-۱۹۶۹ء] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ خود علی گڑھ کے نہایت ممتاز طلبہ میں تھے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب مضامین رشید میں ان کی شخصیت پر جو مضمون لکھا ہے اس سے علی گڑھ میں اقبال سہیل کی طالبانہ زندگی اور اس میں جو انفرادیت تھی وہ بہت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اس مضمون میں نہ صرف اپنی، ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ اور اقبال سہیل کی طالب علمانہ زندگی کے واقعات بیان کئے ہیں بلکہ اس دور کے علی گڑھ کی ایک تصویر کھینچ دی ہے۔ انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ ان کی گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا کہ شعر وادب میں مہارت اور نکتہ دانی زندگی کا سب سے بڑا کمال ہے۔ یہ باتیں اگر چہ رشید احمد صدیقی نے اپنے طنزیہ انداز میں قلم بند کی ہیں، مگر یہ سچ ہے کہ اقبال سہیل شعر وادب کو ایسا ہی تصور کرتے تھے۔

علامہ اقبال احمد خاں سہیل نے علی گڑھ کالج سے بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں اور پھر اعظم گڑھ واپس آ کر وکالت شروع کی اور پھر مدۃ العمر یہی شغل رہا، مگر اسی کے ساتھ وہ دادِ سخن بھی دیتے رہے۔ ان کی بدولت اس وقت کا اعظم گڑھ گہوارہ شعر وادب بن گیا تھا۔

وہ بڑے باکمال، فطری اور وہبی شاعر تھے۔ ان کے شاعرانہ کمالات پر متعدد مضامین و مقالات اور کتابیں سپرد قلم کی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر منور انجم (اقبال سہیل حیات اور شاعری) اور بعض دوسرے اہل علم نے تحقیقی مقالات بھی قلم بند کئے ہیں۔ ڈاکٹر شباب الدین صاحب کی سربراہی میں ان پر شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ میں ایک شاندار سمینار کا انعقاد بھی ہو چکا ہے۔ اور اس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ''دانش سہیل'' بھی مئی ۲۰۱۸ء میں طبع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی استاذ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کتاب ''اقبال سہیل کا فن'' بھی ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ اگر چہ مستقل کتاب نہیں لیکن بڑے اہم مضامین و مقالات کا

مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ رسائل وجرائد میں شائع متنوع مضامین و مقالات علاحدہ ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے یہاں جس طرح کا شعری تنوع، طرفگی، گہرائی، بانکپن اور فن کاری کے ساتھ فنی شعور کی کارفرمائی ہے، وہ زندہ رہنے والی شاعری میں پائے جانے والے عناصر ہیں اور بلاشبہ علامہ اقبال سہیل کی شاعری زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ خاص طور پر ان کی نعت گوئی جس کا خوب صورت ترین مظہر ان کی نعت ''موج کوثر'' ہے۔ ہماری ادبی تاریخ بالخصوص نعتیہ شاعری کی تاریخ میں اسے کبھی فراموش نہیں جا سکے گا۔

نظم کے ساتھ اقبال سہیل نثر بھی بہت اچھی لکھتے ہیں۔ سادہ، دلکش اور جاذبیت سے بھرپور نثر لکھنے میں انہیں مہارت حاصل تھی، مگر ان کا قلم بڑا سست رو تھا، یہی وجہ ہے کہ بہت کم ان کے قلم کے لعل و جواہر سامنے آئے۔ تاہم ان کے مضامین اور نقد و اثر کا مجموعہ ''افکار سہیل''، نامکمل ''سیرت شبلی'' اور ''ربویٰ کیا ہے'' ان کی نثر کے انتہائی وقیع نمونے ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی بڑی گہرائی ہے، مگر افسوس کی اب تک اس کا خاطر خواہ تجزیہ پیش نہیں کیا گیا۔ ایک دو مضامین اگر چہ لکھے گئے ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان سے موضوع کا حق ادا نہیں ہوتا۔

علامہ اقبال احمد خاں سہیل کی سیرت و شخصیت کا ایک بڑا اہم پہلو ان کا استغنا و بے نیازی ہے۔ ان کی اسی خوبی نے بدلتی ہوئی قدروں کے دور میں ان کو اور ان کے شعر و ادب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ تاہم ان تمام بے اعتنائیوں اور بے اعتدالیوں کے باوجود انہوں نے اپنے استاذ علامہ شبلی کو جس طرح ٹوٹ کے چاہا اور جس طرح حق شاگردی میں سراپا عجز وانکسار بنے رہے وہ بھی ان کی شخصیت کا نہ صرف قابل ذکر پہلو ہے بلکہ ایک انتہائی نمایاں اور روشن پہلو ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے استاذ علامہ شبلی نعمانی اور ان کی تحریروں سے بلکہ ان کے اداروں شبلی نیشنل کالج اور دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اور ندوہ سے بھی تعلق رکھا۔ شبلی نیشنل کالج اور دارالمصنّفین سے ان کے علمی و تعلیمی اور انتظامی ربط وضبط سے سبھی واقف ہیں اور اہل قلم نے اپنی تحریروں میں ان کا ذکر بھی نسبتاً زیادہ کیا ہے، مگر ندوہ سے ان کے کسی تعلق کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ گذشتہ دنوں راقم کو ان کے وہ تاثرات ہاتھ آئے جو انہوں نے ۱۹۴۹ء میں ندوہ کے سفر میں طلبہ کی تنظیم انجمن الاصلاح کے رجسٹر پر لکھے تھے۔ اس نادر تحریر میں ندوہ کا سفر اور اس کے کتب خانہ کی اہمیت بلکہ اس تحریر کا حرف حرف

ذکر شبلی سے عبارت ہے۔اس کے اور بھی قابل ذکر پہلو ہیں، مثلاً عربی زبان کی عالم گیریت، کتب خانہ ندوہ کے نوادر اور طلبہ کے ذوق وشوق وغیرہ۔مگر ان کی تفصیل سے پہلے اقبال احمد خاں سہیل کی وہ نادر تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

[۱]

معائنہ انجمن الاصلاح

مدتوں کے بعد استاذ مرحوم کی روحانی یادگار یعنی جامعہ ندوۃ العلماء کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔اس موقع پر انجمن الاصلاح ندوہ اور اس کی ادبی اور تاریخی نمائش خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہے۔بہت سے علمی نوادر جن پر دنیا کا کوئی بھی کتب خانہ ناز کر سکتا ہے استاذ الامام رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حیات ہی سے دار العلوم ندوۃ العلماء کی امانت میں ہیں مگر ان کو دلدادگان فن کے لئے آسانی سے قابل بنانا اس دار العلوم کے طلباء کی دقت شناسی کا ثبوت ہے۔چند نقشے جو طلباء کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کے شاہد ہیں اور جن میں چند صفحات کے اندر ہزاروں صفحات کا عطر کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے خصوصیت کے ساتھ قابل داد ہیں۔

عربی رسائل و جرائد جو یہاں طلباء خود اپنی کتابت سے مرتب کرتے ہیں، صحیح ذوق ادب پر دلالت کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تمام عالم اسلام کی مشترکہ زبان اگر ہے اور ہوسکتی ہے تو وہ صرف عربی ہے اور اگر اللہ مسلمانوں کو توفیق دے تو تمام عالم کی مشترکہ زبان ہونے کی بھی صلاحیت یہی زبان رکھتی ہے خصوصیت کے ساتھ اس کا خط تو عالمگیر ہونے کی تمام خصائص رکھتا ہے۔

حاشیہ نشین بساط شبلی
اقبال احمد سہیل عفی عنہ
۱۸/۴/۱۹۴۹ء(۱)

علامہ اقبال احمد خاں سہیل کے مضامین و مقالات، خطوط و خطبات اور تقدیم و تقریظ کو شبلی نیشنل پی. جی کالج کے ایک استاذ مرحوم میجر علی حماد عباسی اور پرنسپل شوکت سلطان صاحب مرحوم نے یکجا کر کے اگست ۱۹۵۷ء میں ''افکار سہیل'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ فاضل مرتبین نے نہایت محنت اور تلاش و تفحص سے اس میں علامہ اقبال احمد خاں سہیل کی نثری تحریریں جمع کی ہیں، لیکن ان کا ایک مضمون رشید احمد صدیقی کے رسالہ سہ ماہی ''سہیل''، علی گڑھ جنوری ۱۹۳۶ء میں ''غزل گوئی پر ایک نظر'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو ''افکار سہیل'' کے مرتبین کی رسائی سے باہر رہا، اور وہ ''اس میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ گذشتہ دنوں ''سہیل'' کی ورق گردانی میں اتفاقیہ وہ مضمون نظر آ گیا۔ جسے ہدیہ قارئین کیا جا تا ہے۔

[۲]

غزل گوئی پر ایک نظر

تنقید نگاری اور وہ بھی اپنے ہمعصروں کے نتائج فکر پر، ممکن ہے کسی کے لیے دلچسپی کا باعث ہو مگر میرے خیال میں تو اس سے زیادہ صبر آزما اور حوصلہ شکن کوئی ادبی مشغلہ نہیں ہے۔ یہی ایک صنف تحریر ہے جس میں حق و باطل برابر درجے کی معاصی ہیں اور یہی ایک دنیا ہے جہاں صدق و کذب یکساں طور پر داخل جرائم ہیں۔ بے غرضانہ ستائش اور بے لوث اعتراف حق، اخلاق انسانی کا ایک شرف ہے، مگر دیار تنقید کی آب و ہوا میں اس کی ماہیت بدل جاتی ہے اور اس کا لقب یا تو قصیدہ خوانی و یا فروتنی، ورنہ کم سے کم غلط بخشی رکھا جا تا ہے۔ خردہ گیری اور ناتواں بینی کہیں اور مذموم ہو تو ہو مگر اس بزم فغاں کے فیض سے یہی عیب دفعتہً ہنر بن جا تا ہے۔ غضب ہے خدا کا مشاعرے میں جہاں ایک نومشق اور برخود غلط متشاعر آپ کے سامنے قوالی یا بزم رقص کی نقالی کرتا ہے اس کی ہر لایعنی ہرزہ سرائی پر جھوٹی واہ واہ کے شور وغل سے ہنگامۂ قیامت برپا کر دینا تو تہذیب سخن فہمی کا ضروری رکن ہے مگر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اور شاعری کے پس پشت اس الہام شعری پر جو شاعر یا راوی کے جنبش چشم و ابرو اور نغمہ سرائی سے بے نیاز ہے، زبانِ قلم سے اضطراراً بھی حرفِ تحسین نکل جانا ایک ایسی معصیت ہے جس کا کوئی کفارہ نہیں ایک طرف تو

ممدوح خود بھی خوش نہیں ہوگا، کیونکہ آپ جو کچھ کہیں گے اس کے توقعات سے فروتر ہوگا۔ دوسری جانب تمام مدعیان شاعری آپ کے نام سے بیزار ہو جائیں گے۔ اسی کو کہتے ہیں: از یں سو راندہ و ازاں سو درماندہ

یہاں تک تو مصائب تنقید نگاری کی قسط اول ہے، آگے چل کر جو مرحلہ پیش آتا ہے وہ اور بھی حوصلہ فرسا ہے۔ اگر ایک بار استحقاقاً آپ سے تنقید نگاری کی غلطی سرزد ہو گئی تو مدۃ العمر کے لیے اخلاقاً اس کا اعادہ آپ پر فرض ہو گیا۔ جماعت انسانی میں اختلاف مذاق فطری ہے اور اس سے بھی زیادہ فطری ہے خود بینی اور خوشامد پسندی۔ فطرت کے ان دو متضاد مقتضیات کا باہمی تصادم تنقید نگار کے لیے عذاب الیم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے ذوق کے مطابق کسی تصنیف یا شعر کے محاسن قلم بند کر دئے تو مصنف اور شاعر کے سوا بقیہ ارباب فن اس کو شاعرانہ مبالغہ سمجھیں گے اور ہر شخص اپنے نتائج فکر کی نسبت اسی مداحی کا متمنی ہوگا۔ یہاں تک کہ تقاضوں سے آپ گھبرا اُٹھیں گے۔ اب اگر موضوع تنقید کو ناقابل اعتنا سمجھ کر یا عدیم الفرصتی کی بنا پر آپ نے خاموشی اختیار کی تو روابط اخلاص کا خون ہوا اور اگر اپنا عزیز وقت ضائع کر کے آپ نے حتی الوسع محتاطانہ انداز میں اپنی سچی رائے کا اظہار کر دیا تو شکریہ کیسا الٹی شکایت مول لی۔

الغرض نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ مخلص محترم حضرت اصغر گونڈوی کے ''نشاط روح'' کے متعلق محض وجدان صحیح سے مجبور ہو کر زبان قلم سے جو حرف حق تراوش کر گیا تھا اس کی تلخی کا شکوہ اب تک فضا میں گونج رہا ہے۔ محبّ مکرم جناب بیخود موہانی نے جس نکتہ سنجی کے ساتھ غالب مرحوم کی مدافعت کی تھی اس کی داد نہ دینا انصاف کی جان پر ستم تھا۔ مگر اس پر بھی چہ میگوئیاں ہوئیں، اس لیے میں نے تو عہد کر لیا تھا کہ آیندہ تنقید نگاری جیسی سعی غیر مشکور سے دامن بچاؤں گا اور اعتراف کمال کے فطری اقتضا کو ضبط تحریر میں لا کر ارباب ادعا کو دعوت مباہلہ نہ دوں گا۔ لیکن مذکورۂ بالا تنقیدی مضامین میں ضمناً بعض فنی مباحث پر جو خفیف اشارات کئے گئے تھے وہ ارباب نظر کے ایک مختصر حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے، اس لیے خیال تھا کہ کسی مناسب موقع پر صنف غزل کی نسبت اپنے خیالات کو مختصراً قلم بند کر دیا جائے۔ مگر مشاغل زندگی نے فرصت نہ دی اور ایک مستقل مقالہ کے لیے جس وسعت مطالعہ اور دقت نظر کی ضرورت ہے وہ یہاں نصیب بھی

نہیں۔البتہ ایک سرسری اور ضمنی نظر کے لیے روشنی اور حرارت کا وہی تھوڑا سا سرمایہ کافی ہوجاتا ہے جو آج سے ۳۰/۳۲ برس پیشتر ایک آفتاب کمال کے فیض آستاں بوسی سے دل و دماغ نے جذب کرلیا تھا۔خوش قسمتی سے اس کا موقع ہاتھ آگیا ہے، یعنی سراپائے اخلاص حضرت ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہاں پوری کا دیوان جو ''نغمۂ دل'' کے نام سے شائع ہوا ہے، زیر نظر اور طالب نظر ہے۔دیوان اچھا خاصا ضخیم ہے اور صاحب دیوان اپنے تخلص کی طرح اردو شاعری کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔دیوان کے ساتھ دو مشاہیر کی تقریظیں بھی شائع ہوئی ہیں، اس لیے اب کسی مزید تفصیلی ریویو کا نہ محل ہے نہ امکان۔البتہ چونکہ حضرت دل کا دیوان تغزل کی تمام اسالیب کا ایک معتدل نمونہ ہے، اس لیے اگر ضمناً اس صنف نظم کی نسبت کچھ اظہار خیال کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا اور اظہار نیاز کے ساتھ ہی خدمت فن کا بھی فرض بقدر استطاعت ادا ہوجائے گا۔ اب اگر تخلص کی تاثیر نے اس پر بھی کسی صاحب کو شکایت کا موقع دیا تو مجبوری ہے۔

معنوی یا لغوی حیثیت سے تو غزل اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں عشق کی داستانِ درد خود عاشق کی زبان سے ادا کی جائے اور عشق بھی وہ جو بہ اصطلاح مولانائے روم فسادخوردن گندم ہے، ''یعنی صنف قوی کا جنسی رابطہ صنف نازک سے'' عرب کا تغزل اور ہندوستان کا گیت اسی حد تک محدود تھا۔البتہ اختلاف آب و ہوا سے اس قدر فرق ضرور ہوا کہ جس ملک میں جو چیز کمیاب تھی وہ اصول اقتصاد کی بنا پر گراں تر اور محبوب و مطلوب قرار پائی اور ملکی آب و ہوا نے جن صنفی جذبات کو زیادہ برانگیختہ کیا یا جس صنف کی اکثریت پیدا کردی وہ صنف عاشق و طالب کی حیثیت میں آگئی۔یہی وجہ ہے کہ عرب میں مرد عاشق اور جنس لطیف معشوق ہے اور ہندوستان میں قضیہ برعکس ہوگیا ہے۔ایران کی سرزمین ہمہ تن حسن و رنگینی ہے اور جغرافیائی حیثیت سے بھی بین العرب والہند ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہاں نہ صرف زبان میں تذکیر و تانیث کا فرق مفقود ہے بلکہ آغاز عہد شباب تک چہرہ کی ساخت میں بھی صنفی لطافت و خشونت میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔لہٰذا اس دنیا میں آکر عشق و محبت نے اور عموم اختیار کرلیا ہے اور زلف گرہ گیر کے ساتھ خط سبز بھی نگاہ محبت کا مرکز بن گیا۔یہ اختلاف آب و ہوا محض عاشق کی صنف تک محدود نہیں ہے بلکہ جذبات عشق کے ظہور کا انداز اور اظہار کا لہجہ فطری طور پر متفاوت ہے۔عربی غزل میں آپ کو مردانہ بلند

آہنگی، خودداری اور استغنا کی شان ملے گی۔ جذبات کے اشتعال میں بجلی کی تڑپ اور پروانے کی بیقراری نظر آئے گی۔ برعکس اس کے ہندی تغزل صنف لطیف کی نزاکت، جذبات عجز و نیاز، صبر و رضا بے کسی و بیچارگی کا آئینہ دار ہے۔ اس لیے اس میں آپ کو شبنم کی اشک فشانی اور شمع کا سوز و گداز ملے گا۔ ایران میں ذرا اعتدال کے ساتھ یہ دونوں انداز پہلو بہ پہلو ملیں گے بلکہ یہاں تو تغزل دو بالکل متضاد حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اگر شاعر کا موضوع سخن اسی عشق کا اظہار ہے جس کو جنونِ شباب کہتے ہیں، تب تو غزل بداخلاقی کی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے اور صنفی امتیاز تک مٹ جاتا ہے۔ اور اگر شاعر بلند نظر اور حسن مجرد کا پرستار ہے تو وہ ایک فطرت پرست فلسفی یا خدا پرست صوفی کی شکل میں نظر آتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ موجودہ فارسی غزل گوئی کی بنیاد ابتداءً تصوف کے مبارک ہاتھوں نے ڈالی۔ ایران میں غزل کو ایک مستقل صنف نظم کی حد تک پہلے پہل جس نے پہنچایا، وہ حکمت ایمانی کی مشہور غزل گوئی کو سوز و گداز، صفائی، برجستگی درد اور تاثیر کی اس حد تک پہنچا دیا، جس پر آج تک بھی کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ سعدی کے رنگ کو امیر خسرو نے وجد و شوق کا اضافہ کر کے اور بھی چمکا دیا۔ یہاں تک کہ خواجہ حافظ شیراز نے سوزش و سرمستی کا چھینٹا دے کر اس شراب کو دو آتشہ کر دیا۔ اس سے آگے ترقی کا امکان نہ تھا اور غزل کی دنیا محدود تھی، اس لیے اب ارباب کمال نے دوسری کروٹ لی اور بابا فغانی اور ان کے متبعین نے پیرایۂ بیان میں ندرت پیدا کر کے ایک طرز نو ایجاد کیا۔ بعد کو حکمت و فلسفہ، پند و موعظۃ، حقائق و اسرار کے نکتے بھی غزل ہی کی زبان میں ادا کئے جانے لگے اور ہندی شاعری کے اتباع میں تمثیلی شاعری بھی شروع ہو گئی اور اس کا نام خیال آفرینی رکھا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسیر و بیدل کے عہد تک غزل محض چیستاں ہو کر رہ گئی۔ غرض کہ اب معنوی حیثیت سے غزل اس صنف کا نام ہے جس میں بلا ترتیب و تخصیص دنیا بھر کے سارے مضامین یہاں تک کہ فسق و فحاشی سے لے کر عالم ملکوت کے اسرار تک ایک ہی نظم کے مختلف اشعار میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اب آئیے حیثیت صوری پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ میرے خیال میں جہاں تک ہیئت ترکیبی کا تعلق ہے تمام اصناف نظم میں غالباً غزل کا موزوں کر لینا سب سے زیادہ آسان ہے۔ صورت ظاہری کے اعتبار سے قطعات و قصائد بھی غزل کے ہم شکل ہیں، مگر اول الذکر اصناف میں خیال کا تسلسل قائم رکھنا پڑتا ہے اور غزل میں اس

سے بھی آزادی ہے۔ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے کے اعتبار سے آپ ایک غزل کے اشعار کو ایک ہی نظم کے اجزائے ترکیبی کہہ لیں، مگر حقیقتاً ایک غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مستقل دنیا ہے اور ماسبق کو مابعد کے ساتھ کسی ربط معنوی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ایسی غیر مربوط گفتگو نثر میں کی جائے تو یقیناً متکلم مجنوں سمجھا جائے گا، لیکن یہی مجذوب کی بڑ تغزل کا معیار ہے۔ دوسری آسانی غزل میں یہ ہوتی ہے کہ شاعر کے ذہن میں پہلے سے کسی خیال کا موجود رہنا ضروری نہیں ہے۔ قافیے کے اعتبار سے وہی خیالات جو کئی ہزار بار ادا کئے جا چکے ہیں تھوڑے سے لفظی ردوبدل کے ساتھ دہرادئے جاتے ہیں۔طرحی مشاعروں کے رواج نے ایجاد زمین کی زحمت بھی رفع کردی۔ ایک مصرع طرح مل گیا، قافیہ اور ردیف متعین ہے۔آٹھ دس قوافی اکٹھا کر لئے اور کسی طرح باندھ دیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے سانچہ پہلے سے موجود ہے، مسالہ بنا بنایا تیار ہے، بس ڈھال دینا شاعر کا کام ہے۔البتہ جتنی مشق بڑھی ہوتی ہے ڈھلائی اتنی ہی صاف ہوگی اور مسالے کے وزن میں مذاق کے مطابق کمی وبیشی ہوجائے گی جو شعرا بازاری بول چال اور روزمرہ پر جان دیتے ہیں وہ چاوڑی اور چاندنی چوک کے محاورے بہ قدر استعداد نظم کردیں گے اور جو ذرا بلند ادبی مذاق رکھتے ہیں وہ فارسی ترکیبوں میں ادائے خیال کریں گے۔اس طرح تھوڑی سی دماغی کاوش کے بعد بہ ادنی فرق مراتب ہر موزوں طبع انسان شاعری کا مدعی بن سکے گا۔اب ہزاروں بلکہ لاکھوں میں کہیں دو چار ایسے ہوں گے جو مخصوص فطری استعداد لے کر آئیں گے اور یا تو غیر معمولی صفائی، برجستگی اور دلوانی کی بنا پر شہرت حاصل کریں گے، جیسے مرزا داغ دہلوی اور ریاض خیرآبادی مرحوم یا ندرت ادا، زور بیان، بلندی خیال اور دقت آفرینی میں امتیاز پیدا کریں گے، جیسے قدما میں غالب ومومن اور دور جدید میں فانی واصغر وغیرہ۔مگر یہ دونوں بزرگ افراط وتفریط سے خالی نہ تھے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول الذکر مذاق کی نقالی نے ابتذال، سوقیت اور فحاشی کی اشاعت کی تو دوسرے رنگ کے اجتماع نے چیستاں گوئی اور الفاظ بے معنی کی طلسم سازی کو رواج دے دیا۔ بہرحال غزل کی بدولت اردو زبان میں ایک ایسا بے معنی دفتر مرتب ہوتا جارہا ہے جو بقول خواجہ شیراز غرق مے ناب ہونے کا مستحق ہے۔

ہمارے لٹریچر میں صنف غزل کی یہ ہردلعزیزی طرحی مشاعروں کی یہ دبائے عام اور غزل

گوشعرا کی یہ غیر معمولی فراوانی اس وجہ سے نہیں ہے کہ غزل بجائے خود ادبی حیثیت سے کوئی زیادہ قابل قدر اور ممتاز صنف نظم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جذبات شباب کا حیوانی پہلو جو غزل کا مایۂ خمیر ہے فطرتِ انسانی کی ایک ضروری اور عالم گیر کمزوری ہے، جس سے کوئی رند و پارسا محفوظ نہیں ہے لہٰذا یہ بھی ایک سبب غزل کی مقبولیت کا ہوسکتا ہے، لیکن انھیں جذبات کا اظہار مثنوی، مسدس اور دوسرے اصناف نظم میں بھی تو ممکن ہے، پھر محض غزل کی یہ کثرت کیوں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہی قسم نظم ہر شخص کے بس کی ہے۔ آج اگر آپ ایک مصرع طرح مشتہر کر دیں تو ایک معمولی قصبے میں بھی اتنے شعرا جمع ہو جائیں گے کہ پورے ۲۴ر گھنٹے بھی غزل خوانوں کے لیے کافی نہ ہوں گے اور ہر مبتدی اپنے ہاتھ میں ایک دفتر لئے اکھاڑے میں کرتب دکھانے کے لیے بیتاب اور مچھروں کی طرح اپنا نغمہ سنانے پر مصر نظر آئے گا، لیکن اگر آپ اس کے بجائے ایک یا چند عنوان نظم کے دے دیں اور مضامین بھی وہی ہوں جو غزل کے موضوع جان ہوتے ہیں تو بھی شاید ایک دو سے زائد شعرا آپ کو کسی بڑے سے بڑے شہر میں نہ ملیں گے اور اگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی جائے کہ مثنوی، مسدس، یا مستزاد کی شکل میں نظم کی ترتیب دینی ہوگی تو ایک دو بھی شاید زحمت نہ فرمائیں۔ یہ خصوصیت کچھ آج ہی نہیں ہے، ہمیشہ سے چلے آتی ہے۔ ایران میں بھی تخمیناً سات سو برس کے اندر صرف چند باکمال شعرا مثنویاں لکھ سکے اور ہندوستان میں تو مثنوی گویوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، لیکن غزل گویوں کی محض فہرست مرتب کی جائے تو بجائے خود ایک بار شتر سے کم نہ ہوگی۔ عرفی جیسے باکمال کے لیے کہا گیا ہے ۔

مثنویش رنگ فصاحت نداشت

کان نمک بود و ملاحت نداشت

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ شیخ ابوالفضل کو عرفی کے بارے میں یہ کہنا پڑا ''غنچۂ استعدادش نہ شگفتہ پژمرد''۔ اس موقع پر کہا جاسکتا ہے کہ سہولت نظم فی نفسہٖ کونسا عیب ہے کہ وجہ شکایت ہو اور نظم کی دشواری کونسا ہنر ہے کہ قابل تعریف ہو۔ اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ غزل گوئی کی اس سہولت اور رواج نے زبان اردو کی ترویج میں جو مدد دی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن شاعری بمعنی قافیہ سنجی کونسا ایسا کمال ہے کہ سرمستان ازل کے سوا ہر کس و ناکس کو اس میکدہ میں بادہ

پیمائی کی دعوت دی جائے اور ایسی ہی سہولت پسندی ہے تو کیوں نہ انگریزی کی طرح نثر مرجز یعنی نظم غیر مقفیٰ کو رواج دیا جائے۔ بہر حال سہولت نظم کو ہنر اس وقت قرار دیا جا سکتا ہے، جبکہ اس سے اور نقصانات نہ پیدا ہوں اور غزل گوئی نے تو اردو ادب کو وہ عظیم الشان نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی صدیوں میں ممکن نہیں۔ ایک طرف تو اس غزل گوئی کی بدولت روز بروز ایک سخیف اور گندے لٹریچر کا انبار لگتا جاتا ہے اور تخریب اخلاق کے لیے جو اور اسباب موجود تھے ان پر ایک مزید محرک کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری جانب قوم کے بہت سے افراد جن کو قدرت نے شاعر پیدا نہیں کیا تھا محض موزوں طبعی کے دھوکے میں اپنے آپ کو فطری شاعر سمجھ کر وقت ایسی قیمتی چیز کو شاعری جیسے بیکار شغل میں ضائع کر رہے ہیں۔ کاش یہی وقت کسی تصنیف تالیف یا دوسرے کار آمد اور مفید شغل میں صرف ہوتا۔

ان نقصانات کے علاوہ جو سب سے بڑا نقصان ہے وہ یہ ہے کہ شعرا اور ادبا کی دماغی صلاحیت اصول فطری کے مخالف چل کر ضائع ہوتی جا رہی ہے اور یہی سلسلہ کچھ دنوں قائم رہا تو بہتر لٹریچر پیدا کرنے کی قابلیت شاید آیندہ نسلوں سے مفقود ہو جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ الفاظ محض ادائے معنی کا ذریعہ ہیں نہ کہ تخلیق معانی کا سبب۔ اس لیے بلحاظ ترتیب عمل انسانی دماغ میں پہلے خیال آنا چاہیے، پھر اس کے لیے موزوں عبارت اور موثر پیرایۂ بیان تلاش کرنا چاہئے جس طرح ایک مصور پہلے اپنے دماغ میں تصویر کے تمام خال وخط کو متعین کر لینے کے بعد تصویر بناتا ہے اور مناسب رنگ بھرتا ہے یا ایک افسانہ نگار قصہ کے تمام پلاٹ اور تفصیلات کو ذہن کے سامنے رکھ کر افسانہ کو مرتب کرتا ہے، اسی طرح شاعر کا فرض ہونا چاہیے کہ پہلے ایک خیال کو مع اس کی ضروری تفصیلات اور اجزائے ترکیبی کے اپنے ذہن میں متعین کر لے اور پھر اس خیال کی مناسبت سے وزن، بحر اور صنف نظم کا انتخاب کرے۔ مثنوی اور مسدس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہاں یہ طریق عمل ناگزیر ہے، لیکن غزل میں الٹی گنگا بہائی جاتی ہے، یعنی قافیہ پہلے دماغ میں آتا ہے، پھر اس قافیہ کا چراغ ہاتھ میں لے کر اندھیرے میں مضمون ٹٹولا جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے ہاتھ لگ گیا تو اکثر شعرا پہلے مصرع ثانی مرتب کرتے ہیں، اس کے بعد اس مصرع ثانی سے عقد نکاح کے لیے موزوں جوڑا مصرع اول کا تلاش کرتے ہیں جو کبھی نصیب ہو جاتا ہے اور

کبھی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں غزل گوئی کی وہ دنیا ہے جہاں لفظ اپنے لیے معانی کی تلاش کرتا ہے۔ یہ طریقہ خلاف فطرت ہونے کے علاوہ اتنا مصنوعی ہے کہ ہر کس و نا کس تھوڑی سی محنت کے بعد شاعر ہو جاتا ہے۔ اب حقیقی شعرا اپنا امتیاز قائم کرنے کے لیے ایک قافیہ لے کر پہروں کیا، ہفتوں تلاش معانی میں سرگرم رہتے ہیں۔ اور عامۃ الورود خیالات کو مسترد کرتے جاتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی جدید مضمون ہاتھ آ گیا تو فہوالمراد اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو انھیں فرسودہ خیالات کو دلکش ترکیبوں یا جدید اسالیب بیان کے ذریعہ سے جدت کا رنگ دیتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ خیال کافی وسیع ہے اور بحر چھوٹی جس میں پوری بات سا نہیں سکتی تو اب دریا کو کوزہ میں سمونے کی کوشش کی جاتی ہے جو کبھی اشارات وغیرہ کے ذریعہ سے کسی حد تک کامیاب ہوتی ہے اور کبھی ''معنی الشعر فی بطن الشاعر '' کا مصداق بن جاتی ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں ہے کہ جس طرح معمولی غزلیں کہہ لینا آسان ترین کام ہے، اسی طرح عام سطح سے بالاتر اور ممتاز غزل گوئی حد درجہ مشکل ہے جو ۹۹ فی صدی مدعیان شاعری کے امکان میں نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں صرف معدودے چند اس کڑی کمان کو زِہ کر سکے ہیں، مگر ان حضرات نے اظہار کمال کے اس طریقہ سے جتنا فائدہ لٹریچر کو پہنچایا ہے، اس سے زیادہ اپنے دماغ پر ظلم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چنے کی دال پر سورۂ اخلاص معہ بسم اللہ و نام کاتب لکھنے کی سعی لا حاصل ہے۔ اچھے اچھے خوشنویسوں کی بھی صلاحیت کتابت جاتی رہتی ہے اور تیلی کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں عمر گزار دینے سے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں۔ اس طرح بہت سے بہترین دل و دماغ ضائع ہو گئے اور ضائع ہوتے جا رہے ہیں، مگر اس مدت العمر کی جگر کاوی اور ضیاع وقت کے بعد جو سرمایہ ہاتھ آتا ہے وہ صفر کے برابر۔ آپ غالب سے لے کر موجودہ عصر کے کسی بہتر سے بہتر غزل گو شاعر کا مجموعۂ کلام اٹھا لیں اور خیالات کے اعتبار سے اشعار کی فہرست مرتب کریں اور جن خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ان کو یکجا کر دیں تو غالباً عنوانوں کی تعداد کہیں بھی پچاس تک نہ پہنچے گی۔ اب سخن فہم طبقے کو لیجئے تو وہ بھی اس طرز شاعری کے اثر بد سے محفوظ نہیں ہیں جس طرح تیز مرچوں کا عادی سادہ اور لطیف غذائیں پسند نہیں کرتا اور افیونی کو چسکی لئے بغیر چین نہیں پڑتا، اسی طرح ہمارے سخن فہم حضرات جو بیدل و غالب کے دلدادہ ہیں، ان کو سادہ اور لطیف نظموں میں مزا

نہیں آتا اور غزل جیسی ادنیٰ ترین صنف نظم کو کمال شاعری کا معیار قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک تو جو کچھ ذکر کیا گیا وہ خواص سے متعلق تھا، عام شعرا و سامعین کا تو ذکر ہی کیا۔ وہاں تو محض قافیہ پیمائی کا نام شاعری ہے۔ مشاعروں میں داد بھی اسی طرح کی دی جاتی ہے۔ سبحان اللہ گریبان آپ ہی کا حصہ ہے۔ بسمل کا قافیہ تو آپ نے اپنا کرلیا، واہ کیا ردیف کھپائی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب سے کچھ پیشتر تو سب سے بڑا کمال یہی تھا کہ مشکل طرحوں میں غزلیں کہی جائیں۔ اسی بدمذاقی کا نتیجہ تھا کہ باغ قافیہ کے ساتھ (سے دور اور شکستہ پر) کا دم چھلا طور ردیف لگا کر غزل کہی گئی، یا شراب میں سانپ، جوڑا سانپ کا، قفس کی تیلیاں، جنگل دوش پر، زحل کی مکھی، تصویر پشت آئینہ وغیرہ وغیرہ مہملات سے دواوین پر کئے گئے۔

اس تمہید کا یہ مدعا نہیں ہے کہ میرے نزدیک غزل یک لخت قابل ترک چیز ہے۔ مقصود صرف اس قدر ہے کہ طرحی مشاعروں کو قطعاً بند کردینا چاہیے اور غزلیں اگر کہی جائیں تو اس طرح کی یا تو کوئی مکمل خیال پیش نظر رکھ کر ایک مسلسل غزل کہی جائے تاکہ تصویر کے تمام ضروری پہلو سامنے آجائیں، یا منفرد، حکیمانہ خیالات کو لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ مختصر غزلوں میں یکجا کردیا جائے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نہ ہو کہ فلسفہ، سائنس، یا تصوف کی مصطلحات و مبادی کو بجنسہٖ نظم کردیا جائے بلکہ اسرار و حقائق، فلسفہ و سیاست کو گل و بلبل کی داستان اور حسن و عشق کا افسانہ بنا کر پیش کیا جائے اور اگر کوئی خاص پہلوئے بلاغت پیش نظر نہیں ہے یا محض مخصوص سخن فہموں سے خطاب مقصود نہیں ہے تو حتی الوسع پیرایۂ بیان سہل اور سادہ اور عبارت لطیف و شیریں رکھنی چاہئے اور ان سب کے باوجود محض غزل پر سرمایۂ شاعری کو محدود کرنا نہ چاہئے بلکہ اور اصناف کے رواج پر صرف توجہ لازمی ہے۔ خیر یہ تو آیندہ کے لیے محض ایک تمنا ہے جس کا وجود میں آنا کسی ایک فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے، نہ اصول نفسیات کے مطابق فوری اصلاح ممکن ہے۔

البتہ موجودہ زمانہ میں تدریجی طور پر غزل کی جو اصلاح ہو رہی ہے بہت کچھ قابل قدر ہے اور اس میں سب سے زیادہ حصہ حکیم مومن خاں مرحوم کے سلسلے یعنی اصغر علی خاں نسیم دہلوی اور ان کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی اور پھر ان کے مشہور تلامذہ حسرت وفانی واصغر کا ہے۔ یہ حضرات کچھ تو استاد کی صحت مذاق اور زیادہ تر اپنی فطری استعداد کی بدولت عام بدمذاقی سے علیحدہ رہ سکے،

پھر بھی حسرت کے ابتدائی کلام میں معاملہ بندی اور فانی کے زمانہ قیام لکھنو میں میت و جنازہ کی کثرت خواہ وہ کسی حد تک لطیف کیوں نہ ہو غلط ماحول کے نتائج اور قابل حذف عناصر ہیں۔ بہر حال فانی و اصغر تو پھر بھی تغزل کے مہر و ماہ ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں موجد طرز کہے جا سکتے ہیں، مگر ان کے علاوہ بھی اچھی خاصی تعداد ان غزل گو شعرا کی ہے جنھوں نے قدامت پر جدت کا رنگ چڑھا کر اور عام شاہراہ سے الگ ہو کر اچھا خاصا نمونہ غزل گوئی کا پیش کیا ہے، مثلاً جگر مراد آبادی، بیخود موہانی، مرزا جعفر علی خاں اثر جوش ملیح آبادی، مرزا یاس عظیم آبادی، عیاں میرٹھی اور یادش بخیر حضرت دل شاہجہانپوری۔

ضمیر حسن صاحب دل شاہجہاں پوری اپنے تخلص کی طرح اردو شاعری کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ موصوف کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہیں، پھر بھی ''آنکھیں دکھانے والے'' سے وہ ''الگ باندھ کر'' رکھا ہوا مال دکھانے کی تمنا نہیں کرتے۔ آپ کا پورا دیوان اس طرح کی عریانی مذاق سے مبرا ہے۔ کہیں کہیں قدیم رنگ کی جھلک ضرور ہے، مگر الشاذ کالمعدوم اور جتنی بھی ہے وہ ابتذال سے خالی اور رکاکت سے پاک۔

حضرت دل کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال مذاق ہے۔ صفائی سلاست اور برجستگی کے ساتھ کہیں کہیں لطیف فارسی ترکیبیں بھی آتی ہیں۔ صحت زبان کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ خیالات نہ تو عامیانہ ہیں نہ اس قدر دقیق و عمیق کہ پتہ نہ چل سکے۔ بلندی ہے، مگر اسی حد تک کہ ہر شخص دیکھ سکے۔ اتنا اونچا اڑنا پسند نہیں کرتے کہ دوسروں کو دوربیں لگانی پڑے۔ حسن و عشق کی داستان میں کہیں کہیں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے اور شاذ و نادر فلسفہ و حکمت کے اشارات بھی ملتے ہیں۔ سوز و گداز، سوزش و سرمستی سبھی کچھ ہے، مگر اتنی ہی جیسی دال میں نمک۔ دیوان سے کچھ اشعار سرسری انتخاب کے بعد پیش کئے جاتے ہیں۔

کسی کی رہ گذر میں جان دینے کا یہ حاصل ہے — کہ ہر عشرت کدہ میں ہو رہا ہے آج غم میرا
نارسائی کا سبب کیا ہے یہی جوش طلب — بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا
قفس میں بھول گیا ہم کو لطف آزادی — خیال تک نہیں آتا اب آشیانے کا
مل گئی راحت ہمیشہ کے لیے نیند آ گئی — چارہ گر رخصت ہوئے بیمار اچھا ہو گیا

خوشا قسمت کہ رخصت ہوگئی جانِ حزیں پہلے
کوئی کہتا خدا حافظ تو اک محشر بپا ہوتا

یہ جزو بھی ہو شامل حالاتِ مصیبت
ان سے نہ سنا جائے گا افسانہ کسی کا

کہتے ہیں لوگ حضرت دل بھی ضمیر کو
یہ دوسرا ہے نام اسی بیقرار کا

گو کوچۂ بتاں میں صدمے اٹھائے پیہم
لیکن مری زباں پر قسمت ہی کا گلا تھا

چند آبلہ پا وحشی کہتے ہوئے گزرے ہیں
کانٹا کوئی صحرا کا بیکار نہیں ہوتا

ہاتھ رکھ کر وہ دل پہ کہتے ہیں
اب نہ کہنا کہ بیقرار کیا

کیا سنائیں سر گزشت زندگی پر الم
آشیاں اب تو قفس ہے اس سے پہلے دام تھا

میکش تو ہیں اندیشۂ امروز سے غافل
واعظ کی ہے فرد اے قیامت پہ نظر آج

بہارِ گل ہے کتنی فرحت انگیز
جھکی پڑتی ہیں شاخیں آشیاں پر

اُف رے جنوں کا جوش کہ تلوؤں کے آبلے
دیوانہ وار ٹوٹ پڑے نوک خار پر

کیا ہے اس اقرار کا مطلب دل حسرت نصیب
مسکرا کر وہ یہ کہتے ہیں ضرور آئیں گے ہم

مجھے در پر جو دیکھا بول اٹھے اے دل وہ درباں سے
یہ کیا کہتے ہیں کیا مطلب ہے کیوں بیکار بیٹھے ہیں

تجھ پہ او وعدہ فراموش مری جان نثار
ہاں پھر اک بار یہ کہہ دے مجھے اب یاد نہیں

دفعتہً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد
ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

اب یہ صورت ہے دل زار کے بہلانے کی
ذکر ناکامی ارباب وفا کرتے ہیں

وہ اک پیام اجل تھا مریض غم کے لیے
کسی کا آہ یہ کہنا خدا کو یاد کرو

ہے جنوں میں بھی لطافت کا خیال
خاک صحرا آج چھانی جائے گی

سچ ہے میری بات کا کیا اعتبار
سچ کہوں گا جھوٹ مانی جائے گی

دل کی امید بر نہیں آتی
ہم کو آتی نظر نہیں آتی

عالم خواب میں بھی وہ صورت
نظر آتی نظر نہیں آتی

تھی اجل کی امید حضرت دل
وہ بھی آتی نظر نہیں آتی

حیرت میں ہوں کشاکش امید وبیم سے
طاقت سکوت کی ہے نہ جحت سوال کی

حرم بھی اہل طلب کا ہے اک مقام تلاش
ادھر بھی ہم نکل آئے ہیں جستجو کرتے

اک بے خبرہوش کا عالم ہی جدا ہے نالے ہیں نہ آہیں نہ اثر ہے نہ دعا ہے
ہم نہیں ہجر کی شب بھی تنہا درداٹھتا ہے غش آ جاتا ہے
آج تک وہ نظر نہیں آئے دوستی اُن سے غائبانہ ہے
محفل تری اے ساقی میخواروں کی جنت ہے رنگینیٔ ساغر سے، رعنائی مینا سے (۲)

یہ دونوں نادر تحریریں علامہ اقبال سہیل کے نثری مجموعہ ''افکار سہیل'' میں قیمتی اضافہ ہیں۔ امید ہے کہ ''افکار سہیل'' کی اشاعت ثانی میں اس طرح کی نو دریافت قیمتی تحریروں کا اضافہ ضرور کیا جائے گا۔ ان دونوں تحریروں سے نہ صرف ان کے سوانح بالخصوص غزل سے متعلق ان کے افکار ونظریات کی تعیین میں مدد ملے گی۔ اور جس طرح رشید احمد صدیقی صنف غزل کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے، ممکن ہے اقبال سہیل کے نظریہ میں بھی انفرادیت کا پہلو نکل آئے۔ اب یہ کام ہمارے دائرہ تحقیق سے نکل کر نقادوں کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے۔

حوالے:

(۱) الاصلاح، ندوہ لکھنو
(۲) سہیل علی گڑھ، مدیر رشید احمد صدیقی، جنوری ۱۹۳۶ء

ooo

محبوب الرحمٰن کلیمؔ
اوران کی دونو دریافت غزلیں

مولوی محبوب الرحمٰن کلیم جیراج پوری[۱۸۶۴-۱۹۲۵ء]اعظم گڑھ کے آسمان علم وادب کا ایک روشن ستارہ تھے۔علامہ اقبال احمد خاں سہیلؔ [۱۸۸۶-۱۹۵۵ء] مرزا احسان احمد [۱۸۹۶-۱۹۷۲ء] امجد علی غزنوی، امین اللہ امین اعظمی[۱۹۰۲-۱۹۶۶ء] اور بعض دوسرے ادباوشعرائے اعظم گڑھ کی طرح ان کی بھی علمی،ادبی اور شعری صلاحیتیں وکالت میں برباد ہوئیں اوران کی ذات سے علم وادب کو جوفیض پہنچ سکتا تھااس سے وہ محروم رہا۔تاہم اس غیر علمی مشغلہ کے باوجود انہوں نے علم وادب کی جو خدمات انجام دیں وہ قابل رشک بھی ہیں اورلائق ذکر بھی۔البتہ اس کے ذکر سے بھی ہمارے ادبی وتاریخی صفحات خالی ہیں۔

مولوی محبوب الرحمٰن کلیم ضلع اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز گاؤں جیراج پور کے ایک روشن خیال شخص شیخ محمد کامل کے صاحبزادے تھے۔شیخ محمد کامل تعلیم یافتہ تھے۔برسوں اعظم گڑھ کے مشہوراٹھوریہ خاندان کے مشیر رہے۔اپنی روشن خیالی کے سبب انہوں نے محبوب الرحمٰن کلیم کوجدید تعلیم دلائی اوروہ جیراجپور کے پہلے جدید تعلیم یافتہ شخص تھے۔

محبوب الرحمٰن کلیم ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم جیراجپور کے مشہور عالم دین مولوی عبداللہ جیراج پوری[۱۸۴۳-۱۸۸۶ء] سے حاصل کی۔بعدازاں شہر اعظم گڑھ میں اپنے والد کے ساتھ رہ کران سے مزید تعلیم حاصل کی۔کچھ دنوں تک جون پور میں بھی تعلیم کی غرض سے مقیم رہے،جس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔پھراعلی تعلیم کے لئے کانپور بھیجے گئے جہاں انہوں نے

کرائس چرچ کالج کانپور سے انٹراور بی اے پاس کیا، پھر آگرہ گئے اور وہاں کے مشہور کالج سینٹ جانس سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] ان کے برادر نسبتی تھے اور کم سنی میں تعلیم کی غرض سے کانپور اور آگرہ میں ان کے ساتھ رہے۔ جس کا ذکرانھوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ (اہل علم کی محسن کتابیں ص۶۴)

محبوب الرحمٰن کلیم کی شعر گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ ایف اے کے طالب علم تھے۔ ان کا سب سے قدیم دستیاب کلام ۱۸۹۳ء کا ہے جو پیام یار لکھنؤ فروری ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اشاعت کے لئے یہ غزل بھوپال سے بھیجی گئی ہے۔ اس وقت وہ بھوپال میں اپنے خاندانی بھائی اور عالم ومحدث مولانا سلامت اللہ جیراج پوری [۱۸۵۱-۱۹۰۴ء] کے یہاں مقیم تھے۔ خیال ہے کہ اس دور کے رسائل میں ابھی اور بھی ان کا کلام تلاش وجستجو سے مل سکتا ہے۔ آگرہ سے ایل ایل بی کے بعد انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رخ کیا، لیکن وہاں تعلیم حاصل کی یا نہیں؟ اس کی تصدیق نہیں ہوسکی اور نہ قیام علی گڑھ کی تفصیلات کہیں دستیاب ہیں۔ البتہ ۱۹۰۲ء میں وہ علی گڑھ کالج کے شعبہ تاریخ میں استاذ مقرر ہوئے اور غالباً ۱۹۱۰ء تک وہ علی گڑھ کالج کے شعبہ تاریخ سے وابستہ رہے۔ یہاں انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''جہاں آرا'' قلم بند کی۔ جسے ۱۹۰۶ء میں ان کے بھتیجے اور معروف عالم ومصنف مولانا محمد اسلم جیراج پوری [۱۸۸۲-۱۹۵۵ء] نے شائع کرایا۔ انہوں نے اس کتاب پر جو مختصر سا دیباچہ لکھا ہے اس میں مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کے تبحر علمی کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عربی وفارسی میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے ان کے ممتاز شاعر صاحب زادے مسعود الرحمٰن کلام کے مجموعہ ''ارمغان کلام'' کے دیباچہ میں محبوب الرحمٰن کلیم کی علمی وادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

''جہاں آرا'' مغل حکمراں شاہ جہاں [۱۵۹۲-۱۶۶۶ء] کی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم [۱۶۱۴-۱۶۸۱ء] پر اردو میں ایک عمدہ کتاب ہے۔ پہلے ایڈیشن کے بعد ۱۹۱۸ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے سہ بارہ اہتمام سے شائع کیا جائے۔ یہی نہیں اس زمانہ میں انہوں نے مغل شہزادیوں پر متعدد مضامین لکھے تھے۔ جو مولانا محمد اسلم جیراجپوری کی کتاب '' خواتین'' میں شامل ہیں۔ غالباً مولانا اسلم جیراجپوری کو انہیں مضامین سے خواتین پر

مضامین لکھنے کا خیال آیا اور انہوں نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جو شیخ عبداللہ کے رسالہ ''خاتون'' علی گڑھ میں شائع ہوا اور جسے بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔

۱۹۱۰ء کے قریب انہوں نے علی گڑھ کالج کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ اور اپنے وطن اعظم گڑھ واپس چلے آئے اور بقیہ زندگی خاک وطن سے لپٹے اور وکالت کرتے رہے اور پھر ۱۹۲۵ء میں اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔ تدفین گاؤں کے قبرستان میں ہوئی۔

دو اہم تاریخی کتابوں کے مصنف اور ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اور ماہنامہ نقاد آگرہ کے مضمون نگار ہونے کے باوجود وہ دنیا سے اس طرح خاموشی سے رخصت ہوئے کہ نہ ان کے لئے کسی نے آنسو بہائے اور نہ ان کا کہیں ذکر آیا۔ گویا ہم آج جس قومی بے حسی کا ماتم کرتے ہیں اس کا سلسلہ پرانا ہے۔

اعظم گڑھ میں وکالت کے ساتھ انہوں نے متعدد ملی اور سماجی سرگرمیوں بھی حصہ لیا۔ علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے چھوٹے بھائی اور ہائی کورٹ الہ آباد کے ممتاز وکیل مولوی محمد اسحاق [م: ۱۲/اگست ۱۹۱۴ء] ان کے عزیز دوست اور نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے ایک ذمہ دار تھے۔ چنانچہ انہوں نے شبلی نیشنل اسکول کا انہیں رکن منتخب کیا۔ اسحاق صاحب کے ساتھ شبلی نیشنل اسکول کی تعمیر و ترقی میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۲/اگست ۱۹۱۴ء کو ان کے دوست مولوی محمد اسحاق نے یکا یک وفات پائی تو مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بے حد رنجیدہ ہوئے اور ان کا بڑا دلدوز نوحہ لکھا جو ۱۹۱۴ء میں کاظمی پریس جون پور سے شائع ہوا۔ اس سے مولوی اسحاق سے ان کے دیرینہ تعلق کے ساتھ ان کی شاعرانہ دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ''مرثیہ اسحاق'' کے اول و آخر کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

الفراق اے قوم کے سرتاج اے جان جہاں
الوداع اے زیر مشق جور مرگ ناگہاں

گلشن عالم نہیں ہے دل لگانے کے لئے
جو یہاں آیا رہے تیار جانے کے لئے

مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے جولائی ۱۹۱۶ میں ماہنامہ معارف جاری کیا تو مولوی محبوب الرحمٰن کلیم نے اس میں بھی مضامین لکھے۔اس میں فن خطابت اور مولانا شبلی کی اردو شاعری جیسے مضامین ان کی یادگار ہیں۔البتہ اس دور کا ان کا ایک فراموش شدہ کارنامہ تقسیم وراثت پر ایک نہایت وقیع کتاب ''الفرائض'' کی تصنیف ہے۔ جو ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اگر چہ وراثت کے موضوع پر ہے،مگر زبان و بیان اور حسن ادا کے لحاظ سے ایک قابل ذکر کتاب ہے۔اسے اہل جیراج پور کو نام نیک رفتگاں ضائع مکن کے تحت دوبارہ ضرور شائع کرا دینا چاہئے۔یہی نہیں جیراج پور علم وادب، دین و مذہب، حکمت و سائنس اور شعروشاعری کا ایک مدت تک گہوارہ رہا ہے اور اب بھی اس کے نقوش روشن ہیں۔ضرورت ہے کہ ''ناموران جیراج پور'' کے حالات اور کارناموں کو قلم بند کر کے محفوظ کر دیا جائے۔امید ہے اہل ذوق اپنے شاندار ماضی کی بازیافت اور حفاظت کے لئے ضرور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے۔

محبوب الرحمٰن کلیم صاحب جس طرح ایک بڑے ادیب وانشاپرداز اور مورخ ومصنف تھے۔اسی طرح ایک ممتاز اور خوش فکر شاعر بھی تھے۔انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ ایک مرثیہ بھی یادگار ہے۔تاہم وہ اصلاً غزلوں کے شاعر تھے۔یہی وجہ ہے کہ ملک کا بڑا ادبی حلقہ ان کی شاعری ہی کی وجہ سے ان سے متعارف تھا۔کان پور، آگرہ، کلکتہ، علی گڑھ، بھوپال اور اعظم گڑھ کے نامور شعرا کی انہوں نے نہ صرف صحبت اٹھائی تھی بلکہ ان کا ادبی مذاق انہیں کے زیر سایہ پروان چڑھا تھا اور خوب خوب دادِ سخن دی تھی۔زمانہ طالب علمی میں وہ آگرہ کے مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ان کا کلام پیام یار لکھنو، نقاد آگرہ اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوا ہے۔انہوں نے علامہ شبلی کی شہرہ آفاق تصنیف ''الفاروق'' پر تبصرہ بھی لکھا تھا جو کانپور کے کسی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔مگر وہ اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔محققین سے درخواست ہے کہ الفاروق پر وہ تبصرہ اگر کہیں نظر میں آجائے تو راقم کو بھی استفادہ کا موقع فراہم کریں گے۔

مولوی محبوب الرحمٰن کلیم نے متعدد بڑے شعرا کی بزم میں اپنا کلام سنایا تھا اور دادِ سخن پائی۔ان میں سید رضا علی وحشت[۱۸۸۱-۱۹۵۶ء]، امیر مینائی [۱۸۲۹-۱۹۰۰ء]، خادم حسین رئیس، بزرگ علی عالی اور واصف حسین واصف کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔امیر مینائی کے

گلدستہ ''دامن گلچیں''میں وہ اپنا کلام اشاعت کے لئے بھیجتے تھے۔''دامن گلچیں'' کے شمارے علی العموم دستیاب نہیں ہیں۔ گذشتہ دنوں اس کے چار شمارے اتفاقیہ ہاتھ آ گئے تو ایک شمارہ میں ان کی ایک غزل نظر سے گذری۔ بقیہ تین شماروں میں مولانا عبدالسلام ندوی کی مسلسل تین غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ مولانا مرحوم کا نادر اور عہد شباب کا کلام ہے اور ان کے مجموعہ ''مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی''میں شامل نہیں ہے۔ اسی طرح مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کی بھی ایک غزل منشی محمد نثار حسین کے ''پیام یار''لکھنو میں مل گئی۔ اگر اس کے تمام شماروں میں ان کا کلام تلاش کیا جائے تو یقین ہے ان کا بھی اور کلام سامنے آئے گا۔ انہی کا نہیں ان کے علاوہ اعظم گڑھ کے متعدد شعرا کا کلام بھی پیام یار میں شائع ہوا ہے اور جو راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ بہرحال مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کی نو دریافت دونوں غزلیں یقینی طور پر مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کے ذخیرہ ادبیات میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان کے پختہ مشق اور قادرالکلام شاعر ہونے کا ثبوت ہیں۔ دونوں غزلیں ہدیہ ناظرین ہیں:

[ا]

کبھی نظر سے جو غائب وہ رشک ماہ رہے
ہماری آنکھوں میں سارا جہاں سیاہ رہے

شریک دوسرا کب ہے سوائے نالہ و آہ
ہمارے حال کا جو ہجر میں گواہ رہے

وہ بت کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گا اپنا
فغان مدو پہ حمایت پر اپنی آہ رہے
؟
سنا ہے آج میرے گھر وہ لائیں گے تشریف
نگاہ شوق مری آج فرش راہ رہے

مزا وہ عشق میں پایا کہ مانگتا ہوں دعا
کسی کے عشق میں حالت مری تباہ رہے

سوا تمہارے کسی کا نہ دل میں دھیان رہے
بس اک تمہاری محبت تمہاری چاہ رہے

مزہ ہو بادہ گساری کا اس دم اے ساقی
فلک پہ ماہ بغل میں وہ رشک ماہ رہے

[پیام یار، لکھنو، فروری ۱۸۹۳ء، ص۱۴-۱۵]

یہ غزل اشاعت کے لئے بھوپال سے بھیجی گئی ہے۔

[۲]

تمہارا مطلع ابرو ہے یا بیت ہلالی ہے
کمر یا شاعران دہر کی نازل خیالی ہے

تمہارے عارض رنگیں کسی کا جب سے آنکھوں میں
مرا تار نظر ہے یا کوئی پھولوں کی ڈالی ہے

طبیعت تو بہل جاتی ہے کچھ میری شب غم میں
در دل سے لگی تیری جو تصویر خیالی ہے

کسی کی سیر کو ہر اک چمن ہے گلشن جنت
کسی کی نذر کو ہر شاخ گل پھولوں کی ڈالی ہے

سواد شام فرقت سے نہ کیوں تسکین ہو دل کو
سیاہی گیسوئے جاناں کی کچھ اس نے چرالی ہے

بڑھا سندور اور افشاں سے لطف کوچہ گیسو
تماشا ہے کہیں ہولی کہیں اس میں دیوالی ہے

مناسب ہے یہ ہو زینت فزائے دامن گلچیں
کلیم خوش بیاں تیری غزل پھولوں کی ڈالی ہے
(دامن گلچیں، مرادآباد، مارچ ۱۸۹۹ء، ص ۲۸-۲۹)

امیر مینائی کے پاس اصلاح و اشاعت کے لئے یہ غزل آگرہ سے بھیجی گئی ہے۔ یہاں ایک لائق ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس غزل کے ساتھ ان کے نام میں نسبت فاروقی لکھی ہوئی ہے۔ جس کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یقیناً یہ سہو کتابت ہے۔

ooo

مولانا عبدالسلام ندوی شمیمؔ
کی چند نو دریافت غزلیں

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے تلمیذ خاص، ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندوی شمیمؔ [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] گونا گوں اوصاف و کمالات کے حامل ادیب و انشاپرداز اور نقاد تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی گراں مایہ تصنیفات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے ہوا تھا اور تاحیات اس سے شغف بھی رکھا، تاہم ان کا شعری سرمایہ بہت مختصر ہے۔ دراصل ان کے بلند اور عظیم الشان نثری کارناموں کے ہجوم میں ان کی شاعری گم ہو کر رہ گئی اور ان کے شاعرانہ جوہر سامنے نہ آسکے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ خود انہوں شاعری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ایک اور سبب یہ ہوا کہ مولانا مرحوم کی وفات کے بعد ان کی جس بیاض سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی [۱۹۰۳-۱۹۷۴ء] نے ان کے کلام ایک حصہ اپنے مضمون میں نقل کیا تھا وہ بیاض غائب ہو گئی۔ اس واقعہ سے بھی ان کی شاعرانہ حیثیت کو نقصان پہنچا۔ ان کی وفات کے پچاس سال بعد ۲۰۰۶ء میں پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم [۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] نے مولانا عبدالسلام ندوی کے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ ''مکاتیب و اشعار مولانا عبدالسلام ندوی'' شائع کیا جو محض ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جس میں چند غزلیں اور متفرق اشعار ہی شامل ہیں۔ انہوں نے اس مجموعہ کے تین ماخد بتائے ہیں۔ پہلا ماخذ خود ان کا اپنا مقالہ ہے جو انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کی زندگی میں لکھا تھا اور جو ان کی وفات کے بعد ماہنامہ آج کل دہلی دسمبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ماخذ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے مولانا

کے انتقال کے بعد ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا اور جسے بعد میں خود کبیر احمد جائسی صاحب نے اپنی ادارت میں نکلنے والے شبلی نیشنل کالج میگزین کے عبدالسلام ندوی نمبر میں شامل کیا تھا اور جو شاہ معین الدین ندوی کے ادبی مضامین کے مجموعہ ''ادبی نقوش'' میں بھی شامل ہے۔ تیسرا ماخذ ماہنامہ معارف ہے، جس میں چار اردو اور دو فارسی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی کا وہ کلام جو رسائل میں شائع ہوا تھا۔ اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور نہ اسے تلاش کرنے کی کوئی کوشش کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا بہت سا کلام اس مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ جن اہل قلم نے مولانا عبدالسلام ندوی کی شاعری پر قلم اٹھایا ہے ان کے پیش نظر وہی مذکورہ بالا کلام رہا۔ خود راقم نے اپنی کتاب ''یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی'' میں انہیں ماخذ پر انحصار کیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی دور طالب علمی میں اپنے بہنوئی اور ممتاز اہل قلم اور شاعر مولوی محبوب الرحمٰن کلیم [۱۸۶۸-۱۹۲۵ء] کے ساتھ کانپور اور آگرہ میں مقیم رہے۔ انہی کی صحبتوں میں انہیں شاعری کا چسکا لگا اور ان کی شاگردی اختیار کر کے شاعری کا آغاز کیا۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۰ء کا زمانہ انہوں نے محبوب الرحمٰن کلیم کے ساتھ کان پور اور آگرہ میں گذارا۔ اس دور میں استاذ اور شاگرد دونوں نے جو کچھ کہا وہ منشی نثار حسین کے ''پیام یار'' اور امیر مینائی [۱۸۲۹-۱۹۰۰ء] کے دامن گلچیں میں شائع ہوا۔ مولانا کے حالات میں یہ صراحت ملتی ہے کہ انہوں نے امیر مینائی سے تلمذ اختیار کیا اور ان داد سخن دی اور جو انہی کے گلدستہ دامن گلچیں میں چھپا۔ گذشتہ دنوں راقم کو کسی کتاب کی تلاش وجستجو میں دامن گلچیں کے چار شمارے ہاتھ آ گئے۔ اور چار میں سے تین شماروں میں مولانا عبدالسلام ندوی کی تین غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک شمارہ میں ان کے استاذ مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کی بھی ایک غزل شامل ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی شاعری روایتی انداز کی شاعری ہے۔ اور اس میں وہی قدیم شعری خوبیاں محبوب کا سراپا، ناز و انداز، واردات حسن و عشق اور ہجر و فراق کا بیان ہے۔ محبوب کے ستم اور اس کے جور و جفا کے واقعات باندھے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ ان نو دریافت غزلوں میں کسی طرح کی کوئی ندرت یا جدت نہیں ہے۔ تا ہم یہ ہمارے ایک بڑے اہل قلم کی نشانی اور یادگار کاوش

ہیں۔اس لئے ان کے قدردانوں کی خدمت میں بطورایک تحفہ کے انہیں پیش کی جارہی ہیں۔

[۱]

للہ آج رخ سے نہ پردہ اٹھایئے
کچھ یاد ہے کہ کل سر بازار کیا ہوا

اس کے بھی چومنے سے خفا ہوگئے حضور
یہ سنگ در بھی آپ کا رخسار کیا ہوا

بیتاب ہو کے لے لیا بوسہ تو بولے وہ
حق میں مرے بلا ہوئی یہ پیار کیا ہوا

میں جی اٹھا جو سن کے مری موت کی خبر
بولے وہ ہائے میرا وفادار کیا ہوا

گھبرائے پھرتے ہیں یہ جناب شمیم کیوں
محشر میں گرم یار کا دربار کیا ہوا
[دامن گلچیں فروری۱۸۹۹ء،ص۱۱]

[۲]

شب فرقت کی تاریکی بھی آفت ہے معاذ اللہ
رقیب روسیہ کے منہ سے بھی کم بخت کالی ہے

مئے گلگوں کی رنگت سے عجب عالم ہے بوتل کا
فرشتے کہتے ہیں یہ نور کے سانچے میں ڈھالی ہے

خدا جانے یہ کیسا رنگ ساقی نے بھرا اس میں
کہ تصویر اس کی کچھ اس سے بھی بڑھ کر بھولی بھالی ہے

نکالا شوخیوں نے جب حیا کو ان کی آنکھوں سے
تو عصمت نے کہا ہے ہے بڑے نازوں کی پالی ہے

شب فرقت بھی میری دیکھ کر شرمائی جاتی ہے
تمہارے گیسوؤں کی رات دنیا سے نرالی ہے

مرے انکار مے نوشی پہ ان کا طنز سے کہنا
چھکتے اس طرح ہیں زہر کی گویا پیالی ہے

شمیم اس گل نے جب دیکھا اسے یوں ہنس کے فرمایا
غزل یا دامن گلچیں میں یہ پھولوں کی ڈالی ہے
[دامن گلچیں مارچ ۱۸۹۹ء، ص ۱۸-۱۹]

[۳]
گر آبلہ پا کی یہی ہے میرے گرمی
کانٹوں کی زبانوں پہ بھی پڑ جائیں گے چھالے

رکھتے نہیں آئینہ وہ پاس اب دم زینت
ڈرتے ہیں کہیں عکس نہ انداز اڑالے

یہ ضعف کا عالم ہے ترے عشق میں ظالم
رہ رہ گئے آ آ کے لبوں تک مرے نالے

ہر اک تری رفتار کے فتنوں سے ہے نالاں
دن رات کیا کرتی ہے پازیب بھی نالے

کیا گرمی خورشید قیامت کا مجھے ڈر
آنچل مرے سر پر تری رحمت تو ہے ڈالے

دن کو جو ہیں کعبے میں تو بت خانے میں شب کو
ہیں ڈھنگ شمیم آپ کے دنیا سے نرالے

(دامن گلچیں مئی ۱۸۹۹ء، ص ۱۲)

•••

شاہ افضال اللہ قادری

ایک گمنام مجاہد آزادی

ضلع اعظم گڑھ کے جن فرزندوں نے جد وجہد آزادی میں نمایاں طور پر حصہ لیا اور جنگ آزادی میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اس میں ایک نمایاں نام حاجی شاہ افضال اللہ قادری چشتی [۱۹۰۱-۱۹۹۱ء] کا بھی ہے۔ حاجی شاہ افضال اللہ قادری چشتی مرحوم شہر اعظم گڑھ کے محلّہ گروٹولہ کے رہنے والے تھے۔ ۶ر فروری ۱۹۰۱ء کو یہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد تعلیم نامکمل چھوڑ کر آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے اور اس قدر سرگرم حصہ لیا کہ وطن عزیز پر اپنا سب کچھ نذر کر دیا۔ وہ تحریک خلافت، ترک موالات، سول نافرمانی، ہندوستان چھوڑ و تحریک وغیرہ کے تحت اعظم گڑھ کے سیاسی عمائدین کے ساتھ شانہ بشانہ شریک رہے۔ گرفتار ہوئے، جیل گئے، پس دیوار زنداں زد وکوب کئے گئے، مگر یہ نشہ آزادی کم نہیں ہوا۔ ان کے والد محمد سلیم نے ملت پریس کے نام سے شہر اعظم گڑھ میں ایک پریس قائم کیا تھا۔ نشہ آزادی میں اس کی طرف بھی توجہ نہیں دی اور وہ برباد ہو گیا۔ ان کے پریس سے ان کے والد ایک اخبار ''سہیل'' نکالتے تھے۔ ایک زمانہ میں وہ اعظم گڑھ کا بہت مقبول اخبار تھا۔ اقبال احمد خاں سہیل [۱۸۸۴-۱۹۵۵ء] اور بعض دوسرے ادبا و شعرا کا کلام بھی اس میں شائع ہوتا تھا۔ وہ بھی اسی نشہ آزادی کی نذر ہو گیا۔ حاجی افضال اللہ کے صاحبزادگان اقبال احمد ادیبی، مشتاق احمد اور حاجی محمد اسلام نے اپنے طور پر اپنی زندگی کے مراحل خود طے کئے۔ ان کی اچھی تعلیم کی طرف بھی افضال اللہ صاحب خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ غرض آزادی کے وہ ایک ایسے متوالے مجاہد تھے جنہوں نے اپنے ملک کی آزادی پر اپنا سب

کچھ قربان کر دیا۔

آزادی یعنی ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء تک وہ مسلسل سرگرم عمل رہے اور آزادی کی تمام تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کم از کم دو بار گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور سزا ہوئی۔ پہلا مقدمہ ۱۲؍اگست ۱۹۳۰ء کو ایک پمفلٹ ''پولس تتھا فوجی بھائیوں کا کرتبیہ'' پولس لائن میں تقسیم کرنے کے جرم میں قائم ہوا۔ اس میں ان کے ساتھ ٹھا کر رام اگیاں سنگھ، اتراج شکل اور رام کمار برنوال بھی شامل تھے۔ دفعہ ۲۴۷، آئی پی سی اور سکشن ۳؍۱۹۲۲ء میں منی تر پاٹھی مجسٹریٹ اول نے تین ماہ قید سخت اور چار ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی۔ اس میں وہ ایک ماہ ۱۳؍دن قید رہے اور پھر گاندھی ارون معاہدے کے تحت رہا ہوئے۔ ان کا قیدی نمبر ۱۴۱۳ تھا۔

۱۹۳۲ء میں دوبارہ مقدمہ قائم ہوا۔ انھوں نے اپنے ملت پریس سے لگان بند کرانے کے لئے پمفلٹ چھاپا اور تقسیم کرایا۔ اس پمفلٹ کا ایک پیکٹ بابو وشو رام رائے املا بازار میں تقسیم کرتے ہوئے گرفتار ہو گئے تھے۔ چنانچہ پمفلٹ طبع کرنے کے جرم میں شاہ افضال اللہ صاحب کے خلاف سی، آئی، ڈی رادھا کرشن سنگھ نے مقدمہ قائم کیا جو خان بہادر عثمان علی خاں مجسٹریٹ اول اعظم گڑھ کی عدالت میں چلا۔ [مقدمہ نمبر ۳۵؍۱۱۔۱۹۳۳ء قیصر ہند مدعی بنام افضال اللہ ملزم] اس میں انھیں ۵۱ روپیہ کا جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں چھ ماہ قید محض کی سزا ہوئی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے ان عملی سرگرمیوں اور مجاہدانہ کارروائیوں کی بنا پر ۱۹۳۷ - ۱۹۳۸ء میں شہر کانگریس کمیٹی کا سکریٹری مقرر کیا۔ چنانچہ انہوں نے تحریک آزادی میں اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آزادی سے پہلے تحریک خلافت اور کانگریس کے رہنما اعظم گڑھ کے حریت پسندوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے جب جب اعظم گڑھ آئے شاہ افضال اللہ صاحب ان کے ساتھ رہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء]، مولانا شوکت علی [۱۸۷۳-۱۹۳۹ء]، بی اماں [۱۸۵۳- ۱۹۲۴ء]، شیخ الہند مولانا محمود الحسن [۱۸۵۱- ۱۹۲۰ء] اور مولانا حسین احمد مدنی [۱۸۷۹- ۱۹۵۷ء] کے پروگراموں میں وہ شریک ہوئے اور ان سے ملاقاتیں کیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو [۱۸۸۹- ۱۹۶۴ء] ۱۹۲۹ء میں جب اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں قیام کیا۔ ان کے قیام وطعام کا انتظام مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۷۸- ۱۹۶۷ء] نے بڑے اہتمام سے کیا تھا۔ دسترخوان پر

ضیافت کی نگرانی شاہ افضال اللہ مرحوم ہی کے ذمہ تھی۔ اسی طرح ۷رمئی ۱۹۳۸ء میں مئو کی سیاسی کانفرنس میں شرکت کے لئے پنڈت جی آئے تو ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں مرحوم شاہ افضال اللہ بھی تھے۔ اس زمانہ میں کسی حریت پسند رہنما کا استقبال آسان نہ تھا۔ انگریزی حکومت کڑی نظر رکھتی تھی اور فرضی مقدمات قائم کر کے سخت سزائیں دیتی تھی، تاہم آزادی کے متوالے ان مصائب اور مشکلات کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ شاہ افضال اللہ قادری نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔

۱۹۳۰ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کو انگریزوں نے غیر قانونی جماعت قرار دیا تو ضلع اعظم گڑھ میں جن لوگوں نے اس کے خلاف سرگرمی دکھائی، ان میں ایک شاہ افضال اللہ قادری بھی تھے۔ ٹھاکر رام اگیاں سنگھ، بابو شیورام رائے، بابو وشورام رائے، پھول بدن سنگھ، اچھے بر شاستری، سوامی سنتو شانند، اوماشنکر مصر کے ساتھ ہیراپٹی کے ایک مندر میں چھپ کر کانگریس کی سرگرمیاں جاری رکھنے والوں میں شاہ افضال اللہ قادری مرحوم بھی تھے۔ یہیں اور اسی مندر میں مشہور مجاہد آزادی رفیع احمد قدوائی مرحوم [۱۸۹۴-۱۹۵۴ء] خفیہ طریقے سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ملے تھے۔ ڈھائی سو روپئے بھی فراہم کئے تھے اور بعد میں مزید رقم بھی بھیجی۔

اسی طرح ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی [۱۸۶۹-۱۹۴۸ء] نے سابرمتی آشرم سے سول نافرمانی اور نمک قانون توڑنے کی تحریک چلائی تو شہر اعظم گڑھ میں مجاہد آزادی عبدالوحید خاں (موضع خالص پور) کی قیادت میں جن لوگوں نے ایلول باغ (شہر اعظم گڑھ) میں نمک بنا کر قانون شکنی کی تھی اس میں عبدالوحید خاں کے ساتھ شاہ افضال اللہ صاحب بھی شریک رہے۔

غرض شاہ افضال اللہ مرحوم ایک بڑے مجاہد آزادی تھے، مگر افسوس کہ ملک کی آزادی کے بعد انھیں بڑی مشکل سے مجاہد آزادی کا سرٹیفیکٹ مل سکا۔ پنشن کے لئے انھوں نے بڑی کوششیں کیں، مگر افسران کے ٹال مٹول رویہ کی وجہ سے پنشن آخر تک نہ مل سکی۔ نشہ آزادی میں گھر بار اور کاروبار وہ پہلے ہی برباد کر چکے تھے، چنانچہ اخیر دور میں انہیں بڑے مسائل و مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور محرری کا پیشہ اختیار کر کے زندگی گذارنی پڑی۔

آزادی کے بعد جب ان کے قویٰ کمزور و ناتواں ہو گئے اور رزق کفاف بھی مشکل ہو گیا

تو انہوں نے حکومت سے پنشن کے لئے درخواست کی۔ آزادی میں اپنے کردار کے ثبوت فراہم کئے، مگر افسوس کہ وہ پنشن کی خواہش لئے اور تکالیف برداشت کرتے ہوئے ۱۹۹۱ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آزادی کے لئے انہوں نے جو قربانیاں دیں، اس سے ملک وقوم کو یقیناً فائدہ ہوا، لیکن خود انہیں کچھ نہیں ملا۔ آخری دنوں میں جب انہوں نے محرری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا، انہیں اعظم گڑھ کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے کمزور صحت اور طول عمر کے باوجود اس کام کو بڑی محنت اور لگن سے انجام دیا۔ کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ تاریخ اعظم گڑھ سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب ورسائل کا مطالعہ کیا۔ اعظم گڑھ شہر اور اس کے مواضعات کا دورہ کیا۔ تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا۔ اہل علم سے ملاقاتیں کیں اور جو سرمایہ انہیں ہاتھ آیا اسے بے کم و کاست ''تاریخ اعظم گڑھ'' کے نام سے مرتب کر دیا۔

حاجی صاحب مرحوم نے ۱۹۸۲ء میں یہ کام مکمل کر لیا تھا، مگر اس کے بعد اور بہت سی معلومات ہاتھ آئیں تو انہیں شامل کر کے ۱۹۸۴ء میں اشاعت کی غرض سے قدیم مسودہ میں حذف واضافہ کیا۔ مولوی محمد شعیب محشر صادقی صاحب نظام آباد سے تعارف وتبصرہ لکھوایا، مگر اس کی اشاعت کی کوئی صورت نہ بن سکی اور ایک سال سے زاید کا عرصہ گذر گیا اور اس دوران کتاب میں مزید اضافہ معلومات ہو گیا تو تیسری بار اس کو ہر طرح سے مکمل کیا، مگر اس کے بعد کہیں جاتے ہوئے گرے اور پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور پھر اسی معذوری میں ۱۹۹۱ء میں وہ اپنے مالک حقیقی کے حضور جا پہنچے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شاہ افضال اللہ قادری نے اگرچہ نشہ آزادی میں تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی تاہم ان کا علمی وادبی مذاق بڑا پختہ تھا۔ معلوم نہیں وہ شعر کہتے تھے یا نہیں لیکن کم از کم وہ اچھے شعر فہم ضرور تھے۔ نعت پاک سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ مختلف شعراء کے نعتیہ کلام پر مشتمل دو، تین مختصر مجموعے خود انھوں نے مرتب کر کے شائع کئے۔ آخری دور میں ایک ضخیم مجموعہ نعت شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ شائع ہوا یا نہیں۔ ایک مجموعہ 'گلزار رحمت' حصہ دوم راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ جس میں قدیم وجدید شعرا کی نعتیں جمع کی ہیں۔ 'گلزار رحمت' کے پشت پر انھوں نے اپنی ایک اور کتاب ''تاریخ الاصفیاء المعروف مشائخ کبار ضلع اعظم گڑھ'' کا اشتہار شائع کیا ہے۔ اشتہار کی

عبارت اس طرح ہے۔

''یہ ضلع اعظم گڑھ کے تصوف وسلوک کے مشائخ کبار کا تذکرہ ہے۔ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، مجدیہ، آبادانیہ، حسینیہ، شطاریہ، قلندریہ، مداریہ، صابریہ، اشرفیہ وغیرہ سلاسل سے جو بزرگان منسلک تھے، انھیں کا تذکرہ خاص طور سے قلم بند کیا گیا ہے۔ ضلع اعظم گڑھ میں کثرت سے بزرگان دین گذرے ہیں۔ لیکن کسی اہل قلم نے اب تک ان کے حالات، سوانح، تعلیمات، ملفوظات قلم بند کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس میں حقیر فقیر نے بڑی کاوش وجانفشانی اور محنت سے ان بزرگان دین کا تذکرہ قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں حقیر کو کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ اہل نظر کر سکتے ہیں۔''

اس اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب شائع ہوگئی تھی، مگر تلاش بسیار کے باوجود راقم کو دستیاب نہ ہوسکی۔

شاہ صاحب نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ قادریہ قائم کیا تھا۔

وہ تصوف وسلوک کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔ قادری، چشتی، نقشبندی ان کی نسبتوں سے ان کے ذوق ومزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جدوجہد آزادی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے اہم کام ''تاریخ اعظم گڑھ'' کی ترتیب وتصنیف ہے۔ حکمرانوں نے اگرچہ ان کی جدوجہد آزادی کا صلہ نہیں دیا، تاہم یقین ہے کہ یہ کتاب ''تاریخ اعظم گڑھ'' بعض کمیوں کے باوجود ان کے نام کو انشاءاللہ ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

♦♦♦

اعظم گڑھ کے چند گمنام شعرا

اوران کا کلام

گلدستوں میں ''پیام یار'' لکھنو اور ''دامن گلچیں'' مرادآباد کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اوراب ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ذکر اہمیت سے کیا جاتا ہے۔اور بلاشبہ ان کی بڑی قابل قدر ادبی وشعری خدمات ہیں۔

ادبی حلقوں اور خاص طور پر اعظم گڑھ کے ادبی حلقوں میں یہ بات تعجب سے سنی جائے گی کہ پیام یار، دامن گلچیں اور باغ سخن جیسے گلدستوں میں اعظم گڑھ کے متعدد شعرا کا کلام شائع ہوا ہے۔ گذشتہ دنوں پیام یار لکھنو کے دس شمارے[مئی ۱۸۹۱ء، جنوری تا جولائی ۱۸۹۲ء، جون، جولائی ۱۸۹۳ء]، دامن گلچیں کے چار شمارے[فروری، مارچ، اپریل، مئی ۱۸۹۹ء] اور باغ سخن میرٹھ کے دو شمارے[ستمبر، اکتوبر ۱۹۰۳ء] ہاتھ آ گئے۔ چنانچہ اس میں اعظم گڑھ کے متعدد شعرا کا طرحی اور غیر طرحی کلام نظر آیا۔ زیر نظر مضمون میں انہی شعرا کے کلام کو یکجا کیا گیا ہے۔ شعرا کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے۔ البتہ جو کچھ معلوم ہوا اسے ان کے کلام کے ساتھ قلم بند کر دیا گیا ہے۔ اس مضمون میں بہت سے پہلو تحقیق طلب ہیں۔ امید ہے کہ اس موضوع پر کام کرنے والے اہل قلم توجہ دے کر اعظم گڑھ کے شعری منظر نامے کی تکمیل کا حق ادا کریں گے۔

۱۔آز: حافظ محمد احمد آز، اعظم گڑھ، شاگرد امیر مینائی۔

قاضی حافظ محمد احمد کوریا پار ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ نام کے ساتھ قاضی اور حافظ کے القاب سے واضح ہے کہ وہ کوئریا پار کے قاضی خاندان کے فرد اور حافظ قرآن تھے۔ ان کی نسبت کہیں کوئریا پاری اور کہیں اعظم گڑھی لکھی ہوئی ہے۔ شاعری میں وہ تاجدار سخن امیر مینائی کے

شاگرد تھے۔ یہ بات بھی پیام یار میں ان کے نام کے ساتھ درج ہے۔ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان کے تین تخلص ہیں۔ پیام یار میں احمؔد اور اسیرؔ دونوں تخلص کے ساتھ ان کا کلام شائع ہوا ہے۔البتہ دامن گلچیں میں ان کا ایک تخلص آزؔ بھی ہے۔آزؔ تخلص سے دو اور احمؔد سے تین اور اسیرؔ سے چار مختصر اور طویل غزلیں ان گلدستوں میں شائع ہوئی ہیں۔

مولانا قمر الزماں مبارک پوری مرحوم[م:۲۰۲۰ء] نے اپنی کتاب ''سخنوران اعظم گڑھ'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔موصوف نے بڑی محنت اور تلاش وتجسس سے ان کے حالات جمع کئے ہیں۔ انہی کا کیا اعظم گڑھ کے سیکڑوں شعرا کے حالات اور نمونہ کلام انہوں نے یکجا کئے ہیں۔خدا کرے وہ شائع ہوکر محفوظ ہو جائیں۔

حافظ محمد احمد کوئریا پاری اصلاً قصبہ گھوسی کے رہنے والے تھے۔ان کے دادا قاضی تراب علی محلّہ قاضی پورہ تھے۔ان کے والد قاضی محمد اسماعیل نے ترک وطن کر کے کوئریا پار میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ان کا کلام پیام یار کے علاوہ اخبار لبرل اعظم گڑھ میں بھی شائع ہوا۔مسدس ''جولا ہے نامہ'' کے جواب میں ''رد جولا ہے نامہ'' لکھی۔جو۱۸۹۹ء میں مطبع احسانیہ گورکھ پور سے شائع ہوئی۔۶۰ رسال کی عمر میں کوئریا پار میں انتقال کیا۔مولوی عزیز الرحمٰن فاروقی کے بقول ان کا خاندان ہجرت کر گیا تھا۔ایک عرصہ پہلے ان کا پوتا مشہود احمد عثانی کراچی کا کمشنر مقرر ہوا تھا۔
(سخنوران اعظم گڑھ ص۱۱۵-۱۲۰)

مگر ہمارے مولانا قمر الزماں مبارک پوری مرحوم کی بھی پیام یار اور دامن گلچیں کی غزلوں تک رسائی نہ ہوسکی تھی۔وہ غزلیں قارئین کی نذر کی جاتی ہیں۔

[۱]

لپیٹے ہار اس رشک چمن نے آج چوٹی میں
جو ناگن پہلے کالی تھی وہی اب کوڑیالی ہے

لئے جاتے ہیں سب نقد عمل میدان محشر میں
کرم اے رحمت غفار میرا ہاتھ خالی ہے

ہماری فکر سے مضموں کمر کا بندھ نہیں سکتا
وہاں زور نزاکت ہے یہاں نازک خیالی ہے

کہا صبح شب وصل اس پری نے دیکھ کر دل کو
نہیں ہے قابل قدر اب کہ ارمانوں سے خالی ہے

ہسی آلودہ لب ہیں رنگ ہے کچھ مسکرانے کا
گھٹا چھائی ہوئی ہے آج بجلی گرنے والی ہے

سنورنے میں کوئی تو سر چڑھا پس پس گیا کوئی
سر افرازی ہے پھولوں کی حنا کی پائمالی ہے

دماغ آز اور ایسے مضامیں نازک و عالی
اسیر لکھنوی کا فیض یہ نازک خیالی ہے
(دامن گلچیں مارچ ۱۸۹۹ء،ص۲)

[۲]

بوسے ترے گالوں کے لیا کرتے ہیں بالے | میں پیار سے دیکھوں بھی تو تو آنکھ نکالے
دل بچنے کی اب کیا کوئی تدبیر نکالے | سینے پہ چڑھے بیٹھے ہیں دل چھیننے والے
اک بوسے پہ بھی آپ تو راضی نہیں ہوتے | دل دے کے مری جان عوض دل کوئی کیا لے
ہم ہاتھ ملیں خون دل آنکھوں سے بہا کر | ہیہات کہ بوسے ترے ہاتھوں کے حنا لے
گالوں پہ نہیں آپ کے یہ گیسوئے پیچاں | رخ حسن کی دولت ہے نگہبان ہیں کالے
کی دست درازی جو شب وصل تو بولے | بے بس ہیں جہاں تک ترا جی چاہے ستالے

اے آز نہ بیدل ہو غم عشق بتاں میں　　کھاتے ہیں یونہی ٹھوکریں سب چاہنے والے

(دامن گلچیں۔ مئی ۱۸۹۹ء، ص ۱-۲)

۲۔احسن سمبھی: مولوی محمد احسن اللہ احسن سمبھی موضع سمبھی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کان پور میں گذرا۔ وہ ماہنامہ زمانہ کان پور کی ادارت سے مدتوں وابستہ رہے۔ اردو کے ممتاز ادیب و شاعر تھے۔ تاحیات دادِ سخن دیتے رہے۔ انہیں عباس مبارکپوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان کے حالات اور تاریخ ولادت وفات معلوم نہ ہو سکے۔

احسن سمبھی نے نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان سے کان پور میں متعدد اشخاص نے مشورۂ سخن کیا۔ ثاقب کانپوری [۱۹۰۴-۱۹۸۵ء] ان کے شاگرد تھے۔ ان کا کلام مختلف رسائل و جراید میں شائع ہوا ہے۔ ان کا دیوان بھی تھا۔ غالباً وہ شائع نہ ہو سکا۔ ان کا یہ شعر بہت مقبول ہے

اچھا ہوا کہ زندگی مختصر ملی

ورنہ امید و بیم کا قصہ دراز تھا

۱۹۰۳ء میں ماہنامہ باغ سخن میرٹھ میں ان کی تین غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ جو قارئین کی نذر کی جاتی ہیں:

[ا]

نشہ مے میں کوئی کب چور تھا　　چشم ساقی کا ہر ایک مخمور تھا

عشق دختِ رز میں یوں میں چور تھا　　میرے زخم دل میں بھی انگور تھا

مانگ میں اس ماہ کے سیندور تھا　　غیرت شمع شب دیجور تھا

قیس وحشی کوہ کن مزدور تھا　　عشق میں کامل مگر منصور تھا

رو کے کہتے ہیں وہ میری قبر پر　　عاشقوں میں یہ بہت مشہور تھا

میں کہوں گا حشر میں اللہ سے　　شیشہ دل ان بتوں سے چور تھا

کیوں نگاہ لطف ہے اغیار پر　　ظلم کرنا تو ترا دستور تھا

چند سانسوں کا فقط تھا فاصلہ　　بس عدم ہستی سے اتنی دور تھا

سن کے آواز گجر صبح وصال　　میں نے یہ سمجھا کہ شور صور تھا

تیرے جاں بازوں سے کچھ نسبت نہیں　　قیس وحشی کوہ کن مزدور تھا
مجکو احسن کیوں خوشی ہوتی نصیب　　میرے پہلو میں دل رنجور تھا
ہاں! اے احسن جدائی دیکھ لی　　ہر جگہ وہ بت بہت مشہور تھا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر۱۹۰۳ء، ص۲۔۳)

[۲]

کوئی مطلب نہ مدعا نکلا　　بے وفا کہتے ہیں نفع کیا نکلا
باوفا ہو کے بے وفا نکلا　　کیا سمجھتے تھے ہم وہ کیا نکلا
جلوہ اس بت کا جابجا نکلا　　کہیں ظاہر کہیں چھپا نکلا
رخ وگیسو کی یاد ہے دل میں　　رات دن کا یہ مشغلہ نکلا
حرم و دیر ایک ذات سے ہے　　یہاں بت اور وہاں خدا نکلا
دل سے امید تھی وفا کی ہمیں　　لیجئے یہ بھی بے وفا نکلا
راہ الفت میں خضر کا کیا کام　　دل ہی خود میرا رہنما نکلا
نرگس قبر صاف کہتی ہے　　کچھ نہ ارمان دید کا نکلا
بادہ کش اس کو بھی پلادیں گے　　شیخ میخانہ تک جو آنکلا
مجھ کو سمجھانے آتی ہیں پریاں　　خوب وحشت کا سلسلہ نکلا
دخت رز شیخ سے یہ کہتی ہے　　ارے تو کب کا پارسا نکلا
جان شیریں ہے اس کے ہجر میں تلخ　　دل لگانے کا یہ مزہ نکلا
پھل لگا نخل سرو میں احسن　　دیکھو سو منہ پہ اس کے کیا نکلا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر۱۹۰۳ء، ص۹-۱۰)

[۳]

اس پری کے گیسوئے خم دار کی الفت میں ہوں
راہ پیما ان دنوں پھر وادی وحشت میں ہوں

جانتے ہو میں تمہارے صدمہ فرقت میں ہوں
مجھ سے پھر بھی پوچھتے ہو تم کہ کس حالت میں ہوں

کررہے ہیں شانہ وہ زلفوں میں میں وحشت میں ہوں
آئینہ وہ دیکھتے ہیں اور میں حیرت میں ہوں

باغ میں آکر مقابل سرو کے وہ سرو قد
پوچھتا ہے کیا میں کم تجھ سے قدوقامت میں ہوں

مانتے ہیں آپ غیروں کو زیادہ کیا سبب
کیا رقیبوں سے میں کچھ کم عزت وحرمت میں ہوں

حضرت ناصح بتاؤ مجھ کو سمجھاؤگے کیا
گفتگو میں تم سے کم ہوں یا میں کم حجت میں ہوں

مانگتا ہوں میں خدا سے اس کے ملنے کی دعا
مبتلا اک بت کے جب سے صدمہ فرقت میں ہوں

ان بتوں نے سر چڑھایا ہے اگر اغیار کو
میں بھی تو اپنے خدا کے سایہ رحمت میں ہوں

مجھ کو احسن روز محشر کا نہیں کچھ غم کہ میں
شافع محشر رسول پاک کی امت میں ہوں

ہم نے احسن اک بت سفاک کو دل دیدیا
پوچھتے ہیں آپ کیا مجھ سے کہ کس حالت میں ہوں
(باغ سخن،اکتوبر۱۹۰۳ء ص۳)

۳۔ احمد: قاضی حافظ محمد احمد، احمد اعظم گڑھی، شاگرد حضرت امیر مینائی

[ا]

ہیں ابھی کم سن محبت کا مزہ کچھ بھی نہیں
شوخیاں تو ہیں مگر ناز وادا کچھ بھی نہیں

نبض میری دیکھ کر گھبرا کے یوں بولا طبیب
یہ مریض عشق ہے اس کی دوا کچھ بھی نہیں

خون میرا مل کے ہاتھوں میں وہ بولے ناز سے
اس کے آگے شوخی رنگ حنا کچھ بھی نہیں

کام دوزخ کا کرو جنت کے ہو امیدوار
کیوں جی احمد آپ کے دل میں حیا کچھ بھی نہیں
(پیام یار،لکھنو۔مئی ۱۸۹۱ء،ص۲)

[۲]

عدم آباد میں وہ پاتے ہیں راحت ایسی
نام آنے کا نہیں لیتے ہیں جو جاتے ہیں

نگہ ناز ، ادا ، ناوک مژگاں ، غمزہ

دل ناشاد کے دشمن یہی ہوجاتے ہیں

(پیام یار، لکھنو۔اپریل ۱۸۹۲ء، ص۳)

---

[۳]

جن کو کہ ہے شوق مئے کشی کا
پاتے ہیں مزا وہ زندگی کا

اب قیس کا نام کون لے گا
چرچا ہے ہماری عاشقی کا

(پیام یار، لکھنو۔جولائی ۱۸۹۲ء، ص۳-۴)

٤۔ اسیر: حافظ محمد احمد اسیر اعظم گڑھی کوئریاپاری، جن کی اور غزلیں دوسرے تخلص سے اوپر نقل ہو چکی ہیں۔

[ا]

کسی عاشق کی بھی کیا آرزو ابتک نہیں نکلی
نہیں نکلی ، نہیں نکلی ،نہیں نکلی ، نہیں نکلی

جو آئے بھی عیادت کو تو دیکھو خوبی قسمت
ادھر بالیں پہ وہ پہنچے ادھر جان حزیں نکلی

نکلتی ہی نہیں ہرگز کبھی یہ خانہ دل سے
ہماری آرزو کم بخت بھی پردہ نشیں نکلی

جو بیمار محبت ہیں کہاں آرام پائیں گے

نہ اس لائق فلک نکلا نہ اس قابل زمیں نکلی

(پیام یار،لکھنو۔جنوری ۱۸۹۲ء،ص۳)

[۲]

بن جاتی ہے تقدیر ہزاروں کی مگر ہاں
عشاق کی قسمت کو سنورنا نہیں آتا

(پیام یار،لکھنو۔مارچ ۱۸۹۲ء،ص۹)

[۳]

یوں ہیں عشاق کے دل کوقرار اک دم نہیں رہتا
الٰہی خیر کرنا آج وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

بری ہوجائے کیوں حالت نہ میری رشک سے ہمدم
قیامت ہے وہ پہلو میں مرے دشمن کے بیٹھے ہیں

(پیام یار،لکھنو۔مارچ ۱۸۹۲ء،ص۱۱)

[۴]

مصور ہمیں اس کی تصویر دیدے
اسے سامنے رکھ کے دیکھا کریں گے

نہ دو ہم کو تم دل مگر ہم تو صاحب
تقاضا کریں گے تقاضا کریں گے

مٹادیجئے اپنی ٹھوکر سے تربت
نہیں تو یہاں لوگ آیا کریں گے

مرا عشق ان پر نہ ظاہر ہو احمد
سنیں گے تو ناحق بکھیڑا کریں گے

(پیام یار، لکھنو۔مئی ۱۸۹۲ء، ص ۳۔۴)

۵۔اظہر: منشی محمد اظہر علی اظہرؔ۔مبارک پور کے باشندہ اور ممتاز شاعر عباس مبارک پوری کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔اظہر تخلص کرتے تھے۔اس کے علاوہ ان کے کسی قسم کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ماہنامہ باغ سخن میں ان کی دو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔

[۱]

وصل اس بت کو جو نامنظور تھا — عین خلوت میں بھی کوسوں دور تھا
وہ موحد ہوں کہ وقت میخوری — جام مے جام سر منصور تھا
بیٹھا جب پہلو میں وہ رشک مسیح — درد دل درد جگر کافور تھا
جب لڑیں آنکھیں بت بے رحم سے — چھن سے اپنا شیشہ دل چور تھا
مل کے مہندی آئے میری قبر پر — خوں رلانا زیر گل منظور تھا
دولت دیں نقد ایماں اے بتو — دے دیا سب جو مجھے مقدور تھا
فرط ہیبت سے پھٹا عالم کا دل — نالہ اپنا بھی فغان صور تھا
بزم میں ان کے نہ آنے پایا غیر — خلد سے ابلیس گویا دور تھا
اظہر مجرم نہ پا جاتا نجات — شان غفاری سے ان کے دور تھا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر ۱۹۰۳ء، ص ۲)

[۲]

کس لئے بے چین حور خلد کی الفت میں ہوں
جب سلیماں کی طرح پریوں کی میں صحبت میں ہوں

کیا کہوں کس دین کس آئین کس منشا میں ہوں
واعظوں میں بھی رسول اللہ کی امت میں ہوں

واعظو! سے تیغ چل جائے گی کوئے یار میں
آج شاغل گیسوئے خم دار کی مدحت میں ہوں

میں رہوں محروم سب چلے مقتضائے مغفرت
بندۂ پر جرم یارب میں تری خلقت میں ہوں
(باغ سخن، اکتوبر ۱۹۰۳ء ص۲)

۶۔ثمر: شاہ رجب علی ثمر، متوطن خاص شہر اعظم گڑھ
شاہ رجب علی ثمرؔ کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

[ا]

جو تری یاد میں رہتے ہیں بہت اچھے ہیں
بھول جاتے ہیں تجھے جو وہی کھو جاتے ہیں

کان رکھ کر کبھی سنتے نہیں پورا قصہ
چھیڑ کر ذکر مرا آپ تو سو جاتے ہیں

جذبہ عشق نے آخر یہ اثر دکھلایا
روز تربت پہ مری آ کے وہ رو جاتے ہیں
(پیام یار، لکھنو۔ اپریل ۱۸۹۲ء، ص۶)

۷۔راز: خواجہ رحمت اللہ خان عرف خواجہ اچھے رازؔ، رئیس اعظم اعظم گڑھ
خواجہ رحمت اللہ خان عرف خواجہ اچھے کے بھی حالات معلوم نہ ہو سکے۔

[ا]

پیارے ہاتھوں کی اگر تم کو ہے تزئین منظور

خون عاشق کا ملو رنگ حنا کچھ بھی نہیں

(پیام یار،لکھنو۔مئی ۱۸۹۱ء،ص۸)

۸۔شمسؔ: شمس الدین شمسؔ،ساکن اعظم گڑھ،مقیم گورکھپور

شمس الدین شمس اعظم گڑھ سے ہجرت کرشہر گورکھپور میں جا بسے تھے۔ان کے بھی حالات معلوم نہ ہو سکے۔

[۱]

گلا کاٹا گیا وہ اف نہ زیر تیغ کیں نکلی
ہمارے منہ سے جب نکلی صدائے آفریں نکلی

جدائی ہوگئی ان کی بہانہ موت کا ہم کو
ادھر وہ گھر سے نکلے تھے ادھر جان حزیں نکلی

زمانہ چیخ اٹھے گا آسماں بھی کانپ جائے گا
ترے مظلوم کی جس دن فغان اندوہ گیں نکلی

جگر کو اس قدر پھونکا بتوں کے سوز الفت نے
کہ منہ سے سانس بھی نکلی تو آہ آتشیں نکلی

(پیام یار،لکھنو۔جنوری ۱۸۹۲ء،ص۱۱)

۹۔شمیمؔ: مولوی محمد عبدالسلام متوطن اعظم گڑھ تلمیذ جناب کلیم

مولانا عبدالسلام ندوی شمیمؔ [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد عزیز، نامور اہل قلم اور مصنف، ادیب وانشا پرداز، شاعر، دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے رفیق، مدۃ العمر علم وادب کی خدمات انجام دیں۔ دو درجن سے زاید بلند پایہ علمی وادبی کتابیں یادگار ہیں۔ دارالمصنّفین میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''یگانہ

روزگار مولانا عبدالسلام ندوی'' مطبوعہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ

امیر مینائی کے گلدستہ ''دامن گلچیں'' کے اوراق میں ان کی تین غزلیں دریافت ہوئیں جو ان کی ابتدائی ادبی زندگی کی یادگار ہیں۔ واضح رہے کہ ان کی یہ غزلیں ان کے مجموعہ کلام ''مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی'' مرتبہ پروفیسر کبیر احمد جائسی میں شامل نہیں ہیں۔

[ا]

للہ آج رخ سے نہ پردہ اٹھایئے
کچھ یاد ہے کہ کل سر بازار کیا ہوا

اس کے بھی چومنے سے خفا ہوگئے حضور
یہ سنگ در بھی آپ کا رخسار کیا ہوا

بیتاب ہو کے لے لیا بوسہ تو بولے وہ
حق میں مرے بلا ہوئی یہ پیار کیا ہوا

میں جی اٹھا جو سن کے مری موت کی خبر
بولے وہ ہائے میرا وفادار کیا ہوا

گھبرائے پھرتے ہیں یہ جناب شمیم کیوں
محشر میں گرم یار کا دربار کیا ہوا

(دامن گلچیں۔فروری ۱۸۹۹ء،ص ۱۱)

[۲]

شب فرقت کی تاریکی بھی آفت ہے معاذ اللہ
رقیب روسیہ کے منہ سے بھی کم بخت کالی ہے

مئے گلگوں کی رنگت سے عجب عالم ہے بوتل کا
فرشتے کہتے ہیں یہ نور کے سانچے میں ڈھالی ہے

خدا جانے یہ کیسا رنگ ساقی نے بھرا اس میں
کہ تصویر اس کی کچھ اس سے بھی بڑھ کر بھولی بھالی ہے

نکالا شوخیوں نے جب حیا کو ان کی آنکھوں سے
تو عصمت نے کہا ہے ہے بڑے نازوں کی پالی ہے

شب فرقت بھی میری دیکھ کر شرمائی جاتی ہے
تمہارے گیسوؤں کی رات دنیا سے نرالی ہے

مرے انکار مے نوشی پہ ان کا طنز سے کہنا
چھکتے اس طرح ہیں زہر کی گویا پیالی ہے

شمیم اس گل نے جب دیکھا اسے یوں ہنس کے فرمایا
غزل یا دامن گلچیں میں یہ پھولوں کی ڈالی ہے
(دامن گلچیں مارچ ۱۸۹۹ء، ص ۱۷-۱۸)

[۳]

گر آبلہ پا کی یہی ہے مرے گرمی
کانٹوں کی زبانوں پہ بھی پڑ جائیں گے چھالے

رکھتے نہیں آئینہ وہ پاس اب دم زینت
ڈرتے ہیں کہیں عکس نہ انداز اڑا لے

یہ ضعف کا عالم ہے ترے عشق میں ظالم
رہ رہ گئے آ آ کے لبوں تک مرے نالے

ہر اک تری رفتار کے فتنوں سے ہے نالاں
دن رات کیا کرتی ہے پازیب بھی نالے

کیا گرمی خورشید قیامت کا مجھے ڈر
آنچل مرے سر پر تری رحمت تو ہے ڈالے

دن کو جو ہیں کعبے میں تو بت خانے میں شب کو
ہیں ڈھنگ شمیم آپ کے دنیا سے نرالے

(دامن گلچیں مئی ۱۸۹۹ء، ص ۱۲)

۱۰۔صغیرؔ : شیخ ہادی حسن صغیر، رئیس دیوگام ضلع اعظم گڑھ

شیخ ہادی حسن صغیرؔ رئیس دیوگاؤں کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ بس ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قصبہ دیوگاؤں کے رہنے والے تھے۔ یہ اعظم گڑھ کا بڑا قدیم اور مردم خیز قصبہ ہے۔ اس کی خاک سے متعدد ارباب شعر و ادب نے جنم لیا۔ ایک صاحب نے اس کی تاریخ لکھی ہے جو بالاقساط دو ماہی پاسبان لال گنج میں شائع ہوئی ہے۔

ہادی حسن صغیر کا محض ایک شعر ملا ہے۔

[۱]

چھوڑ دے عشق ان بتوں کا اے صغیر خستہ دل

حاصل اس کا جان دینے کے سوا کچھ بھی نہیں

(پیام یار، لکھنو۔ مئی ۱۸۹۱ء، ص۱۲)

۱۱۔ظہیر: منشی عبدالروٗف کاتخلص ظہیر تھااور یہ اعظم گڑھ کی شرفا کی ایک بستی موضع سمبھی کے رہنے والے تھے۔مولوی محمد غلام عباس متخلص بہ عباس مبارک پوری کے شاگرد تھے۔ان لے مزید حالات معلوم نہ ہوسکے۔ان کی تین غزلیں ماہنامہ گلدستہ باغ سخن میرٹھ میں شائع ہوئی ہیں جودرج ذیل ہیں۔

[۱]

ذکر غلمان تھا نہ ذکر حور تھا ہم جہاں بیٹھے ترا مذکور تھا
حق بنا بندہ یہ کیا دستور تھا قابل دار اس لئے منصور تھا
جاں دیدے پہلے پھر عاشق بنے یہ در محبوب پر منظور تھا
روئے رنگیں کا جو بوسہ لے لیا دل کی بیتابی تھی میں مجبور تھا
تھی ریائے پارسائی شیخ کی لب پہ حق حق دل میں عشق حور تھا
عاشقوں کو تیرے ایمن، ترا بام موسیٰ عمراں کا کوہ طور تھا
مصحف رخسار کو چوما تو کیا شرط تھی تعظیم میں مجبور تھا
ہجر کی شب تیر غم سے اے ظہیر دل ہمارا خانہ زنبور تھا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر ۱۹۰۳ء، ص۷)

[۲]

جب سے گلدستہ شمس کا نکلا دل بہلنے کا مشغلہ نکلا
جذبہ دل بتاؤں کیا نکلا رہ الفت میں رہنما نکلا
ہم جسے باوفا سمجھتے تھے وہ دغاباز و بے وفا نکلا
میں وصال صنم سے شاد ہوا مدعی کا نہ مدعا نکلا
کل بتوں کا تھا گھر خدا کی شان آج کعبہ وہ بتکدہ نکلا
چند روزہ تھا حسن وناز وشباب ایک ان میں نہ دیرپا نکلا

میں بھی تو ہوں تمہارا شیدائی　　گل پہ بلبل جو شیفتہ نکلا
فیض استاد سے ظہیر حزیں　　شعر گوئی میں چلبلا نکلا

(باغ سخن میرٹھ،ستمبر۱۹۰۳ءص۱۳)

[۳]

جمگھٹے میں یاس وغم کے میں عجب صحبت میں ہوں
ساتھ ہیں سب کب میں تنہا گوشہ تربت میں ہوں

واعظو تم وصف جنت مجھ سے کرتے ہو عبث
کوئے جاناں میں ہے مسکن رات دن جنت میں ہوں

صاف کہہ دوں گا بتو جو پوچھیں گے فرشتے قبر میں
شافع روزجزا کے مذہب و ملت میں ہوں

بڑھتی جاتی ہے پریشانی وہ سلجھاتے ہیں زلف
آئینہ وہ دیکھتے ہیں اور میں حیرت میں ہوں

نخل الفت کا ثمر کچھ بھی نہ پایا اے ظہیؔر
اس بت شمشاد قد کی میں عبث الفت میں ہوں

(باغ سخن میرٹھ،اکتوبر۱۹۰۳ءص۱۰)

۱۲۔عاشق: منشی محمد غلام حسین عاشؔق مبارک پوری،مبارک پور کے نامور شاعر عباس مبارک پوری کے شاگرداوران کے بڑے صاحبزادہ تھے۔مزید حالات معلوم نہ ہوسکے۔

[ا]

عشق پریوں کا نہ عشق حور تھا

مجکو بھایا وہ بت مغرور تھا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر ۱۹۰۳ء ص ۸)

[۲]

جو تیرے در پہ ساقی آنکلا　　دختر زر کا شیفتا نکلا

جب نہ کچھ خط کا مدعا نکلا　　سمجھے تقدیر کا لکھا نکلا

ارے تو مدعی مرا نکلا　　اور غیروں کا آشنا نکلا

ناز کرکے وہ نازنیں ہے بنا　　دل مرا لے کے دل ربا نکلا

بوسہ رخ پہ یہ نہیں کیسی　　کل کہا کیا تھا آج کیا نکلا

بارگاہ شہی جسے سمجھے　　وہی تکیہ فقیر کا نکلا

دیکھ کر رخ کو دیکھا زلف سیاہ　　ہوکے لندن سے شام جا نکلا

ہوکے گمراہ اور راستہ بھولا　　راہ الفت میں خضر آنکلا

دے کے دل ان کو بن گئے بیدل　　عشق میں اور نفع کیا نکلا

الفت زلف و چہرۂ معشوق　　دل عاشق کا مشغلہ نکلا

شعر میری غزل کا اے عاشق　　سب سے اچھا ہے گو برا نکلا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر ۱۹۰۳ء ص ۱۴-۱۵)

۱۳۔عاملؔ: سید زین العباد عامل، تعلقہ دار چماواں ضلع اعظم گڑھ

چماواں اعظم گڑھ کے شرفا کی ایک بستی ہے۔سید زین العباد عاملؔ یہیں کے رہنے والے تھے۔ان کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔

[۱]

فراق یار میں حالت یوں ہی تباہ رہے

جگر میں ٹیس اٹھے اور لب پہ آہ رہے

(پیام یار، لکھنو۔فروری ۱۸۹۲ء، ص ۱۱)

۱۴۔عباس مبارک پوری: مولوی محمد غلام متخلص بہ عباس قصبہ مبارک پور

کے رہنے والے تھے۔ موضع سمبھی میں ان کے متعدد تلامذہ کا ذکر ملتا ہے جو ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ان کے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

ماہنامہ باغ سخن میرٹھ سے ان کی تین غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔

[ا]

جب خیال عارض پر نور تھا — ہر چراغ خانہ شمع طور تھا
عین غفلت کا جو پردہ دور تھا — دیکھا جس کو دیکھنا منظور تھا
عین غفلت میں جب آنکھیں کھل گئیں — جس طرف دیکھا اسی کا نور تھا
تاک کر توڑے ہیں دل کے آبلے — اے صنم! کیا خوشہ انگور تھا
کیا کہوں اپنے سیہ حالی کا حال — چھت بھی سامان شب دیجو تھا
دسترس کہتے ہیں اس کو پالیا — یار کو نزدیک تھا یا دور تھا
زلف بت کے آگے کس نے قدر کی — داڑھی پر زاہد کے حق کا نور تھا
جب دوپٹہ ان کا باندھا صندلی — درد سر سر سے میرے کافور تھا
پونچھتے ہی پونچھتے اک دن مرا — چشم عاشق یا کوئی ناسور تھا
اف رے گرمی تجلائے صنم — خاک اک لمحہ میں جل کر طور تھا
بیچ میں سوئے وہ رکھ کر تیغ کو — وصل کی شب وصل نامنظور تھا
آئینہ دیکھا خودی جاتی رہی — آئینہ رو کس قدر مغرور تھا
دونوں سے نسبت نہیں عباس کو — قیس مجنوں کوہ کن مزدور تھا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر ۱۹۰۳ء ص ۸)

[۲]

مدعی کا تو مدعا نکلا — ہائے اپنا نہ حوصلہ نکلا
بام پر جب وہ ماہ آنکلا — غل ہوا مہر پر رضا نکلا
میں جو عباس باوفا نکلا — وہ صنم بانی جفا نکلا
لب ساحل سفینہ جا نکلا — جب خدا بن کے ناخدا نکلا

گھر چھٹا سوئے دشت آنکلا — بڑھی وحشت تو یہ مزا نکلا
کام تم سے نہ کچھ مرا نکلا — اور غیروں کا مدعا نکلا
جور میں پہلوئے وفا نکلا — کوسنا یار کا دعا نکلا
خط بینی جسے سمجھتے تھے — الف مصحف خدا نکلا
دیدۂ یار جب نظر آیا — سورۂ صاد کا پتا نکلا
چوم کر زلف بوسہ رخ کا لیا — بتکدہ سے میں کعبہ جا نکلا
کل جو سلطان ہفت کشور تھا — آج دیکھا تو وہ گدا نکلا
مدعی بن کے وہ سنتے ہی — واں گلہ عرض مدعا نکلا
ہائے ٹالے سے بھی نہیں ٹلتا — ہجر کا دن بھی کیا بلا نکلا
سبزۂ خط کے عشق میں اے جان — سم بھی میرے لئے دوا نکلا
ہوئے بے چین جب تو چین آیا — درد دل نسخہ شفا نکلا
کوئے جاناں میں لے گیا آخر — شوق بھی خضر رہنما نکلا
کیا لکھوں وصف جنبش ابرو — جوہر خنجر قضا نکلا
نقد دل نقد جاں کھو بیٹھا — گھر سے میں تیرے بے نوا نکلا
اب تو زاہد بھی سجدے کرتا ہے — صنم سنگ دل خدا نکلا
ہوگئیں کشتہ حسرتیں مدفون — دل عباس کربلا نکلا
جس کو عباس ہم ولی سمجھے — وہی رندوں کا پیشوا نکلا

(باغ سخن میرٹھ، ستمبر ۱۹۰۳ء ص ۱۳-۱۴)

[۳]

اے پری میں کیا کہوں تجھ سے کہ کس حالت میں ہوں
چھوڑ کر بستی کو میں اب وادی وحشت میں ہوں

دیکھ کر رخسار شکل آئینہ حسرت میں ہوں

زلف دیکھی چاک دل ہے شانہ کی صورت میں ہوں

جنس بوسہ حسن کے بازار میں کیا مال ہے
گر ملے مجھ کو یہ دولت صاحب دولت میں ہوں

جس کی چوکھٹ کا نہیں جبریل کو بوسہ نصیب
اللہ اللہ اس کی دربانی کی میں خدمت میں ہوں

کیوں زمانہ زیر و بالا سے خدا ہوتا نہیں
وہ ہیں کوٹھے پر میں نیچے سیکڑوں آفت میں ہوں

حال مجھ رنجور کا کیا پوچھتے ہو اے بتو
شکر ہے اللہ کا جس حال میں جس گت میں ہوں

دل میں آیا اس کا غم اور خون دل باقی نہیں
کس طرح مشغول میں مہمان کی دعوت میں ہوں

دمبدم آتی ہے اے عباس بوئے باغ خلد
کوچہ جاناں میں بستر ہے کہ میں جنت میں ہوں

(باغ سخن میرٹھ، اکتوبر ۱۹۰۳ء، ص ۱۱)

۱۵۔علیمؔ: منشی محمد علیم اللہ علیمؔ ساکن ضلع اعظم گڑھ حال وارد برہانپور

منشی محمد علیم اللہ علیمؔ اعظم گڑھ کے باشندہ تھے مگر ترک وطن کر کے برہان پور چلے گئے تھے۔ وہیں وفات پائی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ البتہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ شہر اعظم گڑھ

کے رہنے والے تھے یا کسی گاؤں کے تھے۔ان کا محض ایک شعر ماہنامہ ''پیام یار'' لکھنو میں نقل ہوا ہے۔

[ا]

نقاب اٹھائی جو اس نے رخ منور سے
ہوا یہ حال کہ سکتے میں مہرو ماہ رہے

(پیام یار،لکھنو۔فروری ۱۸۹۲ء،ص ۱۱)

۱۶۔کلیمؔ: مولوی محبوب الرحمٰن کلیمؔ جیراج پوری اعظم گڑھی از بھوپال

مولوی محبوب الرحمٰن کلیم موضع جیراج پور ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مولوی عبداللہ جیراج پوری سے حاصل کی۔پھر ضلع اعظم گڑھ، جون پور، کانپور اور آگرہ میں تعلیم حاصل کی۔کان پور سے انٹر اور بی اے کیا۔آگرہ سے قانون کی سند لی۔۱۹۰۲ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں تاریخ کے استاذ مقرر ہوئے۔۱۹۱۰ء کے قریب ترک ملازمت کے بعد اعظم گڑھ لوٹ آئے۔اور بقیہ زندگی کچہری اعظم گڑھ میں وکالت کے نذر کردی۔۱۹۲۵ء میں وفات پائی اور اپنے گاؤں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

درج ذیل دونوں غزلیں پیام یار اور دامن گلچیں میں چھپی تھیں اور نو دریافت ہیں۔

[ا]

کبھی نظر سے جو غائب وہ رشک ماہ رہے
ہماری آنکھوں میں سارا جہاں سیاہ رہے

شریک دوسرا کب سے ہے سوائے نالہ و آہ
ہمارے حال کا جو ہجر میں گواہ رہے

وہ بت کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گا اپنا
فغان مدو پہ حمایت پر اپنی آہ رہے

سنا ہے آج میرے گھر وہ لائیں گے تشریف
نگاہ شوق مری آج فرش راہ رہے

مزا وہ عشق میں پایا کہ مانگتا ہوں دعا
کسی کے عشق میں حالت مری تباہ رہے

سوا تمہارے کسی کا نہ دل میں دھیان ہے
بس اک تمہاری محبت تمہاری چاہ رہے

مزہ ہو بادہ گساری کا اس دم اے ساقی
فلک پہ ماہ بغل میں وہ رشک ماہ رہے

(پیام یار، لکھنو۔فروری ۱۸۹۲ء، ص۱۴-۱۵)

یہ غزل اشاعت کے لئے بھوپال سے بھیجی گئی ہے۔گویا اس وقت وہ بھوپال میں مقیم تھے۔البتہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ بھوپال میں کس غرض سے گئے تھے۔ممکن ہے ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں گئے ہوں۔اس لئے کہ جیراج پور کے متعدد اہل علم بالخصوص حکماء وہاں درباری ملازم و حکیم تھے۔دوسری غزل یہ ہے۔

[۲]

تمہارا مطلع ابرو ہے یا بیت ہلالی ہے
کمر یا شاعران دہر کی نازک خیالی ہے

تمہارے عارض رنگیں کسی کا جب سے آنکھوں میں
مرا تار نظر ہے یا کوئی پھولوں کی ڈالی ہے

طبیعت تو بہل جاتی ہے کچھ میری شب غم میں
در دل سے لگی تیری جو تصویر خیالی ہے

کسی کی سیر کو ہر اک چمن ہے گلشن جنت
کسی کی نذر کو ہر شاخ گل پھولوں کی ڈالی ہے

سواد شام فرقت سے نہ کیوں تسکین ہو دل کو
سیاہی گیسوئے جاناں کی کچھ اس نے چرالی ہے

بڑھا سندور اور افشاں سے لطف کوچہ گیسو
تماشا ہے کہیں ہولی کہیں اس میں دیوالی ہے

مناسب ہے یہ ہو زینت فزائے دامن گلچیں
کلیم خوش بیاں تیری غزل پھولوں کی ڈالی ہے
(دامن گلچیں، مرادآباد، مارچ ۱۸۹۹ء، ص ۲۸-۲۹)

یہ غزل امیر مینائی کے پاس اصلاح و اشاعت کے لئے آگرہ سے بھیجی گئی ہے۔ یہاں ایک لائق ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس غزل کے ساتھ ان کے نام میں فاروقی کی نسبت لکھی ہوئی ہے۔ جس کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا۔

۱۷۔نذیرؔ: مولوی محمد نذیر، متوطن اعظم گڑھ حال وارد سلون
ان کے متعلق بھی تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔

[ا]

قضا ہر ایک کی اک دن بلا شک آنے والی ہے

یہ شرطیہ وہ ہے جس میں مقدم ہے نہ تالی ہے

چمن میں دیکھ کر اس گل کو کہتی تھی یہی بلبل
کہ تیری نذر کو ہر شاخ گل پھولوں کی ڈالی ہے

کمر کو اس قمر کی بال سے تشبیہ دوں کیوں کر
نہیں محسوس ہوتی اک فقط صورت خیالی ہے
(دامن گلچیں مارچ ۱۸۹۹ء، ص ۳۲)

۱۸۔واحد: مولانا محمد واحد علی صاحب واحدؔ موضع سمبھی کے رئیس تھے۔ ان کی ایک غزل ماہنامہ باغ سخن میرٹھ میں ملی ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

[ا]

گیسوئے یار دل ربا نکلا عاشقوں کے لئے بلا نکلا
بت کہیں یہاں جو آ نکلا میرا ارمان وصل کا نکلا
گردش چرخ سے کوئی نہ بچا تھا جو سلطاں وہی گدا نکلا
ہر کہ نادان نکلا خود ہشیار ایک سین اپنے وقت کا نکلا
جان دینی ہو جس کو عشق کرے ہے عدم کا یہ راستہ نکلا
گھر کے گھر کردئے تونے برباد کام کیا تیرا اے قضا نکلا
مصطفٰے بہرہ گیتی امت دونوں عالم میں ناخدا نکلا
دہر نا پائیدار کا ساماں بے ثبات اور حباب سا نکلا
پونچھ لے ہم سے کوئی اے واحد دل لگانے میں کیا مزا نکلا
(باغ سخن میرٹھ، ستمبر ۱۹۰۳ء ص ۱۵)

•••

اعظم گڑھ میں اردو صحافت

اور قدیم مطابع

اعظم گڑھ اپنی مردم خیزی اور گراں قدر علمی، ادبی، تنقیدی، تعلیمی اور تاریخی خدمات کے لئے پوری ادبی دنیا میں شہرت و امتیاز رکھتا ہے۔ خاص طور سے علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں مصنّفین اعظم گڑھ کو خصوصی امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس کی خاک سے اٹھ کر بے شمار ارباب کمال سپہر علم و ادب پر نیر اعظم بن کر چمکے، جن کے علم و فضل، تبحر اور علمی و ادبی کمالات کا دانشوروں نے برملا اظہار و اعتراف کیا ہے۔ البتہ یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ اعظم گڑھ کی علمی و ادبی خدمات اور اردو زبان و ادب کے ارتقاء، عہد بہ عہد ترقیوں اور تبدیلیوں کا جائزہ اب تک نہیں لیا جا سکا ہے، حالانکہ اعظم گڑھ کے اہل علم اور ارباب شعر و ادب نے مختلف شعبوں میں گراں قدر اور نہایت عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔

خاک اعظم گڑھ سے جنم لینے والے شیدائیان علم و ادب نے دوسرے میدانوں کے ساتھ صحافت کے میدان میں بھی سنگ میل قائم کیا۔ اور چند ممتاز صحافی پیدا کئے، جنہوں نے اس حیثیت سے پوری دنیا میں صحافت کا نام روشن کیا۔ اس کے آغاز سہرا بھی علامہ شبلی کے سر ہے۔ ۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ایم اے او کالج سے وابستہ ہوئے تو سرسید احمد خاں [۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء] نے انہیں ماہنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے شعبہ اردو کی ادارت کی ذمہ داری سونپی جسے انہوں نے ۱۸۹۸ء تک بخوبی ادا کیا۔ بعدازاں وہ تحریک ندوہ سے وابستہ ہوئے اور اس کا ترجمان ماہنامہ الندوہ جولائی ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا تو مئی ۱۹۱۲ء تک اس کی

ادارت کا فریضہ انہیں نے انجام دیا۔ کم عرصے میں ماہنامہ الندوہ نے ایک بڑے علمی طبقہ کو متاثر کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸ - ۱۹۵۸ء] ، مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳ - ۱۹۵٦ء]، مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء]، مولانا عبداللہ عمادی [م: ۲۸/ اگست ۱۹۴۷ء] وغیرہ نے علمی و ادبی صحافت کا آغاز اسی الندوہ کے صفحات سے کیا۔ بعد میں مولانا آزاد نے جب الہلال جاری کیا تو مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی بھی اس کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔

علامہ شبلی کے علاوہ متعدد ایسے اہل علم اور باکمال صحافی گذرے ہیں جو اگر چہ اعظم گڑھ کی خاک سے اٹھے، لیکن ان کا دائرہ کار ملک کے دوسرے علاقوں میں صحافت سے رہا اور انہوں نے علمی و ادبی صحافت کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ جس طرح اعظم گڑھ کے صحافیوں کی خدمات کی علاحدہ کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی اسی طرح اعظم گڑھ میں اردو صحافت کن مراحل سے گذری اور اس کی تاریخ کیا ہے؟ سرے سے اس کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ اس مضمون میں ضلع اعظم گڑھ میں آغاز سے بیسویں صدی کے وسط تک اردو صحافت کے بکھرے نقوش کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اعظم گڑھ نسبتاً ایک نیا ضلع ہے۔ ۱۸۳۲ء میں اسے انگریزوں نے ضلع بنایا۔ اس سے پہلے وہ مختلف عہد میں سرکار جون پور اور غازی پور وغیرہ کا حصہ رہا۔ یہی سبب ہے کہ اس کی علمی و صحافتی تاریخ کا ایک حصہ ان اضلاع اور ریاستوں کی تاریخ کا اہم حصہ ہے۔

آفتاب ہند اعظم گڑھ

اعظم گڑھ میں اردو صحافت کا آغاز فروری ۱۸۸٦ء میں ہفتہ وار اخبار آفتاب ہند کی اشاعت سے ہوا۔ یہ اخبار شہر اعظم گڑھ کے محلّہ معتبر گنج (نزد سرکاری شفا خانہ) سے جاری ہوا تھا۔ چار صفحات پر مشتمل یہ اخبار دوشنبہ کو شائع ہوتا تھا۔

آفتاب ہند کا سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔ اس کے مالک و منیجر قدرت علی خاں لکھنوی تھے۔(۱)

ہفتہ وار آفتاب ہند مطبع آفتاب ہند میں طبع ہوتا تھا۔ گویا ہفتہ وار آفتاب ہند کا اپنا مطبع تھا،

مگر نادرعلی خاں نے اپنی کتاب ''ہندوستانی پریس'' میں جہاں اعظم گڑھ کے مطابع کا ذکر کیا ہے اس میں اس مطبع کا ذکر نہیں کیا ہے۔(۲) حالانکہ انہوں نے اعظم گڑھ کے پانچ مطابع کا ذکر کیا ہے۔اوران کی معمولی تفصیلات بھی قلم بند کی ہیں۔

ا۔ مطبع نیر اعظم

مطبع نیر اعظم ہندوستان کے نامور ترین مطبع نول کشور لکھنؤ کی اعظم گڑھ میں ایک شاخ کے طور پر قائم ہوا تھا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ جون ۱۸۶۷ء میں منشی نول کشور [۱۸۳۶-۱۸۹۵ء] نے شہر اعظم گڑھ کے محلّہ پہاڑ پور میں اپنا مطبع قائم کیا تھا۔ یہ مطبع انہوں نے خان بہادر مولوی حافظ عبدالعزیز صدر الصدور کی فرمائش پر شیخ باسو کے مکان میں محلّہ پہاڑ پور میں قائم کیا تھا۔ یہ اگرچہ مطبع نول کشور کی شاخ تھا، مگر اس کا نام اس سے جدا اور نیر اعظم تھا۔ کتابوں میں صرف اس کے قیام کا ذکر ہے۔اس کی تفصیلات اور اس کی خدمات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ (۳) امیر حسن نورانی نے منشی نول کشور پر اپنی کتاب ''علمی اجالے'' میں ان کے مطبع کی جن شاخوں کا ذکر کیا ہے اس میں لاہور، کان پور، اجمیر اور جبل پور کی شاخوں کا ذکر ہے، مگر اعظم گڑھ کی شاخ کا نام درج نہیں ہے۔(۴)

۲۔ مطبع محمدی

یہ مطبع ریٹائرڈ تحصیل دار نجف خاں کے مکان میں ۱۸۷۷ء/ ۱۸۷۸ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے مالک جناب شیخ محمد خاں اور لیاقت علی صاحبان تھے۔اس کے کاتب بھی غلام علی صاحب تھے۔ یہ تمام معلومات جناب نادر علی خاں کی کتاب ''ہندوستانی پریس'' سے معلوم ہوئی ہیں۔

۳۔ مطبع عزیزی

یہ محلّہ پہاڑ پور میں محمد علی خاں تحصیل دار کے مکان میں قائم تھا۔اس کے کاتب بھی غلام علی ہی تھے۔اس کا اجراء ۱۸۷۷ء میں ہوا تھا۔

۴۔ مطبع الہامیہ

۱۳/اکتوبر ۱۸۸۷ء کو قائم ہوا۔ یہ غالباً مولوی الہام علی موہانی کا مطبع تھا۔

۵۔ مطبع آفتاب

یہ ۱۸۹۵ء میں قائم ہوا۔ (۵)

ان کے علاوہ ضلع اعظم گڑھ کی تاریخ میں مہتاب پریس، ملت پریس، احسن پریس اور اتحاد پریس کے نام بھی ملتے ہیں جو انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئے (۶) اور طباعت و اشاعت اردو کی خدمات انجام دیں، مگر ان کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔

اسی طرح مالکان مطابع شیخ باسو محلّہ پہاڑ پور، خان بہادر مولوی حافظ عبدالعزیز صدر الصدور، نجف خاں، شیخ محمد خاں، لیاقت علی خاں اور محمد علی خاں کے حالات اور ان کی خدمات کی تفصیلات تلاش بسیار کے باوجود معلوم نہ ہو سکیں۔ اس کے کاتب غلام علی تھے۔ جو اعظم گڑھ کے ایک سے زاید مطابع کے کاتب تھے۔ ان کا ذکر بھی کہ وہ کہاں کے باشندہ تھے اور انہوں نے کہاں سے خطاطی سیکھی اور کب تک کام کیا وغیرہ کچھ معلوم نہیں۔

شہر اعظم گڑھ کا ایک قدیم محلّہ باز بہادر ہے اور کوٹ قلعہ سے ملحق ہے۔ اس کے مغربی حصہ کو محلّہ کاتبان بھی کہا جاتا تھا۔ اس میں کثرت سے خطاط اور خوش نویس آباد تھے۔ ہم نے بچپن میں نامور خطاط مولوی عبدالغفار صاحب مرحوم کو دیکھا ہے جو کسی زمانہ میں دارالمصنّفین اور ماہنامہ معارف کے خطاط تھے اور اپنی منفرد خطاطی کے لئے معروف تھے۔ ان کے خانوادے کے مولوی انوار احمد اور دیگر خطاط بھی یہاں بود و باش رکھتے تھے۔

ہمارے دوست مولانا جاوید احمد قاسمی صاحب امام وخطیب جامع مسجد محلّہ دلال گھاٹ شہر اعظم گڑھ مولوی عبدالغفار مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ ان کا قاسمی پریس اور ان کے بڑے والد ڈاکٹر عبدالقادر [م: ۱۹۷۱ء] کی نشانی قادری پریس اسی محلّہ باز بہادر گلی کاتبان میں ابتک قائم ہیں اور اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ہفتہ وار خورشید اعظم گڑھ

آفتاب ہند کے اجرا کے ڈیڑھ سال بعد ۱۳/ اکتوبر ۱۸۸۷ء کو شہر اعظم گڑھ سے ہفتہ وار اخبار ''خورشید'' جاری ہوا جو ہر پنج شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔اس کے مالک، ایڈیٹر اور کاتب مولوی الہام علی موہانی تھے۔ اخبار کا اپنا مطبع ''الہامیہ'' تھا جو اپنے مالک کے نام کی طرف منسوب تھا۔ سولہ صفحات کے اس ہفتہ وار اخبار خورشید کا سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔(۷)

نادر علی خاں نے اپنی کتاب ہندوستانی پریس میں اس مطبع الہامیہ کا ذکر کیا ہے۔ البتہ تاریخ اعظم گڑھ کے مصنف حاجی شاہ افضال اللہ قادری نے اس کا نام اپنی فہرست میں درج نہیں کیا ہے۔

ہفتہ وار خورشید کے ایڈیٹر الہام علی موہانی کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالباً حسرت موہانی کے ہم وطن تھے اور موہان ضلع اناؤ کے باشندہ تھے۔

لبرل اعظم گڑھ

ہفتہ وار خورشید کے بعد ۱۸۹۵ء میں اعظم گڑھ سے ہفتہ وار اخبار لبرل جاری ہوا۔ اس کا ایک مقصد حکومت اور رعایا کی خیر خواہی کے ساتھ انشا پردازی بھی تھا۔(۸) قدرت علی خاں اس کے ایڈیٹر تھے۔ تلاش وجستجو کے باوجود نہ اخبار لبرل کا کوئی شمارہ ملا اور نہ مدیر کے حالات معلوم ہوئے۔ یہ اخبار مطبع آفتاب ہند اعظم گڑھ میں چھپتا تھا۔ آٹھ صفحات کا اخبار تھا۔ سالانہ چندہ چھ روپیہ تھا۔(۹)

اردو صحافت پر لکھی جانے والی متعدد کتابوں مثلاً ''فہرست اخبارات ہند'' از مولوی محبوب عالم [۱۸۶۲ - ۱۹۳۷ء] ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور، صحافت کی ایک نادر تاریخ اور ''تاریخ صحافت'' حصہ سوم از مولانا امداد صابری [۱۹۱۴ - ۱۹۸۸ء] وغیرہ میں اخبار ''لبرل'' کا ذکر کیا گیا ہے، مگر بہت مختصر۔ ان سے ضروری تفصیلات بھی نہیں ملتیں۔

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ

اعظم گڑھ میں علمی صحافت کا آغاز ماہنامہ معارف کے اجرا سے ہوا۔ یہ جولائی ۱۹۱۶ء میں دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے ترجمان کی حیثیت سے نکلا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری علمی، دینی، ادبی اور تاریخی دنیا کا اپنا ترجمان تھا۔ یہ اس کے مؤسس اور بانی کا اخلاص تھا کہ معارف اب تک بلا ناغہ جاری ہے۔ شاید ہی ملک کا دوسرا رسالہ اس قدر طویل مدت سے پابندی سے نکل رہا ہو اور شوق کی نگاہوں سے پڑھا جاتا ہو۔ علامہ اقبال سے لے کر ڈاکٹر حمید اللہ تک باوقار اہل علم وادب کا ایک بڑا طبقہ گذشتہ ایک صدی سے نہ صرف اس سے وابستہ رہا بلکہ اس کی انفرادیت اور عظیم الشان خدمات کا معترف بھی رہا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے عزیز ترین شاگرد اور جانشین تھے۔ ماہنامہ الندوہ لکھنؤ (اجرا: جولائی ۱۹۰۴ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] الہلال کلکتہ (اجرا: ۱۳/جولائی ۱۹۱۲ء) کے اسٹاف میں رہ چکے تھے۔ ادارت کا انہیں بڑا تجربہ اور سلیقہ تھا۔ چنانچہ معارف کو انہوں نے اس آب وتاب کے ساتھ نکالا کہ وہ خود آپ اپنی نظیر بن گیا۔ ۱۰۷/برس یعنی ایک صدی سے زاید مدت گذر جانے کے باوجود معارف کی کوئی دوسری مثال نہیں پیش کی جاسکی ہے۔

ماہنامہ معارف ایک علمی وتحقیقی رسالہ ہے۔ اس کا آغاز شذرات (اداریہ) سے ہوتا ہے اور پھر سر مقالہ اپنے موضوع پر انتہائی تحقیقی مقالے کو بنایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اخبار علمیہ، آثار علمیہ وتاریخیہ، باب التقریظ والانتقاد، معارف کی ڈاک اور مطبوعات جدیدہ جیسے اہم کالم ہوتے ہیں جو اپنی انفرادی اہمیت اور انتہائی معلومات افزا ہونے کے سبب بے حد مقبول ہیں۔

معارف دراصل ہماری تاریخ کا وثیقہ بلکہ ایک اہم بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے ہندوستان کی علمی، ادبی، دینی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے تمام احوال مل جائیں گے۔ اس لحاظ سے بھی اس کا کوئی جواب نہیں۔

ہندوستان بالخصوص مسلمانان ہندوستان بیسویں صدی میں کن کن نشیب وفراز سے

گذرے۔زبوں حالی اور تنگ دامانی کے کن کن مراحل اور مسائل کا سامنا کیا اور ان پر کیا گذری، اس کی تمام تفصیل ماہنامہ معارف کے صفحات میں محفوظ ہے۔اسی طرح ہماری علمی وادبی تاریخ کے تمام اہم پہلو تسلسل کے ساتھ معارف کے صفحات میں محفوظ ہیں۔بیسویں صدی میں لکھی جانے والی سیکڑوں ہزاروں کتابوں کی تفصیلات معارف کے صفحات کی زینت ہیں۔یہ تمام تاریخی تفصیلات، دیگر رسائل میں بھی جستہ جستہ مل سکتی ہیں تاہم ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں سے جو نئے علمی، ادبی، دینی رسائل اور اخبارات نکلے اور پھر ناقدری کی نذر ہو گئے، ان کا ذکر بھی معارف کے صفحات میں ملتا ہے، گویا صحافت کی بیسویں صدی کی تاریخ کے لئے معارف کے علاوہ کہیں اور شاید ہی اس قدر مواد اور معلومات مل سکے۔

غرض مختلف حیثیتوں سے ماہنامہ معارف ایک بے نظیر علمی وادبی رسالہ ہے۔اس کے بانی مدیر مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی [۱۹۰۳-۱۹۷۴ء] مدیر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] نے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی [۱۹۰۷-۱۹۷۹ء] کے ساتھ اسے جاری رکھا اور اس کے معیار و وقار پر حرف نہیں آنے دیا۔۱۸؍نومبر ۱۹۸۷ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو یہ ذمہ داری مولانا ضیاء الدین اصلاحی [۱۹۳۷ - ۲۰۰۸ء] کو تفویض کی گئی، وہ بھی اپنے حادثہ وفات (۲؍فروری ۲۰۰۸ء) تک بزرگوں کی اس علمی یادگار کو توانائی بخشتے رہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی پرآشوب دور میں معارف کے اس کے بلند معیار اور علمی وقار کے ساتھ باقی رکھا۔ان کے بعد گذشتہ ۱۴؍برس سے اس کی ادارت کے فرائض پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب سابق ڈائرکٹر دارالمصنّفین اور مولانا حافظ عمیر الصدیق ندوی رفیق دارالمصنّفین انجام دے رہے تھے۔اب یہ فریضہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ڈائرکٹر دارالمصنّفین اور حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی انجام دے رہے ہیں۔

ماہنامہ العلم چریا کوٹ

ماہنامہ معارف کے ساتھ ہی خطہ مشرق کے یونان وشیراز یعنی چریا کوٹ سے ماہنامہ العلم

جاری ہوا۔ ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۱۶ء میں اور ماہنامہ العلم چریا کوٹ سے اگست ۱۹۱۶ء میں نکلا۔ معارف ایک صدی بعد بھی جاری ہے اور ماہنامہ العلم غالباً ایک دوشماروں کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے مدیر ''جواہر سخن'' کے مؤلف مولانا ابوالمعالی محمد مبین عباسی کیفی چریا کوٹی [م: ۴ر اکتوبر ۱۹۵۶ء] تھے۔ العلم اگست ۱۹۱۶ء کے سرورق سے اس کے موسس کے عزائم اوران کی حوصلہ مندیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھا ہے کہ

اردو، فارسی، عربی، عبرانی، برج بھاشا کا ماہانہ رسالہ
ادب، معانی و بیان، تمدن، اخلاق، تاریخ، تفسیر، فقہ، کلام، فلسفہ، تصوف، ریاضیات وہیئات اورنجوم کا دلچسپ مجموعہ (۱۰)

پہلے شمارہ کی جو فہرست ہے اس سے بھی اس کے تنوع اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس العلم شعلہ مستعجل ثابت ہوا۔

سہیل اعظم گڑھ

۱۹۳۲ء میں شہر اعظم گڑھ سے ایک ہفتہ وار اخبار سہیل جاری ہوا اور کئی برس تک بڑی شان سے نکلتا رہا۔ اس میں علاقائی اور ملکی خبروں کے ساتھ علمی وادبی مضامین ومقالات بھی شائع ہوتے تھے۔ اعظم گڑھ کے شعراء کا کلام بالخصوص تلمیذ شبلی علامہ اقبال سہیل [۱۸۸۴ - ۱۹۵۵ء] اور مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی تھیں، جس کی وجہ سے یہ اخبار کافی مقبول ہوا۔ اس کے مالک اور مدیر محمد سلیم صاحب مرحوم تھے، تاہم پس پردہ اصل مدیر مشہور اہل قلم اور مصنف مولوی عبدالباری ابوعلی اثری [۱۹۰۳-۱۹۹۳ء] تھے۔ وہی اس کے اداریے لکھتے، خبریں اور تبصرے لکھتے، بلکہ ادارت اور نامہ نگاری کے تمام فرائض وہی انجام دیتے۔

سہیل کے چند سیاسی تبصرے بہت مقبول ہوئے، مولوی ابوعلی اثری اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد کے زبردست شیدائی تھے تاہم ان کے دوقومی نظریہ سے اتفاق نہیں رکھتے تھے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ کے بڑے حامی تھے اور اس کی حمایت میں بڑے بڑے معرکہ آرا مضامین لکھے ان کے اس نقطہ نظر کا اظہار ہفتہ وار اخبار سہیل میں شائع ان کے بعض مضامین سے بخوبی ہوتا ہے۔

اخبار سہیل کی فائلیں اب دستیاب نہیں، محض ایک نامکمل اور کرم خوردہ فائل مولوی ابوعلی اثری کے پاس محفوظ تھی جواب ان کے صاحبزادے جناب ارشد علی انصاری کی تحویل میں ہے۔

اخبار سہیل کے مالک محمد سلیم صاحب نے جو مجاہد آزادی شاہ افضال اللہ قادری کے والد تھے، انہوں نے ملت پریس قائم کیا تھا۔ اخبار سہیل اسی میں طبع ہوتا تھا۔ یہ پریس مجاہد آزادی شاہ افضال اللہ قادری کو ورثہ میں ملا تھا، مگر اسے انہوں نے جدوجہد آزادی کی نذر کر دیا اور قائم نہ رکھ سکے۔ دراصل جدوجہد آزادی میں اس پریس کا بھی حصہ ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف متعدد مواقع پر اس سے پمفلٹ شائع ہوئے جس کی پاداش میں اس پر پابندی عائد ہوئی۔

ہفتہ وار ملک اعظم گڑھ

۱۹۳۲ء میں ''ملک'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جناب محمد نقی قریشی نے جاری کیا تھا۔ نقی قریشی صاحب بزرگ صحافی اور ملک میں انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔ یہ اخبار انہوں نے انگریزی حکومت کی تائید وحمایت کے لئے جاری کیا تھا، اس لئے حکومت کے رویے کی تعریف و تحسین اور کانگریس پر سخت تنقیدیں کرتے، خبریں اور مضامین بھی اپنے مذاق کے مطابق شائع کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کے ۲/ جون ۱۹۳۲ء کے شمارہ کا تعارف ماہنامہ معارف میں کرایا، اور لکھا ہے کہ

> ''ملک کی موجودہ سیاسیات میں اس کی روش حکومت کی تائید اور کانگریس پر سب وشتم ہے۔ حکومت کی تائید میں ضلع کے مختلف مقامات پر جو جلسے ہوئے ہیں ان کی مفصل روداد شائع کی جاتی ہے۔ نیز مقامی بورڈوں کے معاملات میں بھی حصہ لیتا ہے۔ ہفتہ وار خبریں اپنے مذاق کی شائع کی جاتی ہیں۔'' (۱۱)

اس کا دفتر شہر میں کچہری روڈ پر واقع تھا، مگر اب اس کا کچھ نام ونشان باقی نہیں رہا۔ اس کی اب کوئی فائل یا شمارہ بھی دستیاب نہیں اور نہ کسی اور ذرائع سے اس سے زیادہ معلومات دستیاب ہو سکیں کہ اس کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا اور یہ اخبار کب تک جاری رہا۔ یا اسی طرح یہ معلوم نہیں کہ محمد نقی قریشی کون شخص تھے؟ کاش اس کی کوئی فائل دستیاب ہو جاتی تو اس وقت کے اعظم گڑھ کو

سمجھنے میں مدد ملتی۔ اعظم گڑھ کی تاریخ میں اب تک ہم لوگوں نے مجاہد آزادی کے قصے پڑھے ہیں، ان کے حالات ملتے تو ایک ایسے کا فرادا کے حالات بھی پڑھنے کو ملتے جس کو قوم وملت کی کوئی پروا نہیں تھی اور جو ملت کے بجائے انگریزوں کا وفادار رہا۔

ماہنامہ الاصلاح سرائے میر

جنوری ۱۹۳۶ء میں دائرہ حمیدیہ قصبہ سرائے میر سے علامہ حمید الدین فراہی [۱۸۶۴ - ۱۹۳۰ء] کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی [۱۹۰۴ - ۱۹۹۷ء] کی ادارت میں ماہنامہ الاصلاح جاری ہوا۔ اس رسالہ کا بنیادی مقصد فکر فراہی کی ترویج واشاعت کے ساتھ علامہ حمید الدین فراہیؒ کے غیر مطبوعہ مسودات کی طبع واشاعت تھا۔ بلاشبہ یہ اپنے معیار و مذاق کے لحاظ سے ایک منفرد رسالہ تھا۔ محض چار برس شائع ہوا، مگر اس نے دیرپا اثرات مرتب کئے۔ قرآن، حدیث، تفسیر اور زبان وادب پر عمدہ مضامین اور علمی وتحقیقی مقالات شائع ہوئے۔ علامہ شبلی کی سوانح ''سیرت شبلی'' اولاً اسی کے صفحات میں بالاقساط علامہ اقبال احمد خاں سہیل کے قلم سے چھپی۔

بعض نئے اہل قلم نے اس کے صفحات پر قلم پکڑنا سیکھا اور مضامین لکھے۔ اس کی تمام تفصیلات مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اپنے کتابچہ ''الاصلاح۔ ایک تعارف'' میں قلم بند کی ہیں، اس کی تفصیلات سے اور باتوں کے سوا ان کے اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتابچہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے شائع کیا ہے اور دستیاب ہے۔

ماہنامہ سرشار اعظم گڑھ

۱۹۳۶ء ہی میں ایک اور رسالہ ماہنامہ ''سرشار'' ممتاز شاعر رشید ذکی مچھلی شہری کی ادارت میں نکلا۔ ۵۶ رصفحات کے اس رسالہ کی سالانہ قیمت تین آنہ تھی۔ یہ ایک ادبی رسالہ تھا، بلکہ ضلع اعظم گڑھ کی ادبی تاریخ میں یہ پہلا ادبی رسالہ تھا جو باقاعدہ نکلا۔ بڑے اہتمام سے نظمیں، غزلیں اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے۔ مزید تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۶ء کے کس ماہ میں پہلا شمارہ شائع ہوا اور کب تک شائع ہوتا رہا۔ کون لوگ اس کی مجلس ادارت ومشاورت اور مالکان

میں تھے وغیرہ۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ماہنامہ معارف میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''اعظم گڑھ کی مردم خیز سرزمین اخبارات ورسائل کے لحاظ سے شودر واقع ہوئی تھی لیکن ادھر دوایک برسوں سے اس کا مذاق پیدا ہو چلا ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ دو سال سے ایک ہفتہ وار اخبار سہیل کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، حال میں اس کے کارکنوں کے اہتمام میں ایک ماہنامہ رسالہ سرشار نکلا ہے جو ادبی رسائل کی طرح اپنے اندر عام دلچسپی کا کافی سامان رکھتا ہے ہم کو امید ہے کہ وہ مشرقی اضلاع میں مقبول ہوگا۔'' (۱۲)

تذکرہ، مئو

قصبہ مئو جو اب ضلع بن چکا ہے ابھی کل تک اعظم گڑھ کا ایک قصبہ تھا، یہاں سے ۱۹۳۱ء میں تذکرہ کے نام سے ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی محدث [۱۹۰۱-؟؟؟] نے ایک دینی رسالہ جاری کیا جس میں قرآن، حدیث، تفسیر کے متعلق مضامین شائع ہوتے۔ ۳۲ رصفحات کے اس رسالہ میں غزلیں اور نظمیں بھی شائع ہوتیں، علمی خبریں بھی درج کی جاتیں۔ (۱۳) یہ ایک عمدہ رسالہ تھا مگر چند ایک شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی محدث جلیل اس کے مدیر تھے۔ ان کے عہد شباب کی امنگوں کا یہ نمونہ تھا۔ افسوس کی اس کا کوئی شمارہ دستیاب نہ ہوسکا۔

اعظم گڑھ کی اردو صحافت پر غالباً یہ پہلا مقالہ ہے۔ نقش اول میں جو کمیاں ہوتی ہیں وہ اس میں بھی محسوس ہوں گی، مگر ناچیز نے اس کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ یقین ہے آئندہ اس میں قیمتی اضافہ ہوگا۔

حوالے:

(۱) امداد صابری، تاریخ صحافت حصہ سوم۔ ص ۴۳۰

(۲) مطبوعہ: اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء

(۳) ہندوستانی پریس ص
(۴) امیر حسن نورانی، علمی اجالے ص۱۰۲
(۵) ہندوستانی پریس ص۳۱
(۶) تاریخ اعظم گڑھ ص115
(۷) تاریخ صحافت حصہ سوم ص۵۰۳
(۸) فہرست اخبارات ہند ص۶۸
(۹) تاریخ صحافت حصہ سوم ص۴۸۰
(۱۰) سرورق ماہنامہ العلم چریا کوٹ۔ اگست ۱۹۱۶ء
(۱۱) ماہنامہ معارف ستمبر ۱۹۳۲ء ص۶۹
(۱۲) معارف اکتوبر ۱۹۳۶ء۔ ۳۰۹-۳۱۰
(۱۳) ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۳۱ء۔ ص۶۸

◆◆◆

معارف کی ادبی خدمات

علامہ شبلی کے پیش نظر جو علمی وادبی منصوبے تھے ان میں ایک رسالہ ماہنامہ ''معارف'' کا اجرا بھی تھا۔اس کا وہ ایک خاکہ بھی تیار کر چکے تھے، مگر زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اسے شائع نہ کر سکے۔ان کی وفات کے تقریباً دوسال بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف جاری کیا۔اس وقت سے لے کر اب تک ماہنامہ ''معارف'' مسلسل شائع ہو رہا ہے۔۱۸۱ جلدوں اور ۱۱۰۳ شماروں پر مشتمل رسالہ ''معارف'' کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم وادب اور ارباب کمال نے اس کی علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی اہمیت کا ہر دور میں اعتراف کیا۔علامہ اقبال نے لکھا کہ ''یہی تو ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔'' مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ ''یہی تو ایک پرچہ ہے باقی ہر طرف سناٹا ہے۔''

علامہ شبلی نے ''معارف'' کے متعدد مقاصد میں ایک بنیادی مقصد شعر وادب اور تحقیق و تنقید کی خدمت قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس کے آغاز ہی سے اس کے مدیروں نے ادبی وتنقیدی نگارشات کو اہمیت دی۔خوش قسمتی سے اس کے تمام مدیر اہل ذوق اور شعر وادب کے نکتہ شناس تھے اس لیے دوسرے علوم وافکار کے ساتھ شعر وادب کو فوقیت دیتے رہے۔تقریباً ایک صدی پر محیط ''معارف'' کی خدمات کو اگر موضوع کے لحاظ سے مرتب کیا جائے تو ادب کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر پچاسوں کتابیں معرض وجود میں آسکتی ہیں اور ان کی حیثیت کسی درجہ کم نہ ہوگی۔

۱۹۱۶ء سے اب تک معارف کے صفحات میں اردو کے مشاہیر شعرا کی اہم شعری تخلیقات نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات وغیرہ شائع ہو کر نہ صرف ان کی شہرت وعظمت میں اضافے کا

باعث بنیں بلکہ اہل ذوق کو شاد کام بھی کیا۔ معارف کے شعرا میں علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی، اقبال سہیل، عبدالسلام ندوی شمیم، مرزا احسان احمد، سجادانصاری، جگر، اصغر، فانی، فراق، حسرت، یحییٰ اعظمی، نشورواحدی، روش صدیقی، چندر پرکاش جوہر بجنوری اور جگن ناتھ آزادوغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کی مشہور نظم ''بھارت کے مسلماں'' کے جواب میں اسد ملتانی نے جومعرکۃ الآرانظم بہ طورشکریہ لکھی تھی وہ ''معارف'' ہی کے ذریعہ منصۂ شہود پرآئی تھی۔

شعری ادب کے مقابلے میں ''معارف'' نے نثری ادب کی زیادہ خدمت انجام دی۔ اردو کے نامورترین ادیبوں اورنقادوں کی تحریروں کا ایک بڑا سرمایہ ''معارف'' کے صفحات میں محفوظ ہے۔ حالی وشبلی، ڈپٹی نذیراحمد اورمنشی ذکاءاللہ کے علاوہ سیدسلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالماجددریابادی، مہدی افادی، سیدعبداللہ، نصیرالدین ہاشمی، شاہ معین الدین ندوی، سیدصباح الدین عبدالرحمٰن، اثرلکھنوی، ابواللیث صدیقی اورمتعدددوسرے اہل قلم کی ادبی وتنقیدی کاوشوں کی اشاعت کا سہرا بھی ''معارف'' کے سر ہے۔ اسی طرح تحقیق وتنقید کے میدان میں اردو کے نامورمحققین مثلاً قاضی عبدالودوداورامتیازعلی عرشی وغیرہ نے ''معارف'' کے صفحات میں دادتحقیق دی، جس سے نہ صرف ان کی عظمت کا اعتراف ہوا بلکہ اردو کے تحقیقی ادب میں بھی گراں بہا اضافہ بھی ہوا۔

لسانیات کواب ایک مستقل اوراہم موضوع کی حیثیت حاصل ہے لیکن تقریباً ایک صدی قبل اسے وہ حیثیت حاصل نہیں تھی جوآج ہے۔ اس لحاظ سے ''معارف'' اورمعارف کے اہل قلم انتہائی قابل ستایش ہیں کہ ایک صدی قبل لسانیات کے مختلف گوشوں مثلاً رسم خط کی اجمالی تاریخ، ہندوستان کی مختلف زبانیں، اردواملا، یوروپی الفاظ واعلام کا اردواملا، لسانی مسائل، پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، سرگزشت الفاظ وغیرہ موضوعات پرگراں قدرمقالے ''معارف'' میں شائع ہوئے، جن کی بدولت لسانیات کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ وتحقیق کا آغاز ہوا۔ ان تحریروں کو اگریکجا کردیا جائے تو نہ صرف لسانیات میں معتدبہ اضافہ ہوگا بلکہ بعض نئی بحثوں کوازسرنوسمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

اردو کی ہمہ گیری کے ذکر کے ساتھ دیگرزبانوں کے اثرات مثلاً اردو پر پنجابی، سندھی،

افغانی، پرتگالی، ترکی وغیرہ کے اثرات کی نشاندہی پر مشتمل مضامین ومقالات بھی معارف میں شائع ہوئے اور جن کو ''معارف'' کے علاوہ دوسرے معاصر ادبی رسائل میں ''معارف'' کے بعد جگہ ملی۔ اس نوعیت سے بھی معارف نے اردو کی بڑی خدمت انجام دی۔

موضوع کے لحاظ سے اردو کے خزانے کا سرمایۂ ناز غالبیات واقبالیات خیال کیے جاتے ہیں۔ ''معارف'' کے صفحات میں غالب، اقبال اور ابوالکلام آزاد کے فکروفن اور ان کے لازوال کارناموں کے جائزے پر مشتمل ایک بڑا ادبی ذخیرہ محفوظ ہے، جس میں غالب واقبال شناسی کے لیے اس سرمایہ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

تذکرہ نگاری اور اردو شعرا کے قدیم تذکروں کی افادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ معارف میں نہ صرف متعدد شعرا کے تذکرے شائع ہوئے بلکہ قدیم تذکروں کی اہمیت اور افادیت پر تنقیدی مضامین بھی لکھے گئے، جس سے نہ صرف اردو کی وسعت وہمہ گیری میں اضافہ ہوا بلکہ تنقید، متنی تحقیق اور اسلوبیاتی مطالعے کو پرواز ملی۔ چونکہ ''معارف'' کی اشاعت کی مدت طویل ہے اس لیے یہ خدمت بھی ''معارف'' نے معاصر ادبی رسائل کے مقابلے میں زیادہ انجام دی۔

اردو کے پچاسوں شعرا کے حالات اور فکروفن کے علاوہ وفیات کے ضمن میں سیکڑوں ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققوں کی وفات پر ماتمی تحریروں میں ان کی شخصیت اور فکروفن کو بھی اجاگر کیا گیا۔

''معارف'' کا ایک کالم آثار علمیہ ہے۔ اس کے تحت اب تک اردو ادب کے اساطین کے نایاب خطوط اور نادر تحریروں کو شائع کر کے ''معارف'' نے ایک ایسا ادبی خزانہ اپنے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اجرا سے لے کر اب تک ''معارف'' نے مختلف نشیب وفراز اور حالات کے سرد وگرم دور دیکھے۔ اردو زبان وادب کے میدان میں افکار ونظریات کی یورش دیکھی۔ اردو کے لیے مختلف تحریکیں برپا ہوتی دیکھیں۔ مختلف تنظیمیں اور ادارے قائم ہوئے۔ متعدد افراد نے نجی اور ذاتی طور پر خدمت اردو کا بیڑا اٹھایا۔ ان تمام کوششوں اور کاوشوں کی آواز بازگشت ''معارف'' کے شذرات میں محفوظ ہے۔ دراصل ''معارف'' ہماری ادبی تاریخ کا ایک بنیادی ماخذ ہے۔ اس سے استفادہ

کے بغیر یقیناً ہماری ادبی تاریخ نامکمل تصور کی جائے گی۔

بیسویں صدی میں اردو کے سیکڑوں اخبارات اور رسائل و جرائد نکلے جو اپنے اپنے خطوں، علاقوں اور حلقوں میں مقبول رہے۔ ان کا ذکر بھی ''معارف'' کے صفحات میں محفوظ ہے۔ ''معارف'' سے ان کی سنہ وار فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ تقریباً ایک ہزار اخبارات و رسائل کے نام، ان کے مدیروں کے نام، سنہ اشاعت اور مقام اشاعت وغیرہ کی تفصیلات ''معارف'' کے اوراق میں ثبت ہیں۔ یہ خود بجائے ایک بڑی ادبی خدمت ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے درست لکھا ہے کہ

> ''آئندہ مورخ کا قلم جب ہندوستان کی علمی و دینی صحافت کی تاریخ لکھے گا تو اسے ''معارف'' کو چارو ناچار ایک بلند وممتاز مرتبہ اور ایک سنگ میل کا امتیاز دینا ہوگا اور بتانا ہوگا کہ اس شمع نے کتنے اندھیرے گھروں میں اجالا پھیلایا اور پھر اس ایک چراغ سے کتنے چراغ اور جلائے گئے۔''

ماہنامہ معارف میں روز اول ہی سے مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ کی اشاعت کا اہتمام رہا۔ اب تک پانچ ہزار سے زیادہ علمی، ادبی، تنقیدی اور تاریخی کتابوں پر نقد و تبصرہ لکھا جا چکا ہے۔ تبصراتی مضامین کے لئے باب التقریظ والانتقاد میں بے شمار طویل تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ ہماری ادبی تاریخ میں اس قدر وسیع ذخیرۂ ادب کسی اور رسالے کے صفحات میں شاید ہی موجود ہو۔

ماہنامہ معارف کا ایک ادبی امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے ایک خاص ادبی اسلوب و انداز تحریر اختیار کیا جس پر وہ اب تک قائم ہے۔ سیکڑوں اہل علم کی تحریریں معارف میں شائع ہوئیں، لیکن حسن انشا کی دل آویزی اور ادب و تحقیق کی رعنائی کا جوہر ہمیشہ قائم رہا۔ حتیٰ کہ غیر ادبی موضوعات میں بھی اس دل کشی کا خیال رکھا گیا۔ غرض اردو ادب کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس پر معارف کے اہل قلم نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ بلاشبہ ''معارف'' تاریخ ادب اردو میں ایک سنگ میل ہے، جس کی عظمت کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہے گا۔○

•••

اسلامیات کے چند اہم
اردو رسائل و جرائد کے اشاریے

ہندوپاک میں علم وتحقیق کی ترقی اورعلوم اسلامی کی ترویج واشاعت میں اردو رسائل و جرائد کا بہت اہم کردار ہے۔ان رسائل نے مختلف موضوعات پر اپنے اپنے دائرہ اثر میں بحث و تجزیہ اورتحقیق وتدقیق کی ایک دنیا آباد کی۔جس سے نہ صرف علم وتحقیق کے میدان میں گراں قدر اضافہ ہوا بلکہ اہل قلم اور مصنّفین کی ایسی جماعتیں وجود میں آئیں جنھوں نے اپنی تصنیفات و تالیفات اورتحقیقات سےقوم وملت کی فکری تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔

اردو رسائل وجرائد کی ایک طویل اور روشن تاریخ ہے،لیکن گردش زمانہ نے ان کے روشن نقوش بھی دھندلا دئے۔حالانکہ ضرورت ہے کہ ان کی تاریخ مرتب کی جائے اوران کی متنوع اور گونا گوں خدمات اوراثرات کا جائزہ لیاجائے۔اس سلسلہ میں گو متعدد کوششیں ہوچکی ہیں،تاہم بحیثیت مجموعی یہ ایک انتہائی اہم کام ہے جواب تک خاطرخواہ طور پرنہیں ہوسکا ہے۔ابھی برادران وطن کو یہ بتانا باقی ہے کہ ہندوستان کا پہلاصحافی جس نے وطن پر جان نچھاور کی وہ اردو کے صحافی مولوی باقرحسین تھے۔جن کے صاحبزادے ''آب حیات''اور''سخندان پارس'' کے مصنف مولوی محمدحسین آزاد تھے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اشاریہ سازی کی طرف کسی قدرتوجہ دی گئی اوراس کا آغاز ہوااور چندرسائل وجرائد کے اشاریےمرتب ہوئے۔اس سےان رسائل سےاستفادے کی راہ ہموار ہوئی۔

اشاریہ سازی میں اگرچہ دنیا کی بعض ترقی یافتہ قوموں اورزبانوں نے بڑی ترقی کی ہے، تاہم اس کی ایجاد کا سہرااورفخر مسلمانوں کوحاصل ہے۔فہرست ابن الندیم اور کشف الظنون وغیرہ کو ہم ابتدائی نقوش کے طور پر پیش کرسکتے ہیں۔چونکہ مسلمانوں نے دوسرے علوم کی طرح اشاریہ سازی سے بھی کسی قدر بے اعتنائی برتی ،اس لئے یورپ اس میدان میں بھی اولیت کا دعویٰ کر بیٹھا۔حالانکہ یہ سرے سے واقعیت اور صداقت کے خلاف ہے۔

جہاں تک اردوزبان کاتعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں اشاریہ سازی کی تاریخ بہت مختصر ہے۔سب سے پہلا مطبوعہ اشاریہ اورینٹل کالج میگزین لاہور کا ہے۔ جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔البتہ گذشتہ ۳۵ ربرسوں میں اس کی طرف ضروری توجہ دی گئی ہے۔ چند شخصی کتابیات بعض موضوعاتی اورسو کے قریب رسائل کے اشاریے مرتب کئے گئے۔البتہ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے اشاریوں کی ہے جو طبع واشاعت کی منزل سے نہ گذرسکے۔۸۰ر کے عشرے میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے تین درجن سے زیادہ شخصی اور موضوعاتی کتابیات شائع کیں انفرادی طور پر بھی اس کی طرف توجہ دی گئی۔شخصی اور موضوعاتی کتابیات کے بالمقابل رسائل وجراید کے اشاریوں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔اورینٹل کالج لاہوراور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے متعدد رسائل کے اشاریے ایم اے اورایم فل کے مقالے کے طور پر تیار کرائے۔لیکن ان میں سے بیشتر اب تک شائع نہیں ہو سکے ہیں۔

اس سلسلہ میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اوراس کے پہلے ڈائرکٹر محترم ڈاکٹر عابدرضا بیدار کی خدمات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔انہوں نے ملک کے متعدد موقر اور قدیم علمی وادبی رسائل وجرائد کے اشاریے مرتب کرائے اورانہیں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ حتیٰ کہ رسائل کی پوری پوری فائلیں یکجا چھاپ دیں۔ان یہ کام شاریہ سازی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو میں اشاریہ سازی کی اس مختصر تاریخ کے بعد اب ہم چند اہم مطبوعہ علمی اور تحقیقی رسائل وجراید کے اشاریوں کا اجمالی مطالعہ وجائزہ پیش کیا جاتا ہے تا کہ ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے ساتھ اس فن کی ارتقائی تاریخ کا بھی اندازہ ہوسکے۔

مندرجات تہذیب الاخلاق

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

صفحات: ۴۶، سنہ اشاعت: ۱۹۸۷ء، ملنے کا پتہ: مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

ماہ نامہ تہذیب الاخلاق کا اجرا سرسید مرحوم [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کا ایک بڑا اہم کارنامہ ہے۔ اسے انہوں نے ۱۸۶۶ء میں مسلمانوں کی اصلاح وترقی کے لیے جاری کیا تھا۔ بلاشبہ اس رسالے نے یہ مفید خدمت برسوں انجام دی۔ اس کے ساتھ اس نے مسلمانوں کے تہذیبی وتمدنی جلوؤں کو پیش کرنے اور ان پر جو گرد اڑائی جارہی تھی اسے صاف کرنے کی بھی کوشش کی۔ اردو زبان وادب کی ترقی اور اس کے فروغ واشاعت میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی تاریخ بالخصوص اس کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور دکھایا جائے کہ سرسید مرحوم کی یہ کوشش کس قدر بارآور ثابت ہوئی۔

اس کا اشاریہ ''مندرجات تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاریؒ نے مرتب کیا ہے۔ جو آغاز ۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۰ء تک کی اشاعتوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب عنوانات اور مصنّفین کی الف بائی ترتیب پر ہے۔ جابہ جا وضاحتی نوٹس بھی فاضل مرتب نے لکھ کر اس سے استفادہ کو مزید آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ البتہ موضوعات کے لحاظ سے بھی اس کے مندرجات کی تفصیل ہونی چاہئے تھی۔ اس سے گو ضخامت بہت بڑھ جاتی، لیکن استفادہ مزید آسان ہوجاتا۔ اس طرح اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ممتاز اہل قلم، دانش ور اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ علی گڑھ تحریک پر ان کی گہری نظر ہے۔ اشاریہ سازی میں ان کو بڑی مہارت حاصل ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس میدان کے سرخیل ہیں۔ متعدد شخصیات مثلاً علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور آل احمد سرور وغیرہ پر ان کے اشاریے کچھ رسائل میں اور کچھ کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت ثانی کا اشاریہ بھی تیار کر دیتے۔

افسوس ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری صاحب نے مضمون کی اشاعت کے فوراً وفات پائی اور میری یہ آواز وہ نہ سن سکے۔ مجھ سے وہ جس قدر محبت کرتے تھے، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ سن پاتے اوران کے قویٰ ساتھ دیتے تو وہ ضرور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔

رحمه الله رحمة واسعه

اشاریہ معارف

جناب سہیل شفیق صاحب

صفحات:۵۴۲، قیمت:۵۵۰روپئے، سنہ اشاعت: اپریل ۲۰۰۵ء

ملنے کا پتہ: قرطاس۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳۔ کراچی یونیورسٹی، کراچی

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اردو کا سب سے اہم اور معیاری علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔ اسے علامہ شبلی کی خواہش کے مطابق جولائی ۱۹۱۶ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے جاری کیا۔ تقریباً ایک صدی سے یہ مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس کی ایک طویل اور شاندار تاریخ ہے۔ جس پر متعدد اہل قلم نے روشنی ڈالی ہے۔ تاہم اب بھی تفصیلی جائزے کی ضرورت باقی ہے۔

علم وفن کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر معارف میں اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ اس حیثیت سے وہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام سے کم نہیں۔ علامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ''اس سے حرارت ایمانی میں تازگی پیدا ہوتی ہے''۔

معارف کی افادیت کے پیش نظر ضرورت تھی کہ اس کا اشاریہ مرتب کیا جائے، تاکہ اس کے صفحات میں محفوظ سرمایۂ علم وفن سے بہ آسانی استفادہ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں اب تک کئی کوششیں ہو چکی ہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اس کی طرف توجہ دی اور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۷۰ء تک اشاریہ مرتب کر کے شائع کیا۔ اس اشاریہ کی ترتیب موضوعاتی ہے۔ معارف کے بعض مستقل کالم مثلاً وفیات وغیرہ کو بھی موضوع میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کے نمبر شمار کی بنیاد پر اشاریۂ مصنّفین درج کیا گیا ہے۔ آخر میں اشاریے کا بھی ایک اشاریہ ہے۔

اس اشاریہ میں گو بعض اہم شذرات معارف کا ذکر مختلف موضوعات کے ضمن میں کیا گیا

ہے۔تاہم مجموعی اعتبار سے شذرات کا اشاریہ نہیں بنایا گیا ہے۔اسی طرح ماہنامہ معارف کے بعض دوسرے مستقبل عنوانات مثلاً مطبوعات جدیدہ وغیرہ کا بھی علاحدہ اشاریہ مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ آثار علمیہ وادبیہ وتاریخیہ اور تلخیص وتبصرہ کا بھی ضمنی طور پر ذکر ہے۔حوالے کے طور پر محض جلد اور شمارے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ماہ وسال اور صفحات نمبر کی سرے سے نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کا دوسرا اشاریہ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق استاذ شعبۂ تاریخ اسلام کراچی یونیورسٹی نے مرتب کیا ہے۔اس میں ۱۹۱۶ء سے ۲۰۰۵ء تک کے مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس کی ترتیب اس طور پر کی گئی ہے کہ پہلے جولائی ۱۹۱۶ء سے جون ۲۰۰۵ء تک کے مقالات کے عنوانات اور مقالہ نگاروں کے نام زمانی ترتیب کے مطابق جلد،شمارہ اور ماہ وسال کی تعیین کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔پھر موضوعات کے لحاظ سے ان کا اندراج ہے۔اس کے بعد اشاریۂ مصنّفین ہے۔مطبوعات جدیدہ کی مکمل فہرست بھی زمانی ترتیب کے لحاظ سے دی گئی ہے۔اس کی ایک فہرست عنوانات کے لحاظ سے بھی مرتب کی گئی ہے۔وفیات کا علاحدہ اشاریہ ہے، جو الف بائی ترتیب پر ہے۔آخر میں معارف میں سنین کے غلط اندراج کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

یہ اشاریہ گذشتہ اشاریہ کے مقابلے میں زیادہ مربوط اور زیادہ مفید ہے۔البتہ جدید اصول اشاریہ سازی کے لحاظ سے اس میں بھی بعض کمیاں راہ پاگئی ہیں۔اس میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے معارف کی فہرست دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔اس لیے کہ کسی مقالے کی تلاش میں تمام اشاریہ پلٹ کر دیکھنا ہوگا۔تبصرہ کتب میں بھی تقریباً وہی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔عنوانات کے ساتھ مصنّفین اور مبصرین کے لحاظ سے بھی اشاریہ ہوتا تو بہتر اور زیادہ مفید ہوتا۔ایک بڑی کمی یہ رہ گئی ہے کہ تلخیص وتبصرہ،تقریظ وانتقاد،آثار علمیہ وادبیہ وتاریخیہ،استفسار وجواب،معارف کی ڈاک اور ادبیات وغیرہ کا سرے سے ذکر نہیں آسکا ہے۔محض جلد اور شمارہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ماہ وسال اور صفحات نمبر کی نشان دہی بھی نہیں کی گئی ہے۔اندرجات میں بھی تسامح ہوا ہے۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود یہ ایک شخص کی مفید کاوش ہے۔اس کے لئے ارباب علم و ادب کے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔امید ہے اس سے استفادہ کرکے ماہنامہ معارف اور اس کے مشمولات کے مطالعہ کا آغاز ہوگا۔

ماہنامہ معارف کا تیسرا اشاریہ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی استاذ شعبہ عربی ممبئ یونیورسٹی ممبئ نے مرتب کیا ہے۔ جون ۲۰۰۰ء تک کا ہے۔ یہ گذشتہ دونوں اشاریوں سے زیادہ جامع اور مبسوط ہے۔ (ضخامت ۱۳۰۰ صفحات سے زاید ہے۔) اس میں سوائے شذرات کے معارف کے تمام مندرجات بشمول ادبیات، مکاتیب اور مطبوعات جدیدہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسے موضوعات، مضمون نگاران اور عناوین تینوں اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ تینوں کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے۔ یہ اشاریہ ابھی منتظر اشاعت ہے۔ البتہ اس کا ایک حصہ جو معارف کے ابتدائی تین سال کے شماروں کے مندرجات پر مشتمل ہے، بطور نمونہ ماہنامہ معارف کے شمارہ اپریل مئی ۱۹۹۹ء میں ''ماہ نامہ معارف کے اشاریے'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اب اس اشاریہ معارف مرتبہ جمشید احمد ندوی کی پہلی جلد ۲۰۱۱ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کر دی ہے۔ جو عناوین کے لحاظ سے ہے اور جسے مرتب نے باعتبار مضامین قرار دیا ہے۔ اس کی ضخامت ۷۲۳ صفحات ہے۔ اس کی بقیہ جلدیں زیر ترتیب اور منتظر اشاعت ہیں۔ یہ اشاریہ سازی کے میدان میں ایک قیمتی اور گراں قدر اضافہ ہے۔ خدا کرے دوسری جلدیں بھی جلد شائع ہو جائیں۔ ورنہ اسے بھی ادھورا ہی قرار دیا جائے گا اور بزرگوں کی خواہش کی عدم تکمیل بھی۔

اشاریہ ماہنامہ برہان

ڈاکٹر شائستہ خاں

سنہ اشاعت ۱۹۹۵ء، تقسیم کار مکتبہ جامعہ دہلی

ماہ نامہ برہان دہلی کی حیثیت بھی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ اس کا آغاز جولائی ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ اس وقت سے گذشتہ سال تک وہ شائع ہوتا رہا۔ اس عرصہ میں اس نے علم و فن کے مختلف موضوعات پر بلند پایہ علمی و تحقیقی نگارشات شائع کیں۔ موضوعات اور مستقل عنوانات میں اس میں اور ماہ نامہ معارف میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اہمیت اور افادیت کے پیش نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے معارف کے بعد اس کا اشاریہ بھی جرنل (شمارہ ۱۰۳، ۱۹۹۶ء) میں شائع کیا۔ ۱۹۹۶ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

اس اشاریہ کی ترتیب بھی اشاریہ معارف کے طرز پر موضوعاتی ہے۔مختلف موضوعات کے تحت تمام مضامین ومقالات کودرج کیا گیا ہے۔پہلے عنوان پھر مقالہ نگار کا نام، پھر جلد نمبر اور شمارہ نمبر کا اندراج کیا گیا ہے۔ماہ وسال اور صفحات کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔آخر میں اشاریہ مصنّفین ہے۔جس میں مقالہ نگاروں کے نام الف بائی ترتیب پر درج کئے گئے ہیں اور نمبر شمار سے ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔جا بجا وضاحتی اور تشریحی نوٹس بھی لکھے گئے ہیں۔جس سے مطلوبہ مواد بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔اب ایک ہونہار نوجوان محمد شاہد حنیف نے جو اشاریہ سازی میں مہارت رکھتے ہیں اور متعدد رسائل کا اشاریہ تیار کر چکے ہیں۔اس کا مکمل اشاریہ مرتب کر دیا ہے، جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔

.اشاریہ جرنل خدا بخش لائبریری

مدیر: حبیب الرحمٰن چغانی

ملنے کا پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔۴

یہ علمی وتحقیقی اور حوالہ جاتی مجلّہ مشہور محقق قاضی عبدالودود کی کوششوں سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔اس وقت سے اب تک شائع ہو رہا ہے۔اس نے اردو کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

جرنل خدا بخش کے پہلے ایڈیٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب مقرر ہوئے۔اس کے بعد ڈاکٹر حبیب الرحمٰن چغانی اور ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے ادارت کے فرائض انجام دئے۔جرنل کے سو شماروں کا ایک اشاریہ جرنل ہی میں (شمارہ ۱۰۲، ۱۹۹۵ء) شائع ہوا ہے۔(اصلاً یہ اشاریہ ۹۵ شماروں کا ہے۔باقی ۵ شماروں کی محض فہرست دی گئی ہے۔)اس کی ترتیب بھی موضوعاتی ہے۔پہلے عنوان، پھر مقالہ نگار کا نام، پھر شمارہ نمبر درج کیا گیا ہے۔آخر میں اشاریۂ مصنّفین ہے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار سابق ڈائرکٹر خدا بخش اونیٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی کوششوں سے نہ صرف ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ برہان دہلی اور جرنل خدا بخش لائبریری وغیرہ کے اشاریے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔بلکہ متعدد دوسرے علمی وادبی رسائل کے بھی اشاریے ان کی

کوششوں اوران کی تحریک پر مرتب ہوئے اور جرنل میں شائع ہوئے۔اس لیے بجاطور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو اشاریہ نگاری کے ارتقا میں ان کا بڑا اہم حصہ ہے۔تاہم یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ یہ اشاریے رواروی میں تیار کئے گئے ہیں اوران میں اشاریہ سازی کے فنی اصولوں کو پورے طور پر ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

توضیحی اشاریہ ہفتہ وار سچ

مرتبہ ڈاکٹر عبدالعلیم قدوائی

صفحات ۵۷۸، قیمت ۱۶۰، سنہ اشاعت ۲۰۰۰ء۔ ملنے کا پتہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔۴

۱۹۲۵ء میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ہفتہ وار سچ جاری کیا اور ۱۹۳۳ء میں جب انہوں نے تفسیر قرآن کا منصوبہ بنایا تو اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سچ کو بند کر دیا۔اس قدر مختصر مدت کے باوجود سچ کا شمار اردو کے ان اہم رسائل میں ہوتا ہے، جنہوں نے ایک وسیع حلقے کو متاثر کیا۔ضرورت تھی کہ اس کا اشاریہ تیار کیا جائے۔چنانچہ مولانا مرحوم کے عزیز جناب عبدالعلیم قدوائی نے یہ کام انجام دیا ہے۔جسے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا ہے۔یہ محض موضوعاتی اشاریہ ہے۔اس میں عنوانات اور مصنّفین کے لحاظ سے تفصیلات درج نہیں کی گئی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ہفتہ وار سچ میں متنوع موضوعات پر خود لکھا اور دوسرے اہل قلم کی نگارشات بھی شائع کیں۔اس کی فہرست موضوعات سے بھی اس کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔فاضل مرتب نے توضیحی نوٹس کے ذریعہ اس کی افادیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔

توضیحی اشاریے اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً مفید ہوتے ہیں، تاہم جدید اشاریہ سازی کے مقابلے میں اس کی افادیت کمتر ضرور ہوتی ہے۔اگر توضیحات کے ساتھ عنوانات اور مصنّفین کا بھی اشاریہ ہوتا تو اس کی افادیت دوچند ہو جاتی۔فاضل مرتب نے موضوعات میں تنوع کے باوجود انتہائی محنت اور عرق ریزی سے یہ اشاریہ مرتب کیا ہے۔بالخصوص توضیحات وتشریحات میں انہوں نے جو محنت اور کاوش کی ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔بلاشبہ یہ ایک مفید اشاریہ ہے۔

توضیحی اشاریہ ہفتہ وار صدق

مرتبہ ڈاکٹر عبدالعلیم قدوائی

صفحات ۵۷۸، قیمت ۱۶۰، سنہ اشاعت ۲۰۰۰ء، ملنے کا پتہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ہفتہ وار سچ کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مئی ۱۹۳۵ء میں ہفتہ وار صدق جاری کیا۔ یہ اصلاً سچ کا نقش ثانی تھا۔ تاہم بنیادی طور پر یہ سچ سے جدا ایک اہم علمی، ادبی اور اصلاحی رسالہ تھا۔ یہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ اس کی سترہ سالہ زندگی میں ملکی اور سیاسی حالات میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ ملک تقسیم ہوا۔ اردو غداروں کی زبان ٹھہری۔ تاہم مولانا مرحوم اپنے مشن پر ثابت قدمی سے جمے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار ہندوستان کے اہم اخبار و رسائل میں ہوا اور ذوق و شوق کی آنکھوں سے پڑھا گیا۔ جناب ڈاکٹر عبدالعلیم قدوائی صاحب نے ہفتہ وار ''سچ'' ہی کی طرح ''صدق'' کا بھی توضیحی اشاریہ بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ یہ بھی محض موضوعاتی اشاریہ ہے۔ اس میں بھی فاضل مرتب نے موضوعات کی ایک طویل فہرست کے تحت مضامین و مقالات، خبریں، مراسلے، تذکرے اور تبصرے علاحدہ علاحدہ درج کئے ہیں۔ مستقل عنوانات مثلاً سچی باتیں وغیرہ پر جو توضیحی نوٹس قلم بند کئے ہیں، ان سے یقیناً اس اشاریہ کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

اشاریہ ترجمان القرآن

حکیم نعیم الدین زبیری

صفحات ۴۷۰، سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء، ملنے کا پتہ دائرہ معارف اسلامی لاہور

ماہنامہ ترجمان القرآن مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہی وہ رسالہ ہے جس نے برصغیر میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ تحریک اسلامی کے ترجمان کی حیثیت سے اس رسالہ نے علوم دینیہ کی تعبیر و تشریح اور افکار فاسدہ کی تردید اور اس کے مضمرات کی نشان دہی کا منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ ملت پر جو اثرات مرتب ہوئے، سوائے ماہنامہ معارف کے کوئی دوسرا رسالہ اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں پیش کر سکتا۔

اس کا مفصل اشاریہ حکیم نعیم الدین زبیری صاحب نے مرتب کیا ہے، جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۶ء تک کی اشاعتوں پر مشتمل ہے۔ اسے دائرۂ معارف اسلامی لاہور نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے۔

اشاریہ سازی کے لحاظ سے یہ ایک عمدہ اشاریہ ہے۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے اسے مصنّفین کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ پھر موضوعات کے لحاظ سے۔ البتہ عنوانات کے لحاظ سے اندراج نہیں ہے۔ آخر میں موضوعات کی ایک طویل فہرست درج کی گئی ہے۔ حالاں کہ اسے شروع میں ہونا چاہیے تھا۔ جس سے استفادہ مزید آسان ہو جاتا۔

اشاریہ ماہنامہ زندگی

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ماہنامہ زندگی نصف صدی سے زاید عرصہ سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا شمار ملک کے اہم دینی و علمی رسائل میں ہوتا ہے۔ اس میں خالص علمی انداز میں فکر انگیز متنوع دینی و علمی موضوعات اور وقت کے اہم مسائل پر مواد شائع ہوتا ہے۔ یہ جماعت اسلامی ہند کا ترجمان ہے، لیکن دوسرے حلقوں میں بھی اسے پسند کیا جاتا ہے اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

ماہ نامہ زندگی کی اشاعت کا آغاز نومبر ۱۹۴۸ء میں رام پور سے ہوا تھا۔ یہی رسالہ اکتوبر ۱۹۸۴ء سے ''زندگی نو'' کے نام سے نئی دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔ ابتداء میں اس کے مدیر مولانا سید حامد علیؒ تھے۔ ۱۹۶۱ء سے اس کی ادارت کا فریضہ مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے انجام دیا۔ ان کی وفات (مئی ۱۹۸۶ء) کے بعد مولانا سید جلال الدین انصر عمری نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۹۱ء سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی اس کے مدیر ہیں۔ مولانا سید احمد عروج قادری کے زمانہ ادارت میں اس کے متعدد خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ مثلاً مسلم پرسنل لا نمبر طلاق نمبر، پیام مسجد نمبر وغیرہ۔ ان نمبروں کو علمی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

مولانا سید عروج قادری کو زندگی کی اشاریہ سازی کی ضرورت کا احساس تھا۔ ان کے زمانہ میں چار مواقع پر کچھ مدت کی فہرستیں شائع ہوئیں۔ ان میں مضامین ومقالات کا موضوعاتی اشاریہ نہیں مرتب کیا گیا، بلکہ رسالہ میں جو مستقل کالم لکھے جاتے تھے انہی کے مطابق فہرستیں تیار

کردی گئی تھیں۔ خدابخش لائبریری پٹنہ کے ایک پروجکٹ کے تحت ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے ''زندگی کا خزانہ'' کے عنوان سے مذکورہ رسالہ کا باون سالہ (نومبر ۱۹۴۸ء تا دسمبر ۲۰۰۰ء) اشاریہ تیار کیا ہے۔ یہ اشاریہ موضوعات، مصنّفین ومترجمین اور عناوین تینوں اعتبار سے ہے۔ موضوعات کے تحت مضامین سے متعلق تمام معلومات دی گئی ہیں اور ان پر نمبر شمار ڈالے گئے ہیں۔ مصنّفین اور عناوین کے تحت مضامین سے متعلق تمام معلومات دینے کے بجائے ان کے نمبر شمار کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ تبصرہ شدہ کتب ورسائل کی فہرست الگ سے شامل اشاریہ کی گئی ہے۔

یہ اشاریہ کتابی صورت میں ''زندگی کا خزانہ'' ہی کے عنوان سے ۲۰۱۶ء میں دہلی سے شائع ہوگیا ہے۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی تقسیم کا رہے۔

اشاریہ ماہنامہ رحیق

جناب ڈاکٹر سفیر اختر صاحب

صفحات ۵۶۔ قیمت ۵۰/روپئے۔ اشاعت ۲۰۰۴ء

ناشر: دارالمعارف لوہسر شرفوواہ کینٹ (سرحد)

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نامور اہل حدیث عالم ومصنف تھے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی تاسیس وتوسیع میں انھوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور اشاعت کتب سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے کئی کتابوں کو تعلیق وتخریج اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ سنن نسائی کا حاشیہ التعلیقات السّلفیہ ان کی ایک بڑی اہم کاوش ہے۔ ماہنامہ رحیق کا اجراء اور اس کی اشاعت ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ رسالہ تقریباً چار برس تک شائع ہوتا رہا۔ اس دوران مختلف موضوعات پر متعدد گراں قدر تحقیقی وتنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ کتابوں پر تبصرے بھی خاصے وقیع ہوتے تھے۔ زیرنظر کتاب دراصل اسی ماہنامے کا اشاریہ ہے۔ جسے ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے چیف ایڈیٹر جناب ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے مرتب کیا ہے۔ وہ ماہنامہ الرحیم کا بھی اشاریہ مرتب کرکے شائع کرچکے ہیں۔ انھیں اشاریہ سازی سے خاص دلچسپی رہی ہے اور بلاشبہ یہ بڑا اہم اور وقیع کام ہے۔ اس سے رسائل کے اوراق

میں دفن خزینوں سے اہل علم کے لئے استفادہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت صدقہ جاریہ سے کم نہیں۔

ڈاکٹر سفیر اختر صاحب لائق ستائش وقابل مبارک باد ہیں کہ وہ مسلسل یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ اشاریہ کے ساتھ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے مختصر حالات زندگی اوران کے علمی کاموں کا تعارف بھی اس میں آ گیا ہے۔ مولانا مرحوم کے ساتھ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کے تعلقات کی علمی روداداوران کے تاثرات سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ البتہ یہ اشاریہ محض موضوعاتی ہے۔ عنوانات کے لحاظ سے بھی ترتیب ہوتی تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ اس کے باوجود مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اوران کے رسالہ رحیق سے استفادہ اوران کی یادتازہ کرنے کے لئے یہ رسالہ کافی ہے۔ (ماہ نامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ جنوری فروری ۲۰۰۵ء)

اشاریہ ماہنامہ الرحیم

جناب ڈاکٹر سفیر اختر صاحب

صفحات ۷۶، قیمت: سوروپے، سنہ اشاعت جون ۲۰۰۴ء

ناشر دارالمعارف، لوہسر شرفو، واہ کینٹ، روالپنڈی

ٹھٹھ سندھ کی ایک نیک دل، خدارسیدہ اورعلم نواز خاتون بی بی زینب النساء نے ۱۹۴۶ء میں ۱۳۵۱۱/۱ ایکڑ زمین اپنے خسر سید محمد رحیم شاہ کے نام پر وقف کی تھی، جس کا بنیادی مقصد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار وخیالات، تعلیمات اوران کے فلسفہ وحکمت کی ترویج واشاعت تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں اس وقف کے تحت مشہور مصنف ومؤرخ اور سلسلہ کوثریات کے مصنف شیخ محمد اکرام کی کوششوں سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ کا قیام عمل میں آیا اوراس کا ترجمان ماہنامہ الرحیم جاری ہوا۔ یہ خاص طور پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار وخیالات، تعلیمات فکرو فلسفہ اوران کے کارناموں پر علمی وتحقیقی مضامین ومقالات پر مشتمل ہوتا تھا۔ جنوری ۱۹۶۳ء سے اکتوبر ۱۹۶۵ء تک اس کی اشاعت برابر جاری رہی۔ زیرنظر کتاب اسی ماہنامہ ''الرحیم'' کا اشاریہ ہے۔ یہ اشاریہ بھی ڈاکٹر سفیر اختر صاحب سابق مدیر ششماہی مجلّہ ''نقطہ نظر'' نے مرتب کیا ہے اور

اپنے ذاتی ادارہ ''دارالمعارف'' لوہسر شرفو واہ کینٹ پاکستان سے شائع کیا ہے۔ یہ اشاریہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین و مقالات کا شمار و اندراج ہے۔ دوسرے حصہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت اوران کے کارناموں تصنیفات و تالیفات ،تراجم،افکاروخیالات اوران کے خانوادے سے متعلق مقالات کی تفصیل ہے۔ تیسرے حصہ میں متفرقات یعنی شاہ ولی اللہ اکیڈمی اور ماہ نامہ الرحیم نیز ان سے متعلق کانفرنس وغیرہ کی اطلاعات اورخبروں وغیرہ سے متعلق تحریروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آخر میں پورے اشاریے کا ایک نہایت جامع اشاریہ بھی درج کیا گیا ہے۔ مجموعی طور سے یہ ایک عمدہ اشاریہ ہے اور علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کے لئے کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ کتابت وطباعت بھی نہایت خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔

فہرست شماری اور کتابیات سازی کی اہمیت وافادیت سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ یہ اشاریہ بھی اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں خاص طور سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے متعلق تحریروں کا احاطہ ہوگیا ہے۔ اس کے فاضل مرتب جناب ڈاکٹر سفیراختر صاحب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ادارہ تحقیقات اسلامی سے وابستہ اورکئی اہم کتابوں کے مصنف ومولف ہیں۔ برصغیر کی اسلامی تاریخ بالخصوص فکری تاریخ اورشخصیات پران کی گہری نظر ہے۔ ان کا شش ماہی مجلّہ نقطۂ نظر اسلام آباد اپنے علمی اور محققانہ تبصروں کے لئے پوری علمی دنیا میں معروف ہے۔ اس قیمتی اشاریہ کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اشاریہ مجلّہ علوم اسلامیہ

پروفیسر اکمل ایوبی
سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ موقر مجلّہ ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۶۰ء سے مسلسل شائع ہورہا ہے۔ ہندوستان میں اسلامیات سے متعلق شائع ہونے والے رسائل میں اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ اس میں علوم اسلامیہ پر ''ادبی ،فکری وتجدیدی ذہن'' کی عکاسی کے حامل مضامین شائع

ہوتے رہے ہیں۔۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک شائع ہونے والے مضامین کا یہ اشاریہ پروفیسر اکمل ایوبی سابق ڈائرکٹر ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تیار کیا تھا جو اسی مجلّہ میں جلد ۱۰، شمارہ ۱۔۲، ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے۔ دراصل یہ چار فہرستوں پر مشتمل ہے۔ فہرست مضمون نگاران، فہرست مضامین، فہرست تبصرہ و مطبوعات جدیدہ اور فہرست معلومات و مراسلات ۔ چاروں فہرستوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے تیار کیا گیا ہے۔

اشاریہ فکر و نظر علی گڑھ

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

مشمولہ: خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ (شمارہ ۸۰، ۱۹۹۲ء

اس علمی، ادبی اور تحقیقی مجلّہ کا اجرا جنوری ۱۹۶۰ء میں ''اردو غزل'' کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ بہت جلد اس نے اہل علم کی توجہ حاصل کر لی اور اپنی مختلف النوع نگارشات اور مشمولات سے ایک معیاری رسالہ قرار پایا۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے متعدد اہل قلم نے اس کی ادارت سنبھالی اور اس میں دیگر موضوعات کے علاوہ اسلامیات سے متعلق تحقیقی مضامین و مقالات برابر شائع ہوتے رہے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے یہ ایک خالص ادبی رسالہ ہو کر رہ گیا ہے۔

سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک شائع ہونے والے مضامین کا اشاریہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاریؒ سابق ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے مرتب کیا ہے، جو خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ (شمارہ ۸۰، ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس کی ترتیب موضوعاتی ہے۔ مختلف موضوعات کو الف بائی ترتیب کے مطابق درج کر کے ان کے ضمن میں آنے والی تحریروں کے عنوانات درج کئے گئے ہیں۔ مضمون نگاروں کے نام، جلد اور شمارہ، ماہ و سال اور صفحات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ جا بجا وضاحتی اور تشریحی نوٹس لکھ کر اشاریہ کو مزید آسان اور مفید بنایا گیا ہے۔

اس اشاریہ میں مصنّفین اور عناوین کے لحاظ سے بھی مشمولات کا اندراج کیا گیا ہے۔

بعد میں ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۹ء تک شائع ہونے والے مضامین کا ایک اشاریہ جناب کبیر احمد خاں صاحب اسسٹنٹ لائبریرین شعبہ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مرتب کیا ہے جو فکر و نظر علی گڑھ ہی کے ایک شمارہ (جلد ۳۷، شمارہ ۴، ۲۰۰۰ء) میں شائع ہوا ہے۔ ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس میں سنہ ۲۰۰۰ء کے چار شماروں کا اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سے فکر نظر کے مشمولات سے استفادہ کرنا یقیناً بہت آسان ہو گیا ہے۔

اشاریہ فکر و نظر اسلام آباد

شیر نوروز خاں

صفحات ۱۹۹، قیمت ۱۸۰ روپئے، سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء

ناشر ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کا ترجمان مجلّہ ''فکر و نظر'' ایک اہم علمی و دینی رسالہ ہے۔ اس کا شمار برصغیر کے اہم اور بلند پایہ رسائل و جرائد میں ہوتا ہے۔ یہ ۱۹۶۳ء میں کراچی سے جاری ہوا۔ کچھ دنوں تک راولپنڈی سے بھی نکلا، پھر اس کا دفتر اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ پہلے ماہ نامہ تھا، پھر سہ ماہی ہوا اور اب تک نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر قدرت اللہ فاطمی اس کے پہلے مدیر تھے۔ پروفیسر محمد سرور اور ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے بھی اس کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔ اب یہ ذمہ داری ہمارے کرم فرما ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن صاحب بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

فکر و نظر کے مضامین و مقالات سنجیدہ، ٹھوس اور علمی و تحقیقی ہوتے ہیں۔ گذشتہ چالیس برسوں میں اس نے بڑا اہم اور وقیع سرمایہ دین و مذہب اور علم و ادب پیش کیا ہے۔ اس کا ۱۹۶۳ء سے ۱۹۹۳ء تک کا اشاریہ دو حصوں میں مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ پہلا حصہ جو ۱۹۶۳ء سے جون ۱۹۷۸ء کے مشمولات کا اشاریہ ہے۔ اسے جناب احمد خاں لائبریرین ادارہ تحقیقات اسلامی لائبریری اسلام آباد نے مرتب کیا ہے۔ یہ اشاریہ سازی کے لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں فن اشاریہ سازی سے پورے طور پر کام لیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے موضوع کے لحاظ سے

الف بائی ترتیب پر مقالات کا اندراج ہے۔ پھر مصنّفین اور عنوانات کے لحاظ سے۔ جلد اور شمارہ نمبر کے ساتھ صفحات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ البتہ ماہ وسال کا اندراج نہیں ہے۔ جوفن اشاریہ سازی کے لحاظ سے ایک بہت بڑی کمی ہے۔

فکر ونظر اسلام آباد کا دوسرا اشاریہ جولائی ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۳ء تک کے شماروں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اسے جناب شیر نوروز خاں نے مرتب کیا ہے۔ یہ دوسرا حصہ پہلے حصہ سے بھی زیادہ بہتر اشاریہ ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں مقالات کا اندراج مصنّفین، عناوین اور پھر موضوعات کے لحاظ سے ہے۔ دوسرے حصہ میں تبصرۂ کتب کا اشاریہ مبصرین، مصنّفین اور عنوانات کے لحاظ سے درج ہے۔ آخر میں وفیات اور متفرقات کا اشاریہ ہے۔ پہلے حصہ میں ماہ وسال کا اندراج نہیں تھا، اس اشاریہ میں یہ کمی گرچہ پوری کر دی گئی ہے، مگر یہ جلد اول کا مداوا نہیں ہوسکتی۔

اشاریہ اسلام اور عصر جدید

مدیر: پروفیسر اختر الواسع۔ صفحات ۵۶۔ قیمت ۲۰ روپے۔ سنہ اشاعت ۱۹۹۹ء

ملنے کا پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سہ ماہی اسلام اور عصر جدید ۱۹۶۹ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ڈاکٹر سید عابد حسین کی زیر ادارت نکلا اور اب تک جاری ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں اسلام اور جدید افکار ونظریات پر مشتمل مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں۔ اس کا ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۹ء تک کا اشاریہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ جسے محمد عرفان، جبین انجم اور ابوذر خیری نے مرتب کیا ہے۔ اسے اگرچہ اشاریہ کا نام دیا گیا ہے اور پروفیسر اختر الواسع نے مقدمہ میں اس کی افادیت کا ذکر کیا ہے تاہم اسے اشاریہ قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ اس میں محض اسلام اور عصر جدید کے ہر شمارے کی فہرست ترتیب وار نقل کر دی گئی ہے۔ نہ موضوع کا پتہ چلتا ہے اور نہ مصنّفین اور عناوین کی کوئی ترتیب ہے۔ لطف یہ کہ یہ فہرست بھی تین افراد نے مل کر مرتب کی ہے۔

اشاریہ ماہنامہ الرشاد

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

صفحات ۲۳۲، سنہ اشاعت ۲۰۰۴ء

ناشر: ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد رشاد نگر اعظم گڑھ

فروری ۱۹۸۱ء میں استاذ گرامی اور نامور عالم دین حضرت مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے ماہ نامہ الرشاد جاری کیا۔ جو اس وقت سے اب تک شائع ہو رہا ہے۔ اس کا بائیس سالہ اشاریہ راقم نے مرتب کیا ہے۔ جسے ۲۰۰۴ء میں ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

اس کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے الرشاد کے تمام مشمولات کو ان کے عنوانات کے لحاظ سے الف بائی ترتیب پر درج کیا گیا ہے۔ پھر مصنّفین اور موضوعات کے لحاظ سے تمام مضامین ومقالات کا اندراج ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے۔ دوسرے حصہ میں تبصرہ کتب کا اشاریہ مبصرین، مصنّفین اور عنوانات کے لحاظ سے ہے۔ دونوں حصوں میں ماہ وسال اور صفحات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس ترتیب سے یقیناً استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ البتہ اس میں ایک کمی یہ ہے کہ اداریہ (رشحات) کا اشاریہ شامل نہیں ہے۔ چونکہ اس کا اشاریہ علاحدہ شائع کرنے کا ارادہ تھا، اس لئے یہ کام موخر کر دیا گیا جس کی نوبت اب تک نہیں آسکی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اصول اشاریہ سازی کے لحاظ سے یہ ایک بڑی کمی ہے۔

اشاریہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سنہ اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحات ۶۴، قیمت ۱۰ روپے، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کا ترجمان سہ ماہی تحقیقات اسلامی ۱۹۸۲ء میں جاری

ہوااوراپنے بلند معیار پر ابتک مسلسل شائع ہور ہا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رسالہ اپنے علمی مشمولات اور دقیق مقالات کے اعتبار سے برصغیر کی رسائل کی تاریخ میں انفرادیت کا حامل ہے۔ اس نے گذشتہ پچیس سالوں میں علم وتحقیق کا گراں قدر سرمایہ اہل علم و دانش کے لیے مہیا کیا ہے۔ سولہ سال [۱۹۸۶ء-۱۹۹۷ء] پر مشتمل اس کا ایک اشاریہ ہمارے دوست ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے مرتب کیا ہے۔

اس اشاریہ کی ترتیب موضوعاتی ہے۔اس کی اشاعت پہلے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری جرنل پٹنہ (شمارہ ۱۱۱،جنوری۔مارچ ۱۹۹۸ء) میں ہوئی۔ بعد میں علاحدہ کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا۔ جلد،شمارہ،ماہ وسال اورصفحات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔مشمولات کے نمبر شمار دے کر آخر میں 'اشاریہ مصنّفین' بھی درج کیا گیا ہے۔تبصرہ کتب (اردو،عربی،انگریزی) کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔سب سے آخر میں ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی،علی گڑھ کی خبریں اور دیگر متفرقات کا اشاریہ ہے۔یقیناً اہل علم کے لیے یہ ایک بے حد مفید کارآمد اشاریہ ہے۔

اشاریہ ششماہی علوم القرآن

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب

صفحات ۵۶،سنہ اشاعت ۲۰۰۵ء

ملنے کا پتہ: ادارہ علوم القرآن پوسٹ بکس نمبر ۹۹،سرسید نگر،علی گڑھ،۲۰۰۲ء

فلاح اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ صحیفہ ہدایت قرآن پاک سے بہرصورت رشتہ استوار رکھا جائے اور اس کے علوم واسرار اور معارف کا فیضان عام کیا جائے۔ انھی مقاصد کے حصول کے لیے گرامی قدر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی سرپرستی میں علی گڑھ میں ادارہ علوم القرآن کا قیام عمل میں آیا اور اس کا ترجمان مجلّہ ششماہی ''علوم القرآن'' جاری ہوا۔گذشتہ بیس سالوں میں اس رسالہ نے قرآنیات پر انتہائی بیش بہا،قیمتی اور فکر انگیز مضامین ومقالات شائع کیے ہیں۔

علوم القرآن، تعلیمات قرآن، تفاسیر ومفسرین، تفسیر وتاویل، ترجمہ قرآن اور دوسرے قرآنی علوم وموضوعات پر سیر حاصل مقالات کی اشاعت کے لیے یہ رسالہ برصغیر کی تاریخ میں

امتیازی اورانفرادی حیثیت کا حامل ہے۔تحقیقی مقالات کے علاوہ قرآنیات سے متعلق متعدد کتب ورسائل کا جائزہ۔ دنیا بھر میں قرآن اور قرآنیات پر ہونے والے علمی وتحقیقی کاموں کا جائزہ، مسابقۂ قرآن مجید، تجوید وقرأت کی کتابوں اور دوسری سرگرمیوں کی تفصیلات بھی اس میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ افادیت کے پیش نظر معاون مدیر ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب نے اس کا اشاریہ تیار کیا ہے، جس سے مجلّہ علوم القرآن سے استفادے کی راہ اور ہموار بلکہ بہت آسان ہوگئی ہے۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب اس سے پہلے ''کتابیات فراہی'' مرتب کرکے اشاریہ سازی کا ایک نمونہ پیش کر چکے ہیں۔ یہ اس سلسلہ کی ان کی دوسری اہم کاوش ہے۔

یہ ایک موضوعاتی اشاریہ ہے اور مجلّہ 'علوم القرآن' کے مستقل عنوانات اور موضوعات کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، مگر اشاریہ سازی کے جدید اصولوں کا اگر لحاظ رکھا گیا ہوتا تو اس کی افادیت مزید بڑھ جاتی۔ باوجود اس کے یہ اہل علم بالخصوص علماء اور محققین کے لیے بے حد مفید اشاریہ ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب ممتاز عالم، اہل قلم، اور مورخ ومصنف ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ قرآن پاک سے انہیں بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ اس کے درس کا بھی وہ اہتمام کرتے ہیں۔ زیر نظر اشاریہ بھی اسی لگاؤ کا ایک مظہر ہے۔ ورنہ یہ کام وہ اپنے کسی طالب علم سے بھی لے سکتے تھے۔

اشاریہ عالم اسلام اور عیسائیت

ڈاکٹر سفیر اختر۔ صفحات ۸۸، سنہ اشاعت ۲۰۰۰ء

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے تحت اس رسالہ کا اجراء جولائی ۱۹۹۰ء میں ہوا۔ یہ دراصل اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر برطانیہ کے جریدہ ''فوکس'' کا ترجمہ تھا اور اسی کے تعاون سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ ابتدا میں ماہ نامہ تھا، پھر سہ ماہی ہوا۔ اہم مضامین ومقالات اور خاص طور سے موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے بہت جلد اس نے مقبولیت حاصل کرلی۔ فوکس کی اشاعت موقوف ہوجانے کے بعد بھی یہ جاری رہا۔ اس کے اجراء کا بنیادی مقصد مسیحی برادری کی سرگرمیوں

کومعروضی انداز میں پیش کرتا تھا۔ چنانچہ اس میں مطالعہ مسیحیت کے ساتھ مسلم عیسائی تعلقات پر مشتمل مضامین ومقالات بھی شائع ہوتے تھے۔مغربی دنیا کے بدلتے رجحان کے پیش نظر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے ایک اوررسالہ ''مغرب اوراسلام'' شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے ''عالم اسلام اورعیسائیت'' کی اشاعت روک دی گئی۔ جنوری ۲۰۰۰ء کارسالہ اس کا آخری شمارہ ہے ،جواس رسالہ کے تمام مشمولات کااشاریہ ہے۔ اسے مدیرششماہی مجلّہ ''نقطہ نظر'' ڈاکٹرسفیراختر صاحب نے مرتب کیا ہے۔

اس اشاریہ کی ترتیب یہ ہے کہ اس کے مستقل عنوانات(کالم) کے تحت شائع ہونے والی تحریریں کوشماروں اور ماہ وسال کی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔البتہ مقالات اورتبصرۂ کتب کا اشاریہ مقالہ نگاروں اورمصنفین کے لحاظ سے الف بائی ترتیب پر ہے۔آخر میں مصنّفین اور موضوعات کے لحاظ سے دوفہرستیں درج کی گئی ہیں۔زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ اس کے تمام مشمولات پہلے الف بائی ترتیب پر ہوتے ،پھرموضوعات اور مصنّفین کے لحاظ سے ان کا اندراج کیاجاتا۔ تبصرۂ کتب کااندراج بھی اسی ترتیب کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔

ان معمولی کمیوں کے باوجود''عالم اسلام اورعیسائیت'' کے مشمولات سے واقفیت کا یہی ایک بنیادی ذریعہ ہے۔

ان رسائل کے علاوہ بھی بعض اہم رسائل کے اشاریے شائع ہو چکے ہیں،مگروہ راقم کو دستیاب نہ ہوسکےاوریہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں ان کا ذکررہ گیا۔تاہم چونکہ یہ رسائل اردو کے موقر ترین رسائل ہیں۔اوران کے جواشاریے مرتب کئے گئے ہیں،ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردواشاریے کس پائے کے ہیں۔

اشاریہ سازی پتہ ماری کا کام ہے۔دوسرے یہ کہ انہیں شائع کرنے والےادارے میسر نہیں ہیں۔عام ناشرین انہی کتابوں کوشائع کرنا پسند کرتے ہیں جونفع بخش ہوں۔یہی وجہ ہے کہ متعددرسائل وجرائد کے اشاریے جو یونیورسٹیوں میں تیارکرائے گئے، وہ اب تک شائع نہیں ہوسکے۔اس کے ساتھ یونیورسٹیوں اورکالجوں میں علمی اشتراک کی کمی ہونے کی وجہ سے ایک رسالے کے کئی کئی اشاریے مرتب ہوگئے اوربعض رسائل جن کے اشاریوں کی ضرورت تھی ان کا

اشاریہ مرتب نہ ہوسکا۔اس وجہ سے بھی اردو رسائل کی اشاریہ سازی کو خاطر خواہ فروغ نہ مل سکا۔

اشاریے کا بنیادی مقصد اہل علم اور محققین کی مطلوبہ مواد تک بہ آسانی رسائی اور ان سے استفادہ ہے۔اگر یہ خوبی کسی اشاریے میں نہ پائی جائے تو اسے یقیناً غیر مفید ہی کہا جائے گا۔اردو کے متعدد ایسے اشاریے شائع ہوئے ہیں جن سے استفادے کے لئے ایک اور اشاریہ درکار ہوگا۔ ظاہر ہے یہ اشاریہ نگاروں کا نقص اور کوتاہی ہے۔اس لئے اشاریہ سازی کے ساتھ فنی حیثیت سے بھی اس پر غور کرنا ہوگا۔یقیناً اس سے اشاریہ سازی کے فن کو فروغ ملے گا۔

(سہ ماہی تحقیقات اسلامی،علی گڑھ،اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۶ء،ص ۳۹-۵۴)

◆◆◆

حافظ ڈاکٹر محمد مرسیؒ

ایک مثالی سیاسی رہنما

۱۷/جون ۲۰۱۹ء کو حافظ ڈاکٹر محمد مرسی معزول صدر اسلامی جمہوریہ مصر عدالت میں دوران سماعت غش کھا کر گر پڑے اوران کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور غریق رحمت کرے۔

حافظ محمد مرسی مصر کے منتخب صدر تھے اور نہ صرف منتخب صدر تھے بلکہ ہر دل عزیز صدر تھے۔ ان کی حمایت میں جتنے بڑے بڑے عظیم الشان مظاہرے ہوئے موجودہ دنیا کے انتہائی مضبوط حکمرانوں کو بھی وہ ہر دل عزیزی نصیب نہیں ہوئی۔ حافظ محمد مرسی بڑے جری اور اولوالعزم اور عوامی رہنما تھے۔ وہ عوام کی خواہشوں پر پورے اترے۔ غاصب حکمرانوں سے کسی نوع سے ساز باز اور سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان سے کسی قسم کی رعایتیں نہیں مانگی۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ثابت کردیا کہ جو سر اللہ کے سامنے نگوں ہوتا ہے وہ کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا۔ ان کو دام فریب میں کسنے اور حرص و ہوس کے نہ جانے کتنے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے لیکن وہ ذرہ برابر بھی متزلزل نہیں ہوئے اور نہ ان کے قدم ڈگمگائے بلکہ وہ مسلمانوں پر روا رکھے جانے والے ایک ایک ظلم کا حساب مانگتے رہے۔ اور ایک ایک خون اور عصمت دری کا حساب مانگتے رہے۔ چنانچہ انہیں ڈرایا دھمکایا گیا۔ سخت اذیتیں دی گئیں، موت کی سزا سنائی گئی، سخت قید و بند اور تاریک کوٹھری میں رکھا گیا، مگر اس مرد مجاہد کے قدم صراط مستقیم پر جمے رہے۔ جان دیدی مگر ایمان کا سودا نہیں کیا۔

اے مرد جلیل تجھے سلام، لاکھوں سلام

ان کے جسد خاکی کو خفیہ رکھا گیا۔ آبائی قبرستان میں تدفین کی اجازت بھی نہیں دی گئی اور شب کی تاریکی میں قاہرہ کے اس قبرستان میں دفن کر دیا گیا جس میں دیگر اخوانی رہنما مدفون ہیں۔ تدفین کے وقت ان کے خانوادے کے محض چند افراد شریک ہوئے۔ ان کی اہلیہ نجلا مرسی کو آخری دیدار سے بھی محروم رکھا گیا اور بیوی بھی اپنے شوہر کی طرح عزم و استقلال کا ایک پیکر مجسم بنی رہیں۔ انہوں نے بھی سیسی حکومت سے نعش کے لئے گذارش کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں ان سے درخواست کر کے اپنے شوہر کی روح کو شرمندہ نہیں کر سکتی۔

اسلام کی تاریخ میں حافظ ڈاکٹر محمد مرسی کی طرح استقامت کے پیکر نہ جانے کتنے پیدا ہوئے۔ ہماری تاریخ ان جیالوں کے روشن کارناموں سے روشن ہے، مگر ہمارے عہد میں حافظ محمد مرسی حق گوئی، بیباکی، جرات اور اسلام کی عظمت و سربلندی کا ایک نشان عظمت بن گئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دشمنان اسلام نے ان کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔

ڈاکٹر حافظ محمد مرسی ۲۰ ر اگست ۱۹۵۱ء کو شرقیہ مصر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم کے بعد قرآن مجید حفظ کیا۔ اسلام کی بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۵ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے بی ایس میٹالرجکل انجینئرنگ کی سند لی۔ ۱۹۷۸ء میں ایم ایس میٹالرجکل انجینئرنگ کیا۔ بعد ازاں ۱۹۸۲ء میں حکومت مصر کے وظیفہ پر اسی موضوع پر یونیورسٹی آف ساؤتھ کیلیفورنیا امریکہ سے پی ایچ ڈی کی سند لی۔ تحصیل علم کے بعد کیلیفورنیا یونیورسٹی ہی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں مصر واپس آئے اور زقازق یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس دوران وہ اخوان المسلمین کے کارکن بنے اور سیاسیات میں حصہ لینے لگے۔ مصر کے ۲۰۰۵ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ لیا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ تاہم ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے اسی سال انہیں قید کر دیا گیا۔ سات برس تک وہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے پس دیوار زنداں رہے۔ سخت صعوبتوں کے باوجود ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ رہائی کے بعد ۲۰۱۱ء میں فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ان کی جدوجہد جاری تھی کہ اسی دور میں ''بہار عرب'' کا آغاز ہوا جس نے ان کو مزید مضبوط بنایا اور وہ مصری مسلمانوں کے ہیرو بن کر سامنے آئے اور ۲۰۱۲ء کے انتخابات میں مصر کے صدر منتخب ہوگئے۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد انہوں نے مصر اور

جمہوری اقدار کو مضبوط کرنے کے لئے اقدامات شروع کئے جو فوج اور اس کے آقاؤں کو راس نہیں آئے۔ چنانچہ فوج نے راتوں رات بغاوت کر کے ملک پر قبضہ کر لیا اور منتخب صدر حافظ محمد مرسی کو معزول کر کے قید تنہائی میں ڈال دیا۔ اس وقت سے آج تک انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا تھا۔ گھر والوں سے بھی ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ شوگر کے مریض تھے، ان کا صحیح طریقہ سے علاج بھی نہیں کیا گیا۔ انہیں تاریک کوٹھری میں رکھا گیا۔ غرض وہ تمام اذیتیں پہنچائی گئیں جن سے ان کا وجود باقی نہ رہے اور بالآخر غاصب و ظالم حکمراں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور حافظ محمد مرسی کی جان لے لی۔ غاصب حکمراں اسے اپنی کامیابی خیال کرتے ہوں گے، لیکن درحقیقت وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ حافظ مرسی نے ایک مرد مومن کی طرح شہادت کی موت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ خائف حکمرانوں نے عام نماز جنازہ کی اجازت نہیں دی اور عوام کو جنازے میں شرکت سے روکا۔ ظالموں نے مصر میں لوگوں کو ضرور ظلم و جبر سے نماز جنازہ نہیں پڑھنے دی لیکن پوری دنیا کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی اور ثابت کر دیا کہ ہم آزادی و حریت کے حامی ہیں۔

حافظ محمد مرسی جا تو اپنے رب کے پاس رہ، جہاں تجھے کوئی قید کرنے والا نہیں۔ جہاں تیرا رب تیرے ساتھ اولیا اور متقین کا معاملہ کرنے والا ہے۔ جا خوش رہ۔ سلام۔ لاکھوں سلام۔ اللہ تیری تربت کو ٹھنڈی رکھے گا اور نور سے بھر دے گا۔

ڈاکٹر حافظ محمد مرسی نے دین کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کی باریکیوں پر بھی ان کی عالمانہ نظر تھی۔ خاص طور پر معاشرتی زندگی اور معاشرتی قانون پر علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے ان کی مجتہدانہ نگاہ تھی۔ وہ بڑے نرم دل تھے۔ ایک بار ایک خاتون کو سر راہ کئی بار دیکھا تو رک گئے اور اس کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بیوہ ہے اور اس کے پاس کسی قسم کا ذریعہ آمدنی نہیں، حتیٰ کہ رہنے کو مکان بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوری طور پر اس کا نظم کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح کے عوامی اور رفاہی کاموں کے ان کے متعدد واقعات اخبارات میں نظر سے گذرے۔

وہ ایک اچھے منتظم تھے۔ انہوں نے فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی کو منظّم کرنے اور کامیابی دلانے میں بڑی جدوجہد کی۔ یہ دراصل ان کی تنظیمی صلاحیتوں کے سبب ممکن ہوا تھا۔ وہ صاف

دل تھے۔ان کے قول وفعل میں تضاد نہ تھا۔ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہی کہتے تھے۔مصر کے صدر کے عہدہ پر فائز ہوجانے کے بعد بھی وہ ایک معمولی سے کرایہ کے فلیٹ میں رہتے تھے۔انہوں نے صدارتی محل میں رہنا قبول نہیں کیا اور ایک عام آدمی کی طرح رہنا اور زندگی بسر کرنا پسند کیا۔ دراصل وہ ہر دوئی کو مٹا کر اسلام کی روشن اور خوب صورت تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے اور یہی بات مصری فوج اور اس کے آقاؤں کو ناگوار گذری اور انہوں نے ایک سازش کے تحت پہلے انہیں صدارتی عہدہ سے معزول کیا اور اب انہیں فنا ہی کر دیا۔مگر مرسی تو فنا نہیں ہوا۔ بقا تیرا مقدر ہے اور تو لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے اور تجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ تیرا قتل ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ روئے زمین پر جب اس طرح کے مظالم ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نہ کسی شکل میں عذاب آتا ہے اور آئے گا ان شاء اللہ اور ظالموں کو بہر حال ایک دن نیست و نابود ہوجانا ہے۔ بظاہر سیسی حکومت جسے اپنی کامیابی تصور کر رہی ہے وہ درحقیقت اس کی بڑی ناکامی ہے۔اس لئے کہ محمد مرسی کا نام آزادی و حریت کے نقیب کے طور پر جبین وقت پر لکھ دیا گیا ہے جو ہمیشہ چمکتا رہے گا اور اسے کوئی مٹا نہیں سکے گا۔

حافظ محمد مرسی کو مٹا کر دنیا بھر کے اسلام پسندوں کو دراصل یہ پیغام دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی اسلامی کاز کے لئے جدوجہد کرے گا اسے مٹا دیا جائے گا، مگر ظالم حکمراں خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ احکم الحاکمین کوئی اور ہے اور مسلمان اس طرح کی ظالمانہ روش سے نہ کبھی دب سکتے اور نہ خائف ہوسکتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

سید قطب شہید [۱۹۰۶-۱۹۶۶ء] کو جب خاک وخون میں ملایا گیا تھا اس وقت کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ اسی خاک سے حافظ محمد مرسی پیدا ہوگا۔ بالکل اسی طرح اگر ظلم و جبر اور سفا کی جاری رہی تو پھر مرسی پیدا ہوں گے اور نہ جانے کتنے پیدا ہوں گے۔

•••

ڈاکٹر آدم شیخ کی یاد میں

آج عروس البلاد ممبئی سے یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ ۲۳رفروری ۲۰۲۰ء کو اردو کے بزرگ ادیب، نقاد، محقق، مصنف، سوانح نگار، برہانی کالج ممبئی کے سابق پروفیسر اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر آدم شیخ نے ممبئی میں وفات پائی۔ **انا اللہ و انا الیہ راجعون**. وہ عرصہ سے صاحب فراش تھے۔ ان کی عمر تقریباً ۹۰رسال تھی۔

ڈاکٹر آدم شیخ اردو زبان کے ایک بے لوث خدمت گذار تھے۔ درس وتدریس اور تصنیف و تالیف دونوں میدانوں میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔ وہ ۲۰ راگست ۱۹۳۱ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل وطن مہاراشٹر کا ضلع ستارا تھا۔ ان کی نشوونما اور تمام تر تعلیم وتربیت بمبئی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سینٹ زیویرس کالج ممبئی سے بی اے اور ایم اے اول درجے میں پاس کیا۔ بعدازاں بمبئی یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی، اور ڈی، لٹ، کی اسناد حاصل کیں۔ پی، ایچ ڈی کے نگراں ڈاکٹر نظام الدین گوریکر تھے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ سدھارتھ ڈگری کالج میں اردو کے استاذ مقرر ہوئے۔ کئی برس بعد بمبئی کے برہانی کالج میں پروفیسر کی جگہ نکلی تو وہ اس کے امیدوار ہوئے اور متعدد لوگوں میں خود کو بہتر ثابت کرکے پروفیسر منتخب ہوئے اور پھر یہیں سے نیک نامی کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔ وہ بمبئی یونیورسٹی کے مختلف عہدوں بورڈ آف اسٹڈیز اور اکیڈمک کونسل کے صدر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔

ان سے بے شمار طلبہ نے استفادہ کیا اور اردو وفارسی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی جو آج علم وادب کے مختلف میدانوں میں اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان میں ایک ڈاکٹر شیخ عبداللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنہوں نے ڈاکٹر آدم شیخ کی شخصیت اور فکر وفن پر ایک عمدہ

کتاب لکھ کر حق شاگردی ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر آدم شیخ ۱۹۹۷ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے اعزازی ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔اس عہدہ پر وہ ایک عرصہ تک فائز رہے اور یہاں بھی انہوں نے اردو زبان وادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔اس زمانہ میں انجمن کے صدر محمد اسحاق جمخانہ والا مرحوم تھے۔جن کو ڈاکٹر آدم شیخ پر بڑا اعتماد تھا اور وہ جب تک انجمن کے صدر رہے ڈاکٹر آدم شیخ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر رہے۔ان کی صدارت کے بعد غالباً انہوں نے بھی اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے رشتہ منقطع کر لیا اور گوشہ نشیں ہو گئے اور پھر طویل عمر اور کمزور صحت کی وجہ سے گوشہ نشیں ہی رہے اور بہت کم تقریبات وغیرہ میں نظر آتے۔

ڈاکٹر آدم شیخ مرحوم انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے سہ ماہی مجلّہ نوائے ادب کے بھی مدیر رہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسے انہوں نے بڑی ترقی دی۔خاص طور پر نوائے ادب کے جو خصوصی شمارے انہوں نے شائع کئے وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں مجروح سلطان پوری نمبر،مخدوم محی الدین نمبر،قاضی سلیم نمبر اور مولانا علی میاں نمبر کو اہل علم نے بہت سراہا اور قابل قدر قرار دیا۔علی میاں نمبر تو ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر آدم شیخ نے سہ ماہی مجلّہ نوائے ادب پر خاصی توجہ دی۔حسن ترتیب کے ساتھ اس کے علمی وادبی وقار کا خیال رکھا۔اداریہ وہ بڑے اہتمام سے لکھتے تھے۔دراصل وہ ایک بڑے اہل قلم تھے۔تقریباً دو درجن کتابیں ان کی یادگار ہیں۔تصنیف وتالیف کا آغاز ۱۹۶۴ء میں درسی کتابوں سے کیا۔''ہماری زمین'' مطبوعہ ۶۵-۱۹۶۴ء دو حصوں میں اور ''ہماری تاریخ'' چار حصوں میں مطبوعہ ۶۷-۱۹۶۵ء مرتب کی جو بعض اسکولوں کے نصاب میں شامل ہوئیں۔اس کے بعد ان کی دلچسپی انشائیہ سے ہو گئی اور وہ انشائیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔چنانچہ ۱۹۶۵ء میں ان کی کتاب ''انشائیہ'' منظر عام پر آئی۔۱۹۶۸ء میں ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی،ایچ ڈی، ''مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری'' شائع ہوا۔اسی سال ایک اور کتاب ''انشائیہ نگار میر ناصر علی'' بھی شائع ہوئی۔ان کی دیگر کتب کے نام یہ ہیں۔

اردو انشائیہ: سفر منزلیں اور رہنما[۱۹۸۸ء]،انشائیہ نگار میر ناصر علی[۱۹۷۰ء]،اردو

انشائیہ کا بانی میر ناصر علی[۱۹۸۸ء]، انشائیہ نگار سجاد علی انصاری[۱۹۹۱ء]، مجروح سلطان پوری شخص اور شاعر[۱۹۹۴ء]،محشر خیال کے انشائیے[۱۹۹۶ء]، ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا شخصیت اور خدمات[۱۹۹۸ء]، کائنات مجروح [۱۹۹۸ء]، تماشائی [۲۰۰۰ء] ،مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی علم و حلم کی شمع فروزاں[۲۰۰۰ء]،عبدالمجید پاٹکا سیرت و سرگرمیاں[۲۰۰۱ء]وغیرہ۔

ان تصنیفات و تالیفات کی وجہ سے ان کا شمار اردو کے ممتاز ادیب ،مصنف و محقق اور دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔اور بلاشبہہ ان کی تصنیفات اردو زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر آدم شیخ کی ادبی زندگی کا ایک بڑا اہم پہلو انشائیہ سے ان کی دلچسپی اور حد درجہ کا لگاؤ ہے۔انہوں نے انشائیہ کے فن پر بھی لکھا ہے اور اس کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔یہی نہیں وہ خود ایک انشائیہ نگار بھی تھے اور اس فن پر دسترس رکھتے تھے۔ان کے انشائیوں کو علی العموم پسند کیا جاتا تھا۔ان کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ سجاد علی انصاری اور میر ناصر علی کی شخصیت کا انشائیہ نگاری کے حوالہ سے بہت عمدہ تجزیہ و محاکمہ دو علاحدہ علاحدہ کتابوں میں کیا ہے، سجاد علی انصاری کو انہوں نے اردو کا پہلا انشائیہ نگار ثابت کیا ہے۔اور اپنے موقف کے حق میں بڑے دلائل فراہم کئے ہیں۔ان کے اس موقف سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ انشائیہ نگاری کی تاریخ پر ان گہری نظر تھی اور وہ اس کے بڑے واقف کار تھے۔

ڈاکٹر آدم شیخ ایک بڑے اور منفرد سوانح نگار بھی تھے۔انہوں نے تین سوانحی کتابیں قلم بند کیں۔پہلی سوانحی کتاب ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ''مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری'' ہے۔یہ عنوان اگرچہ روایتی تھا تاہم ڈاکٹر آدم شیخ نے اس کی تالیف و تدوین میں رسمی حدود سے تجاوز کر کے تحقیق کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً انہوں نے محض رسوا پر لکھی گئی تحریروں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ اس کی تصنیف کے لئے لکھنو گئے ۔ وہاں کے ان ادبا و شعرا اور اہل علم سے ملاقاتیں کیں،جنہوں نے مرزا رسوا کو دیکھا تھا یا ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ان سے نہ صرف تبادلہ خیال کیا بلکہ ان مقامات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔جن کا ذکر مرزا رسوا کے ناولوں میں ملتا ہے۔ چونکہ مرزا رسوا نے امراؤ جان جیسا ناول لکھا ہے اس لئے انہوں نے جعفر علی خاں اثر کی معیت

میں بعض طوائفوں کے کوٹھے دیکھے اور علی عباس حسینی کے ہمراہ وہاں کے مشاعروں کی محفلوں میں شریک ہوئے اور عہد گذشتہ کے لکھنو کے ان مناظر کو باور کرنے کی کوشش کی جن کا ذکر مرزا رسوا کے ناولوں میں مذکور ہے۔

لکھنو میں جن ادبا و شعرا اور اہل علم سے وہ ملے وہ اپنے عہد کے ممتاز ترین لوگ تھے۔ ان میں جعفر علی خاں اثر لکھنوی، نیاز فتح پوری، علی عباس حسینی، سید مسعود حسین رضوی ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی، سید احتشام حسین، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، اختر تلہری، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، شجاعت علی سندیلوی اور نسیم انہونوی کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اپنا مقالہ لکھنے میں جن ادباء سے استفادہ کیا ان میں عبدالرزاق قریشی اور حامد اللہ ندوی وغیرہ جیسے محقق ادیب اور انشاپرداز شامل ہیں۔ ان کی دیگر سوانحی کتب میں مجروح سلطان پوری شخص و شاعر، ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا شخصیت اور خدمات، اور عبدالمجید پاٹکا سیرت و سرگرمیاں وغیرہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ یہ کتابیں صاحب سوانح کی زندگیوں میں سپرد قلم کی گئیں اور اس طرح لکھی گئی ہیں کہ خود ان ادبا و شعرا اور سماجی کارکنان نے ان کی حقیقت نگاری اور صداقت بیانی کا اعتراف کیا ہے۔ مجروح سلطان پوری نے ایک موقع پر اعتراف کیا کہ ڈاکٹر آدم شیخ نے میرے بارے میں جو کتاب لکھی ہے، وہ پورے طور پر درست ہے اور آئندہ لکھنے والوں کے لئے ایک مستند ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

مجروح سلطان پوری پر تو وہ اتھارٹی ہی تھے۔ نہ صرف ان کی سوانح اور شاعری پر بھرپور مقالہ لکھا بلکہ ''کائنات مجروح'' اور ''تماشائی'' دو اہم کتابیں لکھ کر اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ کیا۔ ان کی کتاب تماشائی مجروح کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے جو وہ کسی زمانہ میں انقلاب ممبئی میں لکھا کرتے تھے۔ فاضل مرتب ڈاکٹر آدم شیخ نے انہیں نہ صرف یکجا کیا ہے بلکہ بڑے سلیقہ سے ان کی ترتیب تدوین کی ہے۔ توضیح و تشریح کے ساتھ ایک نہایت مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے، جس سے مجروح سلطان پوری کی شخصیت کا یہ اہم پہلو روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

ان کی ایک اور کتاب ''شاہ معین الدین احمد ندوی علم و حلم کی شمع فروزاں'' ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کا قصہ یہ ہے کہ راقم نے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے سابق ناظم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی حیات و خدمات پر ایک مفصل مقالہ لکھا اور اشاعت کی غرض

سے ''نوائے ادب'' بمبئی کو بھیجا۔ جس کے مدیر ڈاکٹر آدم شیخ تھے۔ انہوں نے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور مجھے لکھا کہ

''ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے حسب حکم آپ کے مضمون کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اسے کمپیوٹر پر کمپوز بھی کرالیا ہے۔ چونکہ مذکورہ مضمون صرف پچاس صفحے میں سما گیا، اس لئے چار اور مضامین شامل کر لئے گئے ہیں۔ اب یہ مضامین ''شاہ معین الدین احمد ندوی۔ ایک مطالعہ'' کے عنوان سے کتابی شکل میں آرہے ہیں۔ شاہ صاحب مرحوم کی شخصیت اور فن پر پہلی ادبی کوشش کو منظر عام پر لانے کی سعادت چونکہ ادارے کو نصیب ہوئی ہے اس لئے ادارہ خالق کائنات کا شکر گذار ہے اور آپ اس کتاب کے محرک ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔'' (محبت نامے ص ۱۳)

یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کی رسم اجرا میں شرکت کے لئے انہوں نے مجھے دعوت دی۔ اسی زمانہ میں حارث میموریل سیرت لکچر کے لئے دارالمصنّفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کو انجمن سے مدعو کیا گیا اور اسی تقریب میں مذکورہ کتاب کی رسم اجرا بھی طے پاگئی تھی۔ ڈاکٹر آدم شیخ نے لکھا کہ اب اچھا موقع ہے، ضیاء الدین صاحب کے ساتھ آپ بھی آجایئے۔ گرامی قدر پروفیسر خورشید نعمانی صاحب نے بھی ان کی تائید کی۔ چنانچہ یہ حقیر اس تقریب میں شریک ہوا اور بلاشبہ ڈاکٹر آدم شیخ نے بڑی مہمان نوازی کی۔ میں ان کی اس محبت کو آج تک بھلا نہ سکا اور اب جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی یہ یادیں اور باتیں پلکیں بھگا رہی ہیں۔ اس کے بعد بھی ان سے رابطہ رہا۔ ''نوائے ادب'' میں انہوں نے میرے متعدد مضامین اور کتابوں پر نقد و تبصرے شائع کئے۔ میں جب بھی بمبئی کے سفر پر گیا انجمن اسلام جا کر ان سے ضرور ملا اور ہر بار وہ کتابوں کا تحفہ ضرور دیتے۔ ان کی عنایت کردہ متعدد کتابیں میرے ذاتی ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ ان کا میں نے اپنے سفرنامے ''ساحلوں کے شہر میں'' میں کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر آدم شیخ نے ادبیات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ نہ صرف اردو ادب بلکہ انگریزی ادب پر بھی وہ حاوی تھے۔ ان کی تحریروں میں انگریزی ادبا اور مفکرین کے متعدد حوالے

آپ کو ملیں گے۔ان کی گفتگو سے بھی ادبیت جھلکتی تھی، مگر تھے بہت سادہ مزاج۔خندہ پیشانی سے ملنا ان کے مزاج اور خمیر میں شامل تھا۔طبیعت میں بے حد انکسار تھا۔اب ایسے منکسر المزاج آپ کو کم ہی ملیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک خوبی ان کا ذوق مطالعہ و کتب بینی تھا۔پڑھتے اور خوب پڑھتے۔وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کا گہرا مطالعہ کرتے۔جس سے اس کی باریکیوں پر بھی ان کی نظر ہو جاتی، ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے ان کے مسلسل مطالعے، ذوق کتب بینی اور کتب خانہ سے دلچسپی کی تفصیل اپنے ایک مضمون میں لکھی ہے۔جو ڈاکٹر آدم شیخ کی ملازمت سے سبکدوشی کے موقع پر شائع ہوا تھا۔

ان کا اسلوب نگارش بھی بہت سیدھا سادا اور شگفتہ ہے۔ان کی نثر کسی بھی مرحلہ میں سطحی اور ثقالت کا شکار نہیں ہوتی۔وہ اپنے قاری کے علم و معلومات میں شعوری طور پر اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا مرحوم پر جو کتاب انہوں نے لکھی ہے اور جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، اس کی نثر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ڈاکٹر آدم شیخ کو یہ ہنر آتا تھا کہ کہاں کیسی نثر لکھی جاتی ہے۔جہاں جیسی ضرورت ہوتی تھی ویسا ہی ان کا اسلوب ہو جاتا ہے۔یہ ان کی نثر نگاری کی ایک بڑی خوبی ہے۔ان کے تحقیقی مقالہ کا مطالعہ کیجئے تو وہ ایک محقق اور نقاد نظر آتے ہیں۔انشائیوں پر مبنی کتابوں میں ان کی دلچسپ اور دلآویز نثر متاثر کرتی ہے۔اسی طرح سوانحی کتب کا مطالعہ کیجئے تو وہ صاحب سوانح کی سوانحی تفصیلات کے ساتھ بیانیہ نثر کے خوب صورت نمونہ کے طور پر سامنے آتی ہیں۔اختصار اور جامعیت دیکھنی ہو تو آپ مجلّہ نوائے ادب کے اداریے پڑھئے جو اختصار اور جامعیت کا نمونہ ہیں۔اللہ مغفرت کرے مرنے والے میں بڑی خوبیاں تھیں۔زمانہ جس طرح کروٹیں لے رہا ہے امکان ہے کہ بہت جلد اردو کے ایسے دیوانے بھی چراغ رخ زیبا سے ملیں گے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

•••

محمد حامد سراج مرحوم

ایک نادیدہ دوست کی علم دوستی

(خطوط کے آئینے میں)

محمد حامد سراج [۱۹۵۸-۲۰۱۹ء] ہمارے عہد کے ایک ممتاز اور منفرد افسانہ نگار تھے۔اس حوالہ سے انہوں نے اردو کی بڑی خدمت انجام دی۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہوئے،جن کے نام وقت کی فصیل، برائے فروخت، چوب دار، بخیہ گری اور برادہ ہیں۔ ان مجموعوں سے زیادہ انہیں ان کے خاکہ ''میّا'' سے شہرت وناموری ملی۔ یہ ماں پر لکھا گیا ایک طویل اور بے مثال خاکہ ہے۔ اس میں ان کے قلم نے جادو دکھایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسے بڑی مقبولیت ملی۔اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور پھر اسے رشید احمد صدیقی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان کے علاوہ بھی ان کے متعدد ادبی کارنامے ہیں۔ جیسے افسانوں کا انتخاب، مشاہیر کی خودنوشتوں کا انتخاب، بادشاہوں کی آپ بیتیوں کا انتخاب وغیرہ۔ان کے افسانوں کا کلیات ''مجموعہ'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔

محمد حامد سراج مرحوم ۲۱/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو میاں والی میں پیدا ہوئے۔خانقاہ سراجیہ انہیں کے آبا واجداد اور بزرگوں کی یادگار اور نشانی ہے۔آپ انہیں دیکھتے تو پہلی نظر میں وہ افسانہ نگار نہیں پیر معلوم ہوتے اور تھے بھی وہ اصلاً پیر ہی۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں،مگر جو تصویریں ان کی دیکھی ہیں وہ بولتی ہیں کہ محمد حامد سراجؒ پیر ہی نہیں پیر میکدہ بھی تھے۔

۱۳/نومبر ۲۰۱۹ء کو انہوں نے وفات پائی تو بڑا دکھ ہوا۔ وہ صرف ایک اچھے اہل قلم اور معتبر افسانہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہت پیارے انسان بھی تھے۔ میرے ان سے ۲۰۱۳ء میں تعلقات قائم ہوئے۔اسی سال انہوں نے اپنے جدامجد کی سوانح ''ہمارے بابا جی'' لکھی تھی جس کا

ادبی حلقوں میں بڑا ذکر تھا۔ یہ ضخیم سوانح عمری انہوں نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے قلم بند کی ہے۔ ان سے میرے تعلقات یوں قائم ہوئے کہ جناب راشد اشرف کراچی نے فیس بک پر ایک مجاہد آزادی ظفر حسن ایبک [۱۸۹۵-۱۹۸۹ء] کی آپ بیتی ''خاطرات'' پر ایک پوسٹ لکھی۔ اس پر میری نظر پڑی تو دیکھا کہ اس کی فہرست میں علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی شہرہ آفاق کتب ''سیرۃ النبیؐ'' اور ''الفاروق'' کے ترکی تراجم کا ذکر ہے۔ شبلیات کے طالب علم کے لئے یہ اطلاع بے حد اہم تھی۔ اس لئے کہ ''سیرۃ النبیؐ'' اور ''الفاروق'' کے بعض ترکی تراجم نظر سے گذرے تھے، لیکن ان کا مترجم کوئی اور اہل قلم تھا۔ ظفر حسن ایبک نہ تھے۔ چنانچہ میں نے جناب راشد اشرف صاحب کو لکھا کہ ''خاطرات'' یا اس کا عکس فراہم کیجئے، مگر شاید ان کی مصروفیات نے ادھر متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا اور انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کئی ماہ گذر گئے۔ میں تقریباً مایوس ہو گیا تھا کہ ۱۵ ستمبر ۲۰۱۳ء کو مرحوم محمد حامد سراج صاحب کا خط ملا۔

الیاس اعظمی صاحب۔ السلام علیکم

امید ہے عافیت سے ہوں گے۔ راشد اشرف کی وال پر آپ نے ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی کے لئے لکھا ہے۔ ۱۹۹۰ء کے آس پاس سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی تھی۔ میں ٹیلیفون کر کے معلوم کروں گا، اگر دستیاب ہوئی تو آپ کے لئے منگوا کر نومبر میں علی گڑھ اپنے دوست غالب نشتر کی بکس کے ساتھ بھجوا دوں گا۔ وہ وہاں سے آپ کو پوسٹ کر دیں گے۔ دعاؤں کی درخواست ہے۔ محمد حامد سراج

میں نے مرحوم محمد حامد سراج کو نہ خط لکھا تھا اور نہ میں ان کے اس اخلاق سے واقف تھا۔ انہوں نے خود سے میری طلب اور علمی جستجو دیکھ کر کتاب فراہم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دراصل یہی وہ نیکی اور شرافت ہے جو بعض خاندانوں اور بزرگوں کے خانوادوں میں برسوں سے رائج ہے اور تہذیبی رواداری کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

کچھ دنوں بعد میں نے انہیں ''خاطرات'' کا قصہ یاد دلایا تو انہوں نے یکم دسمبر ۲۰۱۳ء کو مجھے لکھا کہ

بھائی السلام علیکم

ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی خاطرات دس پندرہ روز میں آپ کو اسکین کر کے PDF میں میل کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اگر پرنٹ آؤٹ نکال کر جلد بندی کرا کے آپ کی خواہش ہو تو وہ بھی مشکل نہیں، جیسی آپ کی خواہش ہو۔

بس تھوڑا انتظار الیاس صاحب

کل میں نے جہلم میں ایک بہت بڑے بک شوروم پر رابطہ کیا اور سنگ میل کے ساتھ فیصل آباد، مثال بک پبلشرز پر بھی ''خاطرات'' کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔ میں اپنا نسخہ اسلام آباد V Prints کے اپنے دوست ملک صفدر صاحب کو بھیج رہا ہوں۔ وہ ہفتہ دس دن میں اسکین کر دیں گے۔ وہ آپ کو ای میل کر دوں گا۔

لیکن پھر شاید یہ ممکن نہ ہو سکا اور دو ڈھائی ماہ ان کی طرف سے خاموشی رہی۔ میں نے بھی تقریباً اسے بھلا ہی دیا تھا کہ ۱۸/مارچ ۲۰۱۴ء کو ان کا میسیج ملا:

برادرم!

تلاش سے اللہ مل جاتا ہے۔ یہ تو کتاب تھی۔......خاطرات......جہلم سے ہمارے دوست امر شاہد نے بک کارنر سے ڈھونڈھ نکالی۔ ...... اپنا ایڈریس بھیجئے۔ اگلے ہفتے علی گڑھ غالب نشتر کی کتابوں کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ وہ علی گڑھ سے آپ کو پوسٹ کر دیں گے۔

اس علم دوستی اور دلچسپی کے لئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنا پتہ بھیج دیا۔ دوسرے دن پھر انہوں نے لکھا کہ

غالب نشتر علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر (؟اسکالر) ہیں۔ وہ اردو افسانے پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ افسانے پر انہیں کتابیں بھجوانا ہیں۔ ساتھ ہی آپ کی کتاب بھی بھیج رہا ہوں۔ یہاں سے ڈاک خرچ ہوش ربا ہے۔ دو کلو کا پیکٹ ہو یا پانچ کلو وزن ہو......خرچ ایک ہی پڑتا ہے۔ سو بھائی کوشش ہوتی

ہے کہ جب کتابیں اتنی جمع ہو جائیں کہ وزن پانچ کلو کے پیکٹ کا ہو جائے تو
پھر بھجوانا آسان ہو جاتا ہے۔

پھر ۳؍اپریل ۲۰۱۴ء کو لکھا کہ

آپ کو علی گڑھ غالب نشتر کے پتہ پر ''خاطرات'' پوسٹ کر دی ہے۔
دل مطمئن ہو گیا ہے۔

ہمارے کرم فرما اور نامور محقق ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اسی دوران ''مقالات عبدالقادر'' منگانے کی اس حقیر سے فرمائش کی۔ خدا جانے انہوں نے میرا کیوں کر انتخاب کیا حالانکہ وہ خود وہاں کے متعدد اشخاص سے بخوبی واقف تھے۔ بہر حال میں نے محمد حامد سراج مرحوم کو اس کے لئے بھی لکھ دیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ

بھائی الیاس اعظمی سلام ورحمت

آپ کے لئے تحفہ خاطرات دس روز ہوئے علی گڑھ غالب نشتر کے پاس پہنچ چکی ہے۔ کیا آپ تک پہنچی۔ جلد خبر کیجئے کہ دل کو اطمینان ہو۔ سر شیخ عبدالقادر کے مجموعہ مضامین ''مقالات عبدالقادر'' کا پتہ کرتا ہوں۔

چندروز بعد ''خاطرات'' مجھے مل گئی مگر مجھ سے غلطی ہوئی اور وہ غلطی جو عموماً نہیں ہوتی، یعنی کتاب ملنے کی رسید بر وقت نہ دے سکا، مگر جب میں نے انہیں مطلع کیا تو انہوں نے میری اس کوتاہی کی طرف توجہ نہ دے کر ایک مختصر مگر بڑا مومنانہ خط لکھا:

مکرمی الیاس اعظمی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میرے لئے یہ تسلی اور خوشی کی بات ہے کہ میرے اللہ نے مجھے وعدہ نبھانے کی توفیق عطا کی اور کتاب بحفاظت آپ تک پہنچ گئی۔......اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

۲۸؍اپریل ۲۰۱۴ء کو میں نے شکریہ ادا کیا۔ اسی وقت ان کا ایک اور میسیج ملا کہ آپ اپنا ای میل بھیج دیں۔ میں آپ کو سافٹ کاپی بھیج دیتا ہوں۔ شاید وہ اپنی کتابیں بھیجنے والے تھے۔ میں نے انہیں اپنا ای میل بھیج دیا لیکن اس کے بعد میں شدید بیمار ہوا۔ حتیٰ کہ کچھ ہوش وحواس نہ رہا۔

مہینوں علاج ومعالجہ کے بعد معلوم ہوا کہ دل کی نسیں بند ہوگئی ہیں اور آپریشن لازمی ہے۔ چنانچہ ۴؍جولائی ۲۰۱۶ءکو ممبئی کے ایک ہسپتال میں کامیاب آپریشن ہوا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک میں بالکل بیکار عضو معطل رہا۔ نہ کسی سے خط وکتابت اور لکھنے پڑھنے کی سدھ بدھ۔ کچھ دنوں بعد اللہ نے توفیق بخشی اور میں پھر سے آہستہ آہستہ اپنے معمولات کی طرف بڑھنے لگا۔ میسنجر ریکارڈ کے مطابق میں نے ۲؍ستمبر ۲۰۱۷ءکو ایک طویل وقفے کے بعد محمد حامد سراج صاحب کو عید قرباں کی مبارک باد دی ہے۔ ادھر سے خاموشی رہی۔ ۱۹؍نومبر ۲۰۱۷ءکو میں نے پھر انہیں لکھا کہ

> امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔
>
> میں نے آپ سے دستخط شدہ ''میا'' کی فرمائش کی تھی۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ کو یہاں سے جن کتابوں کی ضرورت ہو ان کی فہرست بھیج دیں میں آپ کو وہ کتابیں بھیج دیتا ہوں اور آپ مجھے ''میا'' بھیج دیں۔
>
> اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ
>
> جنوری فروری (۲۰۱۸ء) میں بھائی جہلم بک کارنر نے کچھ کتابیں بھجوانا ہیں ہندوستان۔ ''میا'' وہ یاد سے آپ کو بھیج دیں گے۔ مجھے صرف آپ کی دعا اور محبت چاہئے۔ آپ ایسے صاحب علم سے رابطے میں رہنا میرے لئے اللہ کا انعام اور اعزاز ہے۔''

میں اپنی ذات اور حیثیت سے بخوبی واقف ہوں۔ ان کے آخری جملے سے شرم سار ہوا اور اللہ تعالی سے دعا کی وہ لوگوں کا بھرم رکھ لے۔ اور آج تک میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ صرف میرے رب کا کرم ہے کہ بات ابتک بنی ہوئی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بچپن سے آج تک بھرم ہی باقی رکھنے میں مصروف ہوں۔ اور میرے رب نے بھی میرا بھرم قائم رکھا ہوا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

''خاطرات'' ملی تو بے حد خوشی ہوئی۔ اس میں علامہ شبلی کی 'سیرۃ النبی' اور 'الفاروق' کے ترکی تراجم کی تفصیل مل گئی۔ معلوم ہوا کہ ظفر حسن ایبک نے مذکورہ کتابوں کا اولاً انگریزی میں ترجمہ کیا اور پھر ترک اسکالر محمد عمر رضا کحالہ نے انہیں ترکی کا جامہ پہنایا اور نہایت اہتمام سے شائع

کرایا، البتہ اس بارے میں کچھ اطلاع فراہم نہیں ہوئی کہ ظفر حسن ایبک کے وہ انگریزی تراجم کیا ہوئے، جن سے ترکی ترجمہ کیا گیا تھا۔ وہ شائع تو نہیں ہوئے مگر اس کے مسودات کہاں گئے۔؟ یہ تمام تفصیل اور ''خاطرات'' کا تعارف، ظفر حسن ایبک کا تذکرہ اور خاطرات میں وارد ذکر شبلی کا مطالعہ اپنی کتاب ''شبلی: خودنوشتوں میں'' قلم بند کیا ہے۔ جو گذشتہ سال یعنی ۲۰۱۹ء میں ادبی دائرہ اعظم گڑھ سے شائع ہو چکی ہے۔

اس کے بعد مجھے ان ادباو شعرا پر ایک مضمون لکھنے کا خیال آیا جو اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور تقسیم وطن کے نتیجے میں ہجرت کر گئے اور وہاں انہوں نے اپنے اپنے طور پر شعر و ادب کی بڑی خدمت کی اور بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں انجم اعظمی، فضا اعظمی، فہیم اعظمی، نجم الحسن رضوی، مفتون احمد [مولانا عبدالسلام ندوی کے بھانجے] وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بہت سے نام اس وقت ذہن میں نہیں آرہے ہیں۔ میں نے اپنے اس خیال کا ذکر مرحوم حامد سراج سے کیا تو انہوں نے فوراً ہی نجم الحسن رضوی کا فیس بک اکاؤنٹ کا لنک بھیج دیا اور مجھے لکھا کہ برادرم! نجم الحسن رضوی صاحب کو عرض کر دیا ہے کہ اپنا واٹسیپ نمبر بھیج دیں۔

مگر پھر اسی دن ان کا دوسرا میسج آیا کہ

اللہ! اللہ!

نجم الحسن صاحب کی بیٹی کا میسج آیا ہے کہ وہ دنیا سے گذر گئے۔

آپ ان کی بیٹی سے رابطہ کر لیجئے۔ میرے پاس ان کی بکس ہیں۔ ایک دو دن

میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو ان کی سوانحی معلومات فراہم کروں۔ ان شاء اللہ

پھر انہوں نے ان کے کوائف بھیجے۔ نجم الحسن رضوی مرحوم کا اصل نام سجاد حسین رضوی تھا۔ ۲۳/اپریل کو وہ قصبہ دیوگاؤں، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ یہاں سے ہجرت کب کی یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ البتہ ان کی تعلیم سکھر، حیدرآباد اور کراچی میں ہوئی تھی اور وہ اردو صحافت اور اردو ادب میں ایم اے پاس تھے۔ اصلاً افسانہ نگار تھے۔ ان کے تین مجموعے ''چشم تماشا'' [۱۹۸۲ء] ''ہاتھ بیچنے والے'' [۱۹۹۴ء] ''پرسے کا موسم'' [۱۹۹۷ء]۔ ۱۹۹۹ء میں طنز و مزاح پر مشتمل ایک کتاب ''ہمارا بدمعاشی نظام'' بھی شائع ہوئی تھی۔ متعدد کتابیں زیر طبع اور زیر تالیف تھیں۔ فروری

۲۰۱۸ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

اس زمانہ میں برادرم محمد حامد سراج صاحب خودنوشتوں پر کام کر رہے تھے۔اس میں وہ علامہ شبلی نعمانی کو بھی شامل کر رہے تھے۔جن کی آپ بیتی ہمارے ایک اور کرم فرما اور اردو کے ممتاز اہل قلم ادیب، نقاد اور شاعر ڈاکٹر خالد ندیم صاحب صدر شعبہ اردو اور دوسری زبانیں یونیورسٹی آف سرگودھا نے بڑی عرق ریزی سے تیار کی ہے جو مثال پبلشر لاہور اور دارالمصنّفین اعظم گڑھ دونوں اداروں سے شائع ہوئی ہے۔یہ کتاب ان کے پاس تھی۔مزید کتابوں کے لئے انہوں نے مجھے میل کیا اور لکھا کہ جو کتابیں آپ فراہم کر سکتے ہیں کر دیں اور جو ممکن نہ ہوں ان کی نشاندہی کر دیں۔چنانچہ میں نے انہیں ایک مفصل خط کے ذریعہ علامہ شبلی اور شبلیات کی تفصیل لکھ بھیجی اور چند دنوں بعد علامہ شبلی سے متعلق اپنی دستیاب دس سے زاید کتابیں ان کو بھیج دیں۔وہ ان کتابوں کو پا کر ایسا خوش ہوئے کہ میں بتا نہیں سکتا۔کتاب دوستی کا تو وہ اعلیٰ نمونہ تھے۔واقعہ یہ ہے کہ کتاب دوست تو بہت مل سکتے ہیں لیکن کتاب کے ساتھ صاحب کتاب سے یکساں محبت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ان کا یہ خط ملاحظہ کیجئے:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

بھائی یہ آپ کا اس فقیر پر غیر معمولی احسان ہے۔جزاک اللہ خیراً۔سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ اپنے محسن کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔

اور جب انہیں کتابیں مل گئیں تو انہوں نے مجھے خط لکھ کر نہ صرف شکریہ ادا کیا بلکہ فیس بک پر ایک پوسٹ بھی لکھی اور اپنی محبت کا اظہار یوں کیا:

میرے محترم، میرے مکرم محمد الیاس اعظمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عادل رضا منصوری صاحب کی طرف سے آج پارسل مل گیا ہے۔ آپ کی طرف سے بھیجی گئی ہر کتاب کو عقیدت و محبت سے چوما۔ سینے سے لگایا۔آپ نے اس فقیر پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔اللہ کریم آپ کو اس کی جزا دے۔خوشی کہ وہ کیفیت ہے کہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ شکریہ کیسے ادا کروں۔

اللہ کریم آپ کو خوش رکھے۔ قریب ہوتے، پہنچنا ممکن ہوتا تو آپ کی پیشانی چومتا۔ دعاؤں کی التجا ہے۔

فیس بک پر جو پوسٹ لکھی وہ بھی ان کی نیکی، شرافت، مروت، محبت اور وضع داری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ کون اس زمانہ میں ان علمی کاموں کی اس قدر قدر کرتا ہے۔ انہوں نے تمام کتب کے سرورق اسکین کر کے فیس بک پر پوسٹ کیئے اور اس پر ۲۷ر جولائی ۲۰۱۸ء کو یہ نوٹ لکھا کہ

میرے انتہائی محترم و مکرم محبی ڈاکٹر الیاس اعظمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

مجھے یاد نہیں کتنے برس گذر گئے۔ آپ نے یاد دلایا تو یاد آیا کہ بہت سال پہلے آپ کو ظفر حسن ایبک کی خاطرات کی تلاش تھی جو کئی بار شائع ہوئی، لیکن آخری بار سنگ میل لاہور نے شائع کی تھی۔ آپ کے لئے سنگ میل سے بھی رابطہ کیا، لیکن خاطرات نہیں ملی۔ لیکن ہمت باندھے رکھی اور آخر کار ایک نسخہ دستیاب ہو گیا جو آپ کو بھجوا دیا۔ میں یہ سب بھول چکا تھا۔

میری خواہش تھی کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کام مولانا شبلیؒ نے شروع کیا اور جسے مولانا سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا، ان کی حیات طیبہ اور محنتوں کا، اخلاص کا مکمل مطالعہ کیا جائے۔ اس حوالے سے آپ کا اسم گرامی کسی بھی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ نے مولانا شبلیؒ پر جو کام کیا ہے وہ وقیع اور علمی لحاظ سے اعلیٰ پائے کا ہے۔ جو صدیوں میں دھڑکتا ہے۔ میری خواہش پر آپ نے اپنی کتب بھجوائیں۔ جزاک اللہ

الفاظ کے جتنے بھی جوڑ بٹھالوں مگر شکریہ نہیں ادا کر سکتا کہ کتنا قیمتی خزینہ آپ نے میرے نام بھیجا ہے۔ میرا دل، میری روح سرشار ہے، دعاؤں کی التجا ہے۔ رب کریم آپ کو تا دیر صحت و عافیت اور ایمان کے ساتھ سلامت رکھے۔

اس کے بعد وہ بیمار ہوئے۔ ان کی خطرناک اور موذی بیماری کا دیگر احباب نے ذکر کیا۔

میں دم بخود رہ گیا اور خاصا پریشان ہوا۔ بڑی دعائیں کیں اور اللہ سے صحت مانگی مگر اس کا راز اسی کو معلوم ہے کہ کس بندے کے لئے کیا بہتر ہے۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو کچھ دیر ہی کے لئے سہی نٹ پر آ جاتے اور خیر خیریت مل جاتی۔

مجھے انہوں نے کئی کتابیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن اس دوران دونوں مما لک کے تعلقات اس قدر خراب ہوئے کہ ڈاک کا نظام سرے سے بند کر دیا گیا۔ یہ اہل علم وادب ہی کا نقصان تھا۔ ایک خط لکھ کر اس المیہ پر بھی انہوں نے افسوس کا اظہار کیا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ میں ان اعظم گڑھ کے ادباء وشعراء اور نقادوں پر کچھ کام کرنا چاہتا تھا جو ۱۹۴۷ء یا اس کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ انہیں میری یہ خواہش یاد تھی۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ

> ''ڈاکٹر فہیم اعظمی مرحوم نے لگ بھگ پندرہ بیس برس ماہنامہ صریر نکالا۔ انہوں نے اپنی کتابیں خود شائع کی تھیں۔ اب جانے کہیں دستیاب ہیں کہ نہیں۔ میرا اس خاندان میں کسی سے بھی تعارف اور رابطہ نہیں۔ فضا اعظمی صاحب کی کتابیں مبین مرزا نے ''بازیافت'' سے شائع کی ہیں۔ وہاں رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ فضا اعظمی پاکستان میں ہیں یا بیرون ملک۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو میں نے انجم الحسن رضوی صاحب کا لنک آپ کو بھیجا تھا جو ان کی بیٹی دیکھتی ہیں۔''

پھر مسلسل خاموشی رہی۔ بیماری بڑھتی اور زندگی کا دائرہ تنگ کرتی جا رہی تھی مگر وہ مرد مجاہد سب کچھ بھول کر اپنے کاموں میں مشغول رہا۔ اس دوران میں نے کئی تحریریں اور کئی مضامین کے لنک بھیجے، اس پر بھی خاموشی رہی۔ خامشی کی وجہ سے میری گھبراہٹ بڑھ رہی تھی کہ خدا جانے ان کی طبیعت کیسی ہے۔ ۱۱ر اگست کو انہوں نے عید کی مبارک پیش کی۔ اس کے بعد پھر خاموشی۔ میں نے اپنے مضمون کا جو ڈاکٹر خلیق انجم پر ہماری زبان میں شائع ہوا تھا تراشہ بھیجا۔ ۲۲ر اکتوبر ۲۰۱۹ء کو انہوں نے دو لفظ ''جزاک اللہ۔ سلامت رہیں آپ......!!'' لکھے۔ میرے نام ان کا یہ آخری میسیج اور آخری الفاظ تھے۔ پھر جو آئی تو ۱۳ر نومبر ۲۰۱۹ء کو ان کی خبر آئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آہ! ایسا نیک دل، فرشتہ صفت، صاحب کمال اور اردو کا بڑا ادیب، افسانہ نگار اور شیدائی ہمارے درمیان سے رخصت ہوگیا۔ حق مغفرت کرے۔ آمین

جانے والے تجھے سلام۔ جا اور اپنے رب کے پاس رہ۔ خوش وخرم رہ۔ اب وہاں آپ کو کوئی موذی مرض کبھی لاحق نہ ہوگا اور دنیا کے اندیشہ ہائے دوردراز سے آپ ہمیشہ کے لئے مامون ہوگئے۔ ہاں ہمیں دکھ ہے تو یہ ہے کہ ہم ان ادبی شہ پاروں سے محروم ہو گئے جو اب تجربات ومشاہدات کے بعد آپ کے قلم سے کاغذ پر ثبت ہوتے تھے، مگر جو نقوش قلم یادگار ہیں وہ کچھ کم اہم نہیں۔ اس کی قدر و قیمت محققین طے کریں گے اور وہ جو کچھ لکھیں گے ہم اسے بھی یاد رکھیں گے اور سب سے کہیں گے کہ ہم نے بھی محمد حامد سراج کو دیکھا اور ان سے فیض پایا تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔

ooo

ڈاکٹر ابرار اعظمی کی یاد میں

۷؍اپریل ۲۰۲۰ء کی صبح یہ روح فرسا خبر لے کر طلوع ہوئی کہ اعظم گڑھ کا ایک اور نیر تاباں غروب ہو گیا، یعنی اردو کے ممتاز ادیب وشاعر، نقاد اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ابرار اعظمی نے ۲؍ بجے شب میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ محض شعر وادب کی آبرو نہ تھے بلکہ مشرقی تہذیب وشرافت کی ایک عمدہ مثال تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی وفات سے سادگی، شرافت، نیکی، مروت، وضع داری اور سنجیدگی ومتانت کا ایک نقش مٹ گیا۔

ڈاکٹر ابرار حسین خاں ابرار اعظمی ۵؍فروری ۱۹۳۶ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں موضع خالص پور میں پیدا ہوئے۔ یہ پٹھانوں کی ایک مشہور بستی ہے اور قصبہ جین پور سے مغرب میں واقع ہے۔ اس کی خاک سے متعدد ارباب علم وفضل اور صاحب کمالات پیدا ہوئے۔ مشہور عالم دین مولانا قمر الزماں اعظمی صاحب حال مقیم لندن اور نامور خطیب ومقرر مولانا عبید اللہ خان اعظمی اسی گاؤں کے لعل وجواہر ہیں۔ ہمارے انتہائی مخلص دوست، اللہ نظر بد سے بچائے ڈاکٹر محمد ارشد خاں کا گاؤں بھی یہی موضع خالص پور ہے

ڈاکٹر ابرار اعظمی صاحب کی پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت ان کے نانا عبد القیوم خاں [۱۸۹۸-۱۹۵۴ء] نے کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بانس گاؤں سے ہائی اسکول پاس کیا اور ۱۹۴۹ء میں میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج گورکھپور میں داخل ہوئے۔ یہاں سے انہوں نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ نامور ادیب اور مشہور نقاد اور ابرار اعظمی صاحب کے دیرینہ یار شمس الرحمٰن فاروقی [۱۹۳۵-۲۰۲۰ء] یہیں ان کے ہم جماعت تھے۔ یہیں دونوں میں دوستی ہوئی جو ہمیشہ باقی رہی۔ ابھی ہماری زبان دہلی کے ۲۲؍ مارچ ۲۰۲۰ء کے شمارے میں ان کا جو مضمون

''قصہ ایک شخص کی وصول یابیوں کے پس منظر کا'' شائع ہوا ہے وہ اسی ربط و تعلق کی دیرینہ داستان کا ایک حصہ ہے۔

گورکھپور کے بعد وہ اعلی تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے بی اے اور ایم اے کی اسناد لیں۔ بعد ازاں تعلیمات میں پی، ایچ ڈی کی۔ تکمیل کے بعد اعظم گڑھ واپس آ گئے اور تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک شبلی اسکول بعد ازاں شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ میں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ یہاں ان کی ملازمت مستقل نہیں ہوئی اس لئے مالٹاری پی، جی، کالج اعظم گڑھ میں جب مستقل ملازمت ملی تو وہاں چلے گئے۔ جہاں ترقی کر کے صدر شعبہ تعلیمات وتربیت اساتذہ مقرر ہوئے۔ اور یہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ پھر بقیہ زندگی اپنے گاؤں میں گوشہ نشینی اور علم وادب کی خدمت میں گذاری۔

ان سے شبلی اسکول رکالج اور مالٹاری پی جی کالج میں بہت سے طلبہ نے استفادہ کیا چونکہ وہ طلبہ سے حد درجہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اس لئے طلبہ بھی ان سے بہت مانوس رہے۔ ان میں ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طبقہ میں یکساں مقبول اور ہر دلعزیز رہے۔ ان کے بعض تلامذہ بڑے عہدوں پر فائز ہوئے جو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے دعائیں لیتے تھے۔ علاقہ میں بھی ان کا بڑا ادب واحترام تھا۔ ابتداء میں وہ بڑے سوشل تھے اور لوگوں سے عام تعلق تھا۔ بلریا گنج کے حکیم محمد ایوب [۱۹۲۴-۲۰۰۴ء] اور دیگر ممتاز لوگوں سے گہرے روابط تھے۔ ان بزرگوں نے جب جامعۃ الفلاح کی تاسیس کا منصوبہ بنایا تو ڈاکٹر صاحب بھی اس میں شریک رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جامعۃ الفلاح کے رکن تاسیسی قرار پائے۔ چنانچہ اس کی تعمیر وترقی میں انہوں نے بھی حصہ لیا اور آخر دم تک اس سے وابستہ رہے اور اپنے تجربات سے اس کو فائدہ پہنچاتے رہے۔

وہ جب تک اعظم گڑھ شہر میں مقیم رہے یہاں کے اداروں اور ان کے ذمہ داروں سے گہرے مراسم رہے۔ جامعۃ الرشاد میں حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] سے انہیں خصوصی شغف تھا اور ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے۔ اپنی ایک تحریر میں مولانا الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء]، علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء]، علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] اور

مولانا ابوالاعلی مودودی [۱۹۰۳-۱۹۷۹ء] کے ساتھ ان سے بھی متاثر ہونے کی صراحت کی ہے۔ مولانا مرحوم بھی ان سے بہت مانوس تھے۔ ان کی وفات پر ڈاکٹر صاحب نے جو مرثیہ کہا ہے وہ اسی محبت کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میری واقفیت بھی یہیں حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی کی مجلسوں میں ہوئی اور پھر ان کی وہ شفقتیں میرے حصہ میں آئیں جو بہت کم لوگوں کو ملی ہوں گی۔ اللہ تعالی بخشے، بڑی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

ان کا دارالمصنّفین، ماہنامہ معارف اور مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی وفات پر بھی ڈاکٹر صاحب نے ایک نظم لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے جو ان کے مجموعہ کلام ''غبار شیشہ ساعت'' میں شامل ہے۔ ماہنامہ معارف کے تو وہ ایک شاعر ہی تھے۔ اکثر ان کی غزلیں اور کبھی کبھی نعت اس کے صفحات کی زینت بنتی تھیں۔

اعظم گڑھ شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے عہد شباب میں یہاں کی شعری مجلسوں میں مرزا احسان احمد [۱۸۹۶-۱۹۷۲ء]، رحمت الٰہی برق اعظمی صدیقی [۱۹۱۱-۱۹۸۳ء] منیف اعظمی، امجد علی غزنوی [۱۹۱۶-۱۹۹۶ء] اور ضیاء الرحمٰن اعظمی [۱۹۳۷-۲۰۱۰ء] وغیرہ کے ساتھ ڈاکٹر ابرار اعظمی صاحب بھی شریک ہوتے تھے اور اپنا کلام سناتے۔ ایک بار بتایا کہ صبح غزل اور شام افسانہ کے نام سے بھی پروگرام شروع کئے گئے تھے، مگر وہ زیادہ دن تک چل نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب مشاعروں کے شاعر نہ تھے اور نہ اس میں شریک ہوتے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کا بیشتر مخاطب خود ہی ہوتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب تعلیمات کے مرد میداں اور پی، ایچ ڈی، تھے۔ انہوں نے ایک غیر مسلم استاذ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ ان کی تعلیمی مہارت کے واقعات اکثر سنایا کرتے تھے اور اپنے استاذ کا ذکر اس محبت اور احترام سے کرتے تھے کہ گویا ان سے بڑا ماہر تعلیم کوئی ہوا ہی نہیں۔ دراصل گذشتہ صدی میں اساتذہ اور طلبہ کا یہی رشتہ تھا جو ہمارے زمانہ میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ سال اپنے اساتذہ کا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا جو پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ محض نظر ثانی کرنا باقی رہ گیا تھا۔ یہ سلسلہ دراصل میری خود نوشت لکھنے کی فرمائش پر انہوں نے

شروع کیا تھااوراپنے اساتذہ کے حالات اس طرح قلم بند کئے تھے کہ خودان کے ابتدائی تعلیمی سفر کے حالات وواقعات اس میں آ گئے ہیں۔خدا کرے وہ ضائع نہ ہواور شائع ہو جائے۔

تعلیم وتربیت اور تعلیمات سے اس قدر لگاؤ کے باوجوداردوزبان وادب ان کے دل و دماغ میں ایسا رچ بس گیا تھا کہ تادم واپسیں وہ اسی کی زلفوں کے اسیر رہے۔تین شعری مجموعوں جوہرآئینہ، پرستش وعقیدت اورغبارشیشہ ساعت کے علاوہ درج ذیل کتب و رسائل ان کے قلم سے شائع نکلے:

مائیکرو ٹیچنگ (پی ایچ، ڈی کا مقالہ، غیرمطبوعہ) آیئے قرآن پڑھیں،شاہراہ قرآن (ترجمہ)، تلخیص شمائل ترمذی، نثر پارے، وہ ایک رات اور دوسرے افسانے، بازیافت۔گل بوٹے (غیرمطبوعہ) جواب نظم ونثر کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔میرا تعلیمی سفر (غیرمطبوعہ) وغیرہ

انہیں فارسی زبان وادب پر بھی بڑا عبور تھا۔فارسی شعرا کا کلام توان کے نوک زبان رہتا تھا۔اکثر فارسی اشعار سناتے اور پھراس کی تشریح بھی کرتے۔یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ اردو و فارسی انہوں نے کہاں اور کس سے پڑھی تھی مگر اردووفارسی پر انہیں عالمانہ دسترس حاصل تھی۔ان کی شاعری ،مضمون نویسی، افسانہ نگاری اور تراجم کا آغاز میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور کے زمانہ طالب علمی میں ہوا۔آپ اس سے ان کی اٹھان کا اندازہ کر سکتے ہیں۔دراصل وہ بچپن سے بہت ذہین تھے۔

۱۹۸۲ء میں ان کا پہلا مجموعہ''جوہرآئینہ'' محترم شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔یہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۲ء تک کے کلام کا انتخاب ہے۔فاروقی صاحب نے اس وقت ان کی شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔پہلی بات یہ کہ

> ''ابرار اعظمی کی شاعری جدید شاعری کی پیدا کردہ تمام مسائل کی آئینہ دار ہے۔ وہ اظہار ذات کی منزلوں کے مسافر ہیں۔ان کی داخلی شخصیت مادی دنیا کے مظاہر سے قدم قدم پر متصادم ہے۔اس تصادم کے نتیجہ میں روحانی انتشار اس درجہ کارفرما ہوتا ہے کہ یہی انتشار شخصیت کے نقاب کا کام کرتا ہے۔ان کے

کلام میں واحد متکلم جس شدت سے جلوہ گر ہے اور جس طرح کے کرب سے
گذارا گیا ہے کہ یہ عظیم الشان بکھراؤ کسی ایسی گھٹن کی نقاب تو نہیں جس میں
لفظی اظہار ہی نہیں بلکہ جذباتی اظہار کی راہیں بھی مسدود ہیں۔''

دوسری بات یہ کہ:

''ابرار اعظمی شعر کی روایتی سلاست اور روانی کے بجائے ایسے طرز
اظہار میں یقین رکھتے ہیں جس میں الفاظ ایسی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں
جسے بعض نقادوں نے Intension کا نام دیا ہے، یعنی داخلی تناؤ جس میں
لفظی مفہوم سے زیادہ اس مفہوم کی قدر ہوتی ہے جو الفاظ اور اس کی پیدا کردہ
آوازوں کی Pattern سے جنم لیتا ہے۔''

پیکر کا استعمال ابرار اعظمی کے یہاں مختلف طرح حیات کو آپس میں
گڈمڈ کر دینے سے عبارت ہے۔ یہ وہ طریقہ کار ہے جو مشرق و مغرب کے
جرات مند شعرا اپناتے رہے ہیں۔ چنانچہ خوشبو سونگھنے کے بجائے سننا، رنگ
دیکھنے کے بجائے محسوس کرنا، جہات کے ادغام کی ایسی کوششیں تخیل پرست
شعراء کے یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک خوب صورت مثال بابا فغانی کا یہ
شعر ہے جس میں بوئے گل کے لئے شنیدن کا مصدر آ رہا ہے:

مقصود صحبت است زگل ورنہ بوئے گل
انصاف گر بود ، زصبا می تواں شنید

اپنے موقف کی تائید میں فاروقی صاحب نے ان کے چند اشعار بھی درج کئے ہیں۔ اس
کے دو شعر یہ ہیں:

خیال لمس کا کار ثواب جیسا تھا
اثر صدا کا بھی موج شراب جیسا تھا

ورق نچے ہوئے سب لفظ و معنی گم سم تھے

یہ بات سچ ہے وہ چہرہ کتاب جیسا تھا

۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر صاحب کا دوسرا مجموعہ حمد ونعت ''پرستش وعقیدت'' مولانا ضیاء الدین اصلاحی [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] کی تقریظ کے ساتھ شائع ہوا اور خاصا مقبول ہوا۔ اس میں شاعری کا انداز تو وہی ہے، مگر فکر میں تبدیلی آئی ہے اور ان کی مذہبی روح نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ پرستش و عقیدت بلاشبہ بڑی خوب صورت حمد ونعت کا مجموعہ ہے۔ اس کے بارے میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے لکھا ہے کہ

> ''صنائع وبدائع کے استعمال سے ابرار صاحب کی شاعری کا لطف دوبالا اور طریقہ ادا اور اظہار کی دلکشی ودلآویزی بڑھ گئی ہے۔ ابرار صاحب نے حمد و نعت گوئی کے قدیم طرز کو ترک کر کے اپنی ایک الگ روش بنائی ہے اور جس طرح ان کے انداز بیان میں جدت ہے اسی طرح ان کے تخیل میں انوکھا اور نرالا پن ہے۔''

مگر فاروقی صاحب کے یہ تاثرات ہیں:

> ''کلام میں شاعری کا عنصر عقیدے کے بوجھ تلے دب گیا ہے، یہ اور بات ہے لیکن اس کے خلوص اور شدت میں کوئی کلام نہیں۔''

یہی حقیقت بھی ہے مگر ایک دیرینہ دوست کے لئے یہ لکھنا آسان نہ تھا۔ یہ جہاں فاروقی صاحب کی حقیقت نگاری کا ایک نمونہ ہے وہیں ان کے دوست کی فراخ دلی کا مظہر بھی کہ جوں کا توں کتاب میں شامل کر لیا ہے۔

۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر صاحب کا تیسرا مجموعہ ''غبار شیشہ ساعت'' منظر عام پر آیا۔ اسے اگرچہ خود انہوں نے انتخاب کہا ہے لیکن اس میں ''جوہر آئینہ'' کی غزلوں کے انتخاب کے ساتھ نئی نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے بہترین کلام کا مجموعہ یہی ''غبار شیشہ ساعت'' ہے۔ اور اس میں ان کی شاعرانہ عظمت اور فکری وفنی کمالات کے جلوے روشن ہیں۔ خود انہوں نے صراحت کی ہے کہ اس میں ان کی شاعری کے تینوں مدارج آ گئے ہیں۔

۲۰۱۰ء کے بعد اخیر زندگی تک انہوں نے جو اشعار کہے یا نثر میں جو کچھ لکھا اسے وہ یکجا

کر چکے تھے۔ پہلے اس کا نام ''گل بوٹے'' رکھا تھا، بعد میں بدل کر ''نظم ونثر'' کر دیا۔ اس کی کمپوزنگ بھی مکمل ہوگئی تھی۔ مولانا طاہر مدنی کے ذریعہ اسے شائع ہونا تھا، مگر وہ اس وقت پس دیوارزنداں ہیں، اس لئے وہ شائع ہونے سے رہ گیا۔ خدا کرے انہیں جلدرہائی نصیب ہو۔ اب یہ مجموعہ شائع ہوکر منظرعام پر آچکا ہے۔ البتہ ان کے اساتذہ پران کی جوتحریر غیرمطبوعہ ہے وہ اشاعت کی منتظر ہے۔ ہماری نگاہیں مولانا طاہر مدنی صاحب کی طرف لگی ہوئی ہیں، اسی طرح سے جس طرح نظم ونثر کے لئے لگی ہوئی تھیں جسے انہوں اہتمام سے شائع کیا ہے۔

ابراراعظمی مرحوم جدیدلب ولہجہ کے نمائندہ شاعر تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی مثال آپ تھے۔ تحقیق وتنقیداورشعروادب میں ان کے آئیڈیل فاروقی صاحب تھے اوروہ ان کے نزدیک سب سے بڑا نمونہ تھے۔ ان کی علمی وادبی ہرگفتگوفاروقی صاحب سے شروع ہوکر انہیں کے کارناموں پرختم ہوتی تھی۔ وہ شب خون کے ابتدائی اور بنیادی اہل قلم میں سے تھے اوراس میں چھپنا معراج کمال تصور کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ معارف، ماہنامہ آجکل، ماہنامہ ایوان اردو ہفت روزہ ہماری زبان اور بعض دوسرے رسائل میں بھی ان کا کلام اورمضامین چھپتے تھے، لیکن ان کامحبوب اور پسندیدہ رسالہ شب خون الہ آباد ہی تھا۔ اس کے بند ہونے پراوروں کے ساتھ انہیں بھی بہت قلق ہوا تھا۔

انہوں نے فاروقی صاحب پرکئی مضامین لکھے۔ نثرپارے اورارمغان فاروقی میں ان کے عمدہ مضامین شامل ہیں۔ ایک مضمون کاعنوان ہے ''بہترنشترمیر کےنہیں فاروقی کے''۔ یہ اور بعض دوسرے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فاروقی صاحب کے سچے دوست ہی نہ تھے بلکہ ان کے ایک بڑے قاری اور بڑے فاروقی شناس تھے۔ ایسی ٹوٹ کرمحبت کرنے والے کم ہی لوگوں کے نصیب میں آتے ہیں۔ فاروقی صاحب کے حوالہ سے ان کی ایک کاوش ہمیشہ یادرکھی جائے گی اور وہ ہے ''بازیافت'' اوراس کا دیباچہ۔ بازیافت فاروقی صاحب کی طالب علمی کے ایک ناولٹ، ایک افسانہ اورایک غزل پرمشتمل ہے۔ یہ نوادرانہوں نے دورطالب علمی سے محفوظ رکھے تھے اور انہیں بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ فاروقی صاحب اور جمیلہ فاروقی کے لئے انہوں نے جواشعار کہے ہیں وہ بھی لائق ذکر ہیں۔ فاروقی صاحب پران کےاشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ ایک شخص جو مجھ سے خفا بھی رہتا ہے
اسے جفامیں خیال وفا بھی رہتاہے

متاع ذہن پہ شب خون مارتاہے کبھی
کہ نقد جاں لئے حاضر سدا بھی رہتا ہے

بہت ہے بعد مکانی پر اس کو کیا کیجئے
وہ میرے گوشہ دل میں چھپا بھی رہتا ہے

اسے بھلانا بھی چاہوں بھلا نہیں سکتا
کہ میرے ذکر پہ وہ کچھ فدا بھی رہتا ہے

دیگراشخاص کے حوالہ سے بھی ان کی کئی تحریں ان کے مجموعہ مضامین ''نثر پارے'' میں شامل ہیں۔علامہ اقبال پرانہوں نے جومقالہ ''اقبال کا کلام منسوخ'' کے عنوان سے لکھا ہے وہ ان کی محققانہ بصیرت کاایک نمونہ ہے۔غالب[۱۷۹۷-۱۸۶۹ء]،حالی اورشبلی کےتو بڑے پرستار تھے۔ان کے شعری مجموعوں کا آغاز غالب کے اشعار سے ہوا ہےاور پہلے مجموعہ کلام ''جوہرآئینہ'' کا نام بھی غالب کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔جبکہ ''غبارشیشہ ساعت'' بیدل[۱۶۴۴-۱۷۲۰ء] کے شعر سے ماخوذ ہے۔

اپنے احباب میں انہوں نے پروفیسر کبیراحمد جائسی[۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] کا ذکر بھی بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ڈاکٹر افغان اللہ خاں اوربعض دوسروں کے تذکرے بھی قابل ذکر ہیں۔اس طرح کے ان کے تمام مضامین ومقالات،خطوط وخطبات اور دیباچوں کا مجموعہ ''نثر پارے'' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔''نثر پارے'' نہ صرف مضامین میں تنوع کے لحاظ سے قابل ذکر ہے بلکہ خوب صورت نثر کا بھی ایک شہ پارہ ہے۔وہ کم لکھتے تھے،مگر جب لکھتے تھے بڑی خوب صورت اوردلکش نثر لکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کوایک مومن کی طرح قرآن پاک سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ان کا خیال تھا کہ اس کا مطالعہ عام ہونا چاہئے۔چنانچہ انہوں نے اس کی طرف لوگوں کو راغب کرنے کے لئے ایک رسالہ ''آیئے قرآن پڑھیں'' لکھا اور اسے کئی بار شائع کرا کے تقسیم کیا۔اس میں قرآن پاک کی عظمت بیان کرنے کے ساتھ تفہیم قرآن کی اہمیت کی بھی وضاحت کی بڑے سہل اور دل نشیں انداز میں کی ہے۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے مذہبیات کا مطالعہ بھی بڑی گہرائی سے کیا تھا۔

مولانا کرامت علی جون پوری [م:۳۰رمئی۱۸۷۳ء] کے شمائل ترمذی کے اردو ترجمہ کو استاذی مولانا مجیب اللہ ندوی[۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] نے شائع کیا تو افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر ابرار اعظمی نے اس کی تلخیص کی اور ''تلخیص شمائل ترمذی'' کے نام سے ۲۰۰۱ء میں شائع کی۔ جسے علماء کے حلقے میں سراہا گیا۔اس میں دراصل سیرت نبویؐ بالخصوص شمائل نبویؐ کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلنواز شخصیت کا ایک خوب صورت مرقع سامنے آجاتا ہے۔اس کا تعارف اپنے دوست ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی[۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] لکھوایا ہے۔

چند سال پہلے ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوا کہ نئی نسل بالخصوص نوجوانوں میں انقلاب سیرت نبویؐ ہی سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔اس کے لئے انہوں نے ایک بڑا وسیع منصوبہ بنایا اور اس کا خاکہ تیار کرکے اہل علم اور اخبار ورسائل کو بھیجا۔خیال یہ تھا کہ تمام مدارس ومکاتب کے طلبہ سے سیرت نبویؐ کے مختلف موضوعات پر ہر سال مقالہ لکھوا جائے اور جو مقالات منتخب ہوں انہیں انعامات سے نوازا جائے۔اس کے لئے انہوں نے اپنی جیب سے ایک بڑی رقم مختص کی۔ چنانچہ یہ مقابلے ایک دوبار منعقد ہوئے۔اور بچوں کو انعامات دئے گئے۔انعامات کی تقسیم کے لئے جامعۃ الفلاح میں تقریبات منعقد ہوئیں۔جس میں متعدد اہل علم اور علماء نے شرکت کی۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ناچیز راقم نے بھی شرکت کی تھی۔مولانا طاہر مدنی صاحب نے اسے کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔امید ہے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔اور یہی مرحوم کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔

گذشتہ سطور میں ان کی تعلیمی خدمات کا سرسری ذکر آچکا ہے،اس سلسلہ کا ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے جامعۃ الفلاح کو مرکز بنا کر مدارس کے اساتذہ کی جدید تعلیمی

اصولوں کی روشنی میں تدریسی تربیت کے لئے ایک وسیع منصوبہ بنایا۔اس کے لئے ایک تعلیمی نصاب بنا کر امتحانات اوراسناد کا ایک مکمل نظام ترتیب دیا۔مگر بوجوہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا،لیکن جب کبھی مدارس میں تربیت اساتذہ کی اہمیت محسوس کی جائے گی اس وقت اس منصوبہ کی افادیت بھی محسوس کی جائے گی۔

ڈاکٹر ابرار اعظمی کی تعلیمی خدمات کا اعتراف علی العموم کیا گیا۔ڈاکٹر ابرار اعظمی ایکسی لینس گولڈ میڈل مرزا احسن اللہ بیگ گرلز پی جی کالج انجان شہید میں ہر سال ایک ممتاز طالب علم کو دیا جاتا ہے۔اسی طرح دیانند شیشو مندر جین پور بھی ایک طالب علم کو ''ڈاکٹر ابرار اعظمی اتکرشٹ پرسکار'' کا نظم کرتا ہے۔

ڈاکٹر ابرار اعظمی کی شاعری، نثر نگاری، درس وتدریس،تعلیم وتربیت اور پھر قرآن و سیرت سے ان کی دلچسپی اور تگ ودو ان کی زندگی کے متنوع کارنامے ہیں۔جس میں وہ نہ صرف ایک بلندرتبہ ادیب وشاعر اور معلم نظر آتے ہیں بلکہ وہ اسلام کے ایک سراپا مردمومن کی صورت بھی دکھائی دیتے ہیں۔ان کی زندگی نشیب وفراز کے متنوع واقعات کا مجموعہ ہے مگر وہ کسی مرحلہ میں مایوسی اور اضمحلال کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ایک مردمومن کی طرح ہوش مندی اور سلامت روی کے ساتھ گذر گئے۔داخلی زندگی کے مسائل اور مشکلات کو خارجی زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب زندگی اور حوصلہ مندی کا ایک استعارہ تھے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ناچیز راقم پر بھی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ان کی آخری کتاب نظم ونثر کا انتساب غایت تعلق کی بنا پر ناچیز کے نام کیا ہے۔میری بیوی شائستہ کو بیٹی بنا رکھا تھا اوراس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔میری والدہ کے انتقال پر انہوں نے جو تعزیتی نظم کہی ہے جو ان کے مجموعہ نظم ونثر میں شامل ہے اس سے ہم دونوں سے گہرے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے انتقال سے ہم میں یتیمی کا احساس ہوا۔اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے۔

•••

ڈاکٹر مختار شمیم کی یاد میں

۲/دسمبر ۲۰۲۰ء کو اردو کے ممتاز ادیب، شاعر اور نقاد ڈاکٹر مختار شمیم نے بھوپال میں رخت سفر باندھا اور راہی ملک عدم ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اگر چہ شوگر کے مریض تھے، مگر صحت بحیثیت مجموعی اچھی تھی۔ یکا یک بیمار ہوئے۔ ایک ہفتہ اسپتال میں رہے۔ خدا جانے کون سا مرض لاحق ہوا کہ ڈاکٹروں نے ان کی زندگی سے مایوسی کا اظہار کر کے آکسیجن کے ساتھ گھر بھیج دیا اور پھر وہ جاں بر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حق مغفرت کرے۔

ڈاکٹر مختار شمیم کا وطن سیرونج تھا۔ وہیں ۲۳/ مارچ ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والدہ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے۔ والد کی زیر تربیت رہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بھوپال آئے۔ ایم اے تک کی تعلیم یہیں حمیدیہ کالج بھوپال میں حاصل کی۔ یہاں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر گیان چند جین [۱۹۲۳-۲۰۰۷ء]، ڈاکٹر ابو محمد سحر [۱۹۲۸-۲۰۰۲ء] اور ڈاکٹر آفاق احمد [۱۹۳۲-۲۰۱۶ء] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں وہ خاص طور پر ڈاکٹر ابو محمد سحر مرحوم سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کے بہت قریب رہے۔ انہوں نے بھی بڑی شفقت فرمائی۔ جسے ڈاکٹر مختار شمیم نے ہمیشہ یاد رکھا اور بقول ضیاء فاروقی صاحب وہ ڈاکٹر ابو محمد سحر سے پیرو مرشد کی طرح محبت کرتے تھے۔ انہیں کی زیر نگرانی انہوں نے ظہیر دہلوی [۱۸۲۵-۱۹۱۱ء] پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی تھی۔ اپنے استاذ سے ان کی زندگی میں ربط و تعلق تو رکھا ہی بعد از مرگ ان کے ورثا سے بھی تعلقات کو نبھایا۔ ان پر متعدد مضامین لکھے۔ ان کی دو اہم کتابوں ''غالبیات کے چند مباحث'' اور ''غالب اور ہم'' کو یکجا کتابی صورت میں شائع کرانے میں بھی ان کا حصہ ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ابو محمد سحر کے نام مشاہیر کے خطوط کو مرتب کر کے دو جلدوں میں شائع کرایا۔ اس کی دوسری جلد ابھی

حال میں اسی سال شائع ہوئی تھی۔ یہ تحفہ اپنے احباب میں ابھی تقسیم بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کا وقت آخر آپہنچا۔ مجھے بھی انہوں نے یہ کتاب بھیجنے کو لکھا تھا،مگران کی بیماری نے اس کی مہلت نہیں دی۔آج ان کی وفات پرغم زدہ ہوکر جب میں نے اپنے ذاتی کتب خانہ میں ان کی کتابیں تلاش کیں تو ان کی مرسلہ کئی کتابیں نکل آئیں اوران پران کے جو یادگار جملے ہیں وہ راقم سے ان کی محبت کے شاہد رہیں گے۔ضیاء فاروقی صاحب نے بتایا کہ وہ آپ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔سچ تو یہ ہے کہ جب سے ان سے تعلق ہوا میں بھی انہیں یاد کرتا رہتا تھا۔افسوس ایک مخلص اور سنجیدہ ادیب ہمارے درمیان سے رخصت ہوا۔

ڈاکٹر مختار شمیم تحصیل علم کے بعد ۱۹۷۰ء میں گورنمنٹ کالج میں لکچرر ہوئے۔مختلف مقامات پرملازمت کی۔ اندور میں زیادہ دنوں تک انہوں نے ملازمت کی۔ ترقی کرکے وہ پروفیسراور پی جی کالج کے پرنسپل کے عہدہ پر پہنچے۔اوراپنی ایمان داری، اصول پسندی،حسن اخلاق اورفہم وشعور کے سبب نیک نام رہے اوراسی نیک نامی کے ساتھ ۲۰۰۷ء میں سبکدوش ہوئے۔گوبعض انسان دشمن عناصر نے انہیں پریشان بھی کیا بلکہ ایک بارتو ان پر جان لیوا حملہ بھی ہوامگر وہ یہاں بھی زندگی کے دوسرے مراحل کی طرح ثابت قدم اورسرخ رو رہے۔وہ بچپن سے آخر تک زندگی کی شاہراہوں پر بڑے سخت اورصبر آزما مراحل سے گذرے۔۲۲رسالہ رفاقت کے بعدوفا شعار بیوی کی وفات، والد کا سانحہ وفات،عزیز بیٹی کا حادثہ طلاق۔نہ جانے کیسے کیسے سخت، تکلیف دہ،صبر آزما، دشوار گذاراوررنجیدہ کردینے والے مراحل آئے،مگر وہ صابروشاکراورثابت قدم رہےاورثابت قدمی سےان کا مقابلہ کیا،اوراسی ثابت قدمی کےساتھ وہ سوئے جنت روانہ ہوئے۔سیرت تو اچھی تھی ہی شکل وصورت بھی خوش نمااور جاذب نظرتھی۔چہرے پرہلکی سی داڑھی اور پیشانی پرنماز کی نشانی نے ان کے چہرے کاحسن اور بڑھادیا تھا۔

ان میں بچپن ہی سے ادبی جوہر پائے جاتے تھے۔افسانے،شاعری اورتنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز دورطالب علمی ہی میں ہوگیا تھااور یہ سلسلہ آخرتک باقی رہا بلکہ دورطالب علمی سے آخر تک اس میں خوب سے خوب تر کی سعی وکوشش انہوں نے جاری رکھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ آخرتک خودکوطالب علم تصور کرتے رہے۔حالانکہ وہ ایک بالغ نظراورصاحب شعورادیب ونقاد تھے۔اس

کی بہترین مثال تو ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ''ظہیر دہلوی حیات وخدمات'' ہے لیکن ان کے تنقیدی مضامین بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں بلکہ موضوعات کے تنوع، مطالعہ کی وسعت اور فکر کی گیرائی نے ان کی تنقیدی تحریروں میں تعمق پیدا کر دیا ہے۔ان کے ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''تناظر وتشخص'' اور ''سوادحرف'' خود انہوں نے احباب کی خواہش پر شائع کرائے۔ ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری'' بھی ان کا ایک اہم کام ہے۔افسانوں کا بھی ایک مجموعہ ''پس غبار'' [مط: ۱۹۸۰ء] شائع ہوا ہے، مگر پھر انہوں نے افسانہ نگاری سے توجہ ہٹالی تھی۔ البتہ شاعری اور نثر نگاری سے ہمیشہ سروکار رکھا اور ان کی شخصیت کا اصل خاکہ انہی سے بنتا ہے۔ اور انہی دونوں میدان میں ان کے نقوش یادگار رہیں۔

ان کا تحقیق کا مذاق اور شعور بھی بڑا پختہ تھا۔اس سلسلہ میں میری جب بھی ان سے گفتگو ہوئی میں نے ان کے غور وفکر کے انداز میں ایک انفرادیت محسوس کی۔تحقیق کا دوسرا نام مسلسل غور و فکر یعنی خون جلانا ہے۔ یہ کام بھی انہوں نے صلہ وستائش کی پرواکئے بغیر جاری رکھا۔تحقیقی مضامین کے علاوہ ان کی کتاب ''مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق'' [مط: ۲۰۱۴ء] اگر چہ مقالات کا مجموعہ ہے اور ریاست مدھیہ پردیش سے متعلق امور تحقیق اور محققین مختلف انداز میں زیر بحث آئے ہیں تاہم یہ بھی ان کے تحقیقی مزاج کا ایک نمونہ ہے۔ بالخصوص اس کی تقدیم سے ان کے تحقیقی شعور کی ایک جھلک ضرور سامنے آتی ہے۔

شاعری انہوں نے دور طالب علمی ۹-۱۰ ر برس کی عمر میں شروع کر دی تھی اور نثر نگاری کے ساتھ مدۃ العمر یہ شغل سخن جاری رہا۔البتہ اخیر دور میں ان کی تمام تر توجہ نثر کی جانب زیادہ ہوگئی تھی۔ تاہم ان کے مجموعہ ہائے کلام ''نامہ گل'' [مط: ۱۹۷۸ء]، ''دریچہ گل'' [مط: ۱۹۸۴ء]، ''حرف حرف آئینہ'' [مط: ۱۹۸۶ء] اور ''ہجر کی صبح، ہجر کی شام'' [م: ۲۰۱۵ء] ان کے نہ صرف طویل شعری سفر کے پڑاؤ ہیں بلکہ ان کے شاعرانہ عظمت کے خوب صورت نمونے بھی ہیں۔ انہوں نے غزلیں نظمیں، آزاد نظمیں کئی اصناف میں داد سخن دی اور کمال تو یہ ہے کہ ہر صنف سخن میں ارباب کمال نے اعتراف کمال کیا ہے۔ان کے ابتدائی دور کے مداحوں میں کمال احمد صدیقی [۱۹۲۶-۲۰۱۳] اور ڈاکٹر مظفر حنفی [۱۹۳۶-۲۰۲۰ء] کے نام قابل ذکر ہیں۔

مرحوم نے مجھے اپنا آخری مجموعہ کلام ''ہجر کی صبح، ہجر کی شام'' بھیجا تھا۔ آج اسے دوبارہ دیکھا تو اس کی پہلی ہی نظم نے ذہن ودل کو ساکت کر دیا۔ اور ہجر وفراق یار کے ایسے آنسوؤں سے ہم کنار کیا کہ میں اس کا ذکر نہیں کر سکتا۔ نقادوں کا یہ خیال رہا ہے کہ کسی تخلیق کا پس منظر بہت اہمیت رکھتا ہے، مگر مجھے نقادوں کی اور بہت سی باتوں کے اس بات سے بھی اختلاف رہا ہے کہ پس منظر بدل جاتے ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں شاعری کے معنی ومفہوم بھی اکثر وہ نہیں ہوتے جو تخلیق کار کے زمانہ تخلیق میں تھے۔ اس لئے شاعری کے مطالعہ وتجزئے میں عہد وماحول کا صحیح صحیح تجزیہ اور تعین ضروری ہے۔ خود مرحوم ڈاکٹر مختار شمیم کے آخری شعری مجموعہ ''ہجر کی صبح ہجر کی شام'' کی پہلی نظم ان کے دنیا سے جانے کے بعد زیادہ معنی خیز ہوگئی ہے۔ شاید بڑی شاعری کی یہ بھی ایک شناخت ہے۔

۲۰۱۳ء میں میری ایک کتاب ''شبلی: سخنوروں کی نظر میں'' شائع ہوئی تھی۔ پروفیسر مختار شمیم صاحب نے اس سے بڑی دلچسپی لی۔ علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے ایک مکتوب الیہ اوران کے وفیاتی قطعہ نگار مولوی سید احمد مرتضیٰ نظر [۱۲۹۶-۱۳۶۱ھ، ۱۹۴۲ء] مصنف ''صولت شیر شاہی'' [م: ۱۹۲۴ء] کے حالات اور علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] سے متعلق ان کی غیر مطبوعہ فارسی نظم انہیں نے فراہم کی تھی۔ وہ ان کے عزیز تھے۔ ان پر انہوں نے ایک کتاب بھی شائع کرائی تھی۔ نظر مرحوم اردو وفارسی کے ایک بڑے اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا غیر مطبوعہ مجموعہ کلام ''تجلیات نظر'' بھی محفوظ تھا، جسے وہ شائع کرانے کے لئے فکرمند تھے۔

پروفیسر مختار شمیم سے علمی وادبی معاملات بالخصوص نایاب کتب ورسائل کے سلسلہ میں بارہا خط وکتابت ہوئی، مگر ان کے خطوط محفوظ نہیں رہے۔ ۲۰۱۷ء میں جب میں نے اپنے نام کے خطوط ''محبت نامے'' کے نام سے شائع کئے تو اس وقت ان کا کوئی خط دستیاب نہیں ہوا تھا۔ البتہ بعد میں ایک خط جس میں انہوں نے مولوی سید احمد مرتضیٰ نظر کی علامہ شبلی سے متعلق فارسی نظم کی تصحیح کی تھی وہ ہاتھ آ گیا ہے۔

محترم محمد الیاس اعظمی صاحب

سلام مسنون

''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' یقیناً آپ کا اہم تحقیقی کام ہے اور اپنی
نوعیت کی یہ ایک منفرد کتاب ہے۔مبارک باد
آپ سے ٹیلیفون پر گفتگو کے بعد خیال آیا کہ فارسی متن کو ایک بار پھر دیکھ لیا
جائے۔اصل سے ملا کر دیکھا تو کمپوزنگ کی غلطیاں سامنے آئیں۔آپ اپنے
ریکارڈ میں رکھ لیجئے تا کہ اگلے ایڈیشن میں یہ صفحہ کارآمد ثابت ہو۔ایک ہفتہ
سے میرا قیام سرونج میں ہے۔انشاءاللہ کل پرسوں بھوپال پہنچ جاؤں گا۔
امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔خاکسار

مختار شمیم

۲/جون۲۰۱۲ء

ہندوستان کے اہم تاریخی شہروں میں علمی،ادبی اور تاریخی ہر لحاظ سے بھوپال ایک اہم شہر ہے بلکہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس کے بار احسان سے شاید ہی کوئی اہل علم یا حلقہ اہل علم وفن سر اٹھا سکے۔بیگم سلطان جہاں [۱۸۵۴-۱۹۳۰ء] کی ملی حمیت،اسلامی غیرت،علم نوازی اور معارف پروری نے ملک کے ایک بڑے حلقے کو بھوپال نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔انہی میں ایک شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کی ذات بھی تھی۔ان کے اس شہر سے گوناگوں روابط رہے۔اس حوالہ سے ناچیز اکثر پروفیسر مختار شمیم سے بھوپال کی شخصیات اور ان کے حالات و واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ بڑی شفقت و محبت اور محنت و تحقیق سے تلاش کر کے بھیجتے۔اس پر انہیں کسی قسم تکدر نہیں ہوتا۔وہ ایسے سیر چشم تھے کہ اپنی کتابیں تو انہوں نے بھیجیں ہی بعض دوسرے اہل قلم کی بھی کتابیں بھیجیں۔ڈاکٹر لبنیٰ ادریس کی کتاب ''سید احمد مرتضیٰ نظر'' انہی نے بھیجی تھی۔جس سے سید مرتضیٰ نظر اور علامہ شبلی کے روابط کی تفصیل قلم بند کرنے میں مدد ملی۔اس کے علاوہ بھی بعض ادبی کتب بھیجیں۔

ان کا مزاج طلبہ،اساتذہ اور دیگر اہل علم سے بھی تعاون کا تھا۔وہ مجھ سے بہت سینئر تھے۔۷۵/سال کی عمر میں بھی وہ اپنے سے ہر اعتبار سے چھوٹے شخص کے علمی و ادبی تعاون سے گریز نہیں کرتے۔واقعہ یہ ہے کہ خاموشی سے علم و ادب کی خدمت میں وہ سکون محسوس کرتے تھے۔کہیں خودنمائی ان کی ذات میں میں نے محسوس نہیں کی۔زندگی کے بہت سے رنگ انہوں نے

دیکھے، مگر کبھی وہ مضطرب نہیں ہوئے۔ البتہ ان کی شاعری میں زمانہ کی گردشوں سے پیدا شدہ اضطراب ضرور نظر آتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ غبار دل و جاں بھی نہ دکھاتے تو شاعری کیا کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں بہت سے رنگ ہیں مگر ہر رنگ میں ان کی ذات کا پرتو کسی نہ کسی شکل میں ضرور آ گیا ہے۔ راقم شعروادب کا ادنی طالب علم ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے بارہ میں یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ آیا وہ نظمیں اچھی کہتے تھے یا غزلیں۔ مجھے دونوں نے متاثر کیا۔ شاید محبت کی نگاہ نقادوں کی نگاہ سے اسی لئے فروتر خیال کی جاتی ہوگی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ کسی شاعر کا تمام تر کلام متاثر کن ہوتا بھی نہیں۔ ورنہ انتخاب کی روایت کیوں کر رواج پاتی۔

بہرحال ان کا مذاق خالص ادبی تھا۔ وہ عہد شباب سے دور اخیر تک ہمیشہ شعروادب سے والہانہ وابستہ رہے۔ سیرونج میں ادبی فضا پیدا کرنے سے لے کر اپنے طلبہ و طالبات میں مذاق شعروادب پیدا کرنے تک۔ اور آخر میں بھوپال کی ادبی محفلوں میں ان کی حصہ داری ان کی فطری ادب نوازی اور شعروادب سے گہری وابستگی کا ثبوت ہیں۔ ان کا ادب، ان کی ادبی مشغولیات، ان کی تصنیفات و تالیفات ان کے ستھرے ہوئے ادبی دیوانگی کا نمونہ ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ان کی سیرت و شخصیت اور گراں قدر خدمات کا جائزہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس پر کم از کم دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو مرحوم کے ادب، نظریہ ادب اور ان کے فکر وفن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔ تاہم ان پر ابھی اور لکھا جائے گا۔ ابھی انہیں اور پڑھا جائے گا۔ اور جیسے جیسے وقت گذرے گا ان کی کمی ادبی حلقوں محسوس ہوگی، بالخصوص سیرونج اور بھوپال کو زیادہ شدت سے محسوس ہوگی بلکہ کھلے گی۔ میں کل صبح سے اب تک انھیں بارہا یاد کر چکا ہوں، مگر ان کی یاد بار بار آ کر تڑپا دیتی ہے۔ انہوں نے مجھ سے جس طرح بے لوث اور بےغرض تعلق رکھا اور نبھایا میں ان کی اس نیکی، شرافت، مروت کو کبھی فراموش نہ کرسکوں گا اور جو محبتیں ان سے مجھے ملیں وہ ان کی ہمیشہ یاد دلاتی رہیں گی۔

اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس عطا کرے۔

پروفیسر حنیف نقوی۔ چند یادیں

دارالمصنّفین کے سابق ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] کے زمانہ نظامت میں جب کوئی ادیب، شاعر یا نقاد بطور مہمان دارالمصنّفین آتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ہم لوگوں کو اپنے پاس بلا لیتے اور ایک دوسرے کا تعارف کراتے۔ ہم لوگ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھتے اور پھر واپس آجاتے۔ دارالمصنّفین کی ایسی ہی ایک مجلس میں مشہور ادیب اور نامور محقق پروفیسر حنیف نقوی [۱۹۳۶-۲۰۱۲ء] سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔

راقم نے ایم اے کے زمانہ میں اپنی تمام تر کمزوریوں اور نااہلیوں کے باوجود پی ایچ، ڈی کرنے کا مستحکم ارادہ کرلیا اور وہ بھی بنارس ہندو یونیورسٹی سے۔ ایم اے سال اول کے بعد ایک روز ہم تین دوست بی ایچ یو دیکھنے بنارس پہنچ گئے۔ آنجہانی پروفیسر حکم چند نیر کا زمانہ تھا۔ وہ اردو اور اردو والوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہم لوگ ان سے ملے اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ طالب علم ہیں بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے ان سے گفتگو کے دوران اپنے ریسرچ کرنے کے ارادہ کا بھی اظہار کردیا۔ انہوں نے ایم اے کے نمبرات دریافت کئے۔ سال اول میں میرے نمبرات اچھے تھے۔ میں نے جو چند مضامین لکھے تھے ان کا بھی ذکر کردیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ایم اے کے بعد سیدھے میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں پی ایچ ڈی کراؤں گا، لیکن میرے ایم اے فائنل کے ریزلٹ سے پہلے وہ آنجہانی ہوگئے۔

ایم اے کے بعد جب بی ایچ یو بنارس پہنچا تو وہاں کرسی صدارت پر پروفیسر حنیف نقوی براجمان تھے۔ ان سے ملا تو انہوں نے بھی نمبرات دریافت کئے۔ نمبر میرے بہت اچھے تھے۔ باوجود اس کے انہوں نے یہ کہہ کر صاف منع کردیا کہ نمبر تو بہت سے لوگ حاصل کر لیتے ہیں اور یہ

بھی کہا کہ دیگر اضلاع کے لئے ایک جگہ ہوتی ہے اور جو پر ہو چکی ہے۔ یہ ان سے دوسری ملاقات تھی۔اس کے بعد وہ بار ہا دارالمصنّفین آئے ،مگر میں اکثر اس بزم سے دور ہی رہا،لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد جب وہ تشریف لائے اور مولانا کے پاس بیٹھے اور انہوں نے بلایا تو حاضر ہو گئے۔ دراصل اب نہ صرف یہ کہ ناچیز کی پی ایچ ڈی ہو چکی تھی بلکہ وہ مقالہ بھی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہو چکا تھا۔ میری بعض اور کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔جن سے وہ واقف بھی تھے۔اس دفعہ میں ان کے پاس دیر تک بیٹھا رہا۔اور ان کی اور مولانا مرحوم کی گفتگو سنتا رہا۔ جس میں ذاتی باتیں بہت کم ہی تھیں۔ادبی معاملات اور مسائل اصل موضع گفتگو تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اردو قاری ان کے موضوع کا محور تھے۔اور انہیں پر زیادہ گفتگو ہوئی۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی[۱۹۳۶-۲۰۰۸ء] کی ادبیات پر بڑی گہری نظر تھی۔وہ اگر چہ اسلامیات کے ادیب تھے،تاہم شعروادب پر پوری طرح حاوی تھے۔ مروجہ تحقیق وتنقید کے فن سے پوری طرح آشنا تھے۔اکثر ان کے ادبی مضامین آں جہانی مالک رام کے رسالہ تحریر، ماہنامہ آج کل دہلی،نیادور لکھنو، غالب نامہ دہلی وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے۔معارف میں بھی ان کے بعض ادبی تحریریں شائع ہوئی ہیں۔خاص طور پر ادیبوں اور شاعروں پر یا ان کی وفات پر جو تحریریں لکھی ہیں وہ بھی خاصے کی چیز ہیں۔

اس بار دونوں بزرگ ادیبوں کی گفتگو غور سے سنی تو بے حد متاثر ہوا۔ بلاشبہ پروفیسر حنیف نقوی صاحب میدان تحقیق کے مرد میداں تھے۔اس تاثر کے قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتب خانہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی سے جہاں پروفیسر حنیف نقوی کی تقریباً تمام کتابیں موجود ہیں،نکالیں اور مطالعہ شروع کر دیا۔تذکروں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پر ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ میں پہلے دیکھ چکا تھا جو اپنے موضوع پر ایک اہم تحقیقی اور لاجواب مقالہ ہے۔اب دوسری کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ان میں اکثر مقالات کے مجموعے ہیں۔مگر یہ مقالات اس قدر وقیع اور محققانہ ہیں کہ مستقل کتابوں پر بھاری قرار دیا جائے تو مبالغہ نہیں سمجھا جائے گا۔سب سے پہلے ''غالب: احوال وآثار'' پر نظر پڑی۔ پھر ''میر ومصحفی'' کو دیکھا۔آخر الذکر میں انہوں نے میر ومصحفی کی شاعری یا ان کی فنی عظمتوں کو قلم بند کرنے کی بجائے ان کے عہد پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ان کی تلاش وتحقیق کی داد

دینی ہوگی کہ کہاں کہاں سے موتی تلاش کر کے اور اسے ایک لڑی میں پروکر کتاب کی صورت گری کی ہے۔ یہ بجائے خود ایک منفرد رویہ ہے۔ بلکہ تحقیق کی یہ روش خود ان کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔

ان کا پہلا مجموعہ مقالات غالباً ''تلاش وتعارف'' ہے۔ یہ واقعی ان کے انتہائی اہم تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس کی سطرسطر تلاش وتحقیق سے عبارت ہے۔اس طرح کے مقالات کا لکھنا آسان کام نہیں۔ جاں کاہ محنت کے بغیر ایسے مضامین لکھے ہی نہیں جاسکتے۔ غالبیات پر ان کے چند اور مقالات کے مجموعے چھپے۔بعض کو غالب انسٹی ٹیوٹ نے شائع کیا ہے بعض کتابیں جس میں علماء وشعرا کے تذکرے ہیں قومی کونسل نے شائع کیا ہے۔ میں نے یکے بعد دیگرے ان کا مطالعہ کیا۔ان میں بعض ایسے تحقیقی ہیں کہ انہیں پڑھنے اور سمجھنے میں سرمغزنی کرنی پڑی۔واقعہ یہ ہے کہ بعض کو تو میں سمجھ بھی نہیں سکا۔لیکن ان کی ان تحقیقات نے مجھے ان کا ایسا گرویدہ اور والہ وشیدا بنادیا کہ اب جہاں کہیں ان کی کوئی تحریر نظر آتی اسے ضرور پڑھتا۔ان کے تحقیقی رویے پر اہل علم اور صاحب نظر گفتگو کریں گے، میں تو بس یہ کہوں گا کہ حافظ محمود شیرانی نے جن تحقیقی رویوں کی آبیاری کی تھی اس کے خوب صورت پھول پروفیسر حنیف نقوی نے اپنے تحقیقی چمن میں کھلائے ہیں، بلکہ ارتقائی منزلوں کے بعد جو منزل آئی ہے پروفیسر حنیف نقوی اس کے بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔

اسی طرح رجب علی بیگ سرور کے اساتذہ کی تلاش اور ان کے حالات کی تدوین دراصل ان کے منفرد روش تحقیق کا ایک نمونہ ہے۔ بہرحال نقوی کی کتابوں نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں ان کے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔اور خود میں نے اپنی تحقیقی تصنیفات میں ان سے بہت کچھ سیکھا اور اخذ کیا ہے۔ یہ الگ بات کی میری تحقیقات ان کے معیار کو ذرا بھی لگا نہیں کھاتیں۔

پروفیسر حنیف نقوی کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر سید حسن عباس صدر شعبہ فارسی بی ایچ یو نے انہیں ایک باوقار تقریب میں ارمغان علمی نذر کیا۔اس زمانہ کے ہمارے دوست ڈاکٹر شمس بدایونی نے خواہش کی کہ اس تقریب میں شرکت کے لئے میں بریلی سے آرہا ہوں، تم بھی آجاتے تو ملاقات ہوجاتی۔ میں نے سوچا ان کے ساتھ پروفیسر حنیف نقوی صاحب سے بھی ملاقات ہوجائے گی ۔بہرحال ڈاکٹر شمس بدایونی کی خواہش اور نقوی صاحب سے

ملاقات کی تمنا لئے اعظم گڑھ سے میں بی ایچ یو بنارس پہنچ گیا اور تقریب میں شریک ہوا۔ پروفیسر حنیف نقوی سے بہت مختصر سی ملاقات رہی۔ اس زمانہ میں ان سے اکثر فون سے بات ہو جایا کرتی تھی۔ اس لئے بہت ملال بھی نہیں ہوا۔ زیادہ وقت ڈاکٹر شمس بدایونی کے ساتھ رہا، لیکن جب اس کے بعد پھر کبھی نقوی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تو ملال ہوا کہ کاش میں ان کے ساتھ زیادہ رہا ہوتا اور ان سے زیادہ استفادہ کی کوشش کی ہوتی۔

اس سے کچھ پہلے میری کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' میں شائع ہوئی تھی جسے میں نے پروفیسر حنیف نقوی کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اپنی بعض اور کتابیں پہلے بھی نذر کر چکا تھا، مگر اول الذکر کتاب کو انہوں نے بہت سراہا اور کہا کہ یہ زندہ رہنے والا کام ہے اور تم یہی کام اسی انداز سے مرزا غالب پر بھی کر دو، بلکہ اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا کہ جب ان سے گفتگو ہوتی وہ اس کو یاد دلاتے اور اس کام کو جلد شروع کرنے کو کہتے۔ میں نے حامی بھی بھر لی تھی، مگر میں اس لئے شروع نہیں کر پا رہا تھا کہ میرے پیش نظر دوسرے کام تھے اور میں انہیں جلد پورا کرنا چاہتا تھا۔ افسوس میرے کام ابتک پورے نہیں ہوئے اور وہ کام میں ابتک شروع نہ کر سکا۔

میری کتاب ''مکتوبات شبلی'' شائع ہوئی تو میں نے ان کے بنارس کے پتے پر بھیجی مگر وہ ابھی پہنچی بھی نہ ہوگی کہ ان کی سناؤنی آئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت وہ اپنے وطن سہسوان ضلع بدایوں گئے ہوئے تھے۔ وہیں بیمار ہوئے اور چند دنوں کی معمولی علالت کے بعد ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۲ء کو جنت کی راہ لی۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مجھے دلی رنج ہوا۔ یہ اردو ادب بالخصوص تحقیق کے میدان کا بہت بڑا خسارہ تھا بلکہ پر نہ ہونے والا خسارہ تھا۔ بلا شبہ وہ اپنے عہد کے ایک منفرد محقق اور مایہ ناز غالب شناس تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے عہد میں انہی کے دم سے تحقیق و تدوین کی آبرو قائم تھی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

•••

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

یادیں، باتیں اور سوغاتیں

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی [۱۹۵۳-۲۰۲۰ء] نہ صرف علم وفضل میں ہم سے بلند اور فائق تر تھے، بلکہ عمر میں بھی ۱۳-۱۴ برس بڑے تھے۔ اس لئے ہم بہرصورت ان کا ادب واحترام کرتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انتہائی شریف، نیک، متواضع اور سراپا انکسار تھے، لیکن پاس ولحاظ کی سب سے بڑی وجہ ان کا علمی تبحر، انداز غور وفکر، مطالعہ ومشاہدہ، عالمانہ وقار اور قدیم وجدید کی ان کی جامعیت تھی۔ ہماری آنکھوں نے چند ہی ایسے نمونے کے انسان اور نمونے کے اہل علم دیکھے ہیں، انہی میں ایک پروفیسر ظفر احمد صدیقی بھی تھے، جنہیں اب مرحوم لکھتے ہوئے ہم رنجیدہ ہیں اور ایک متاع گراں ارز کے جلد اٹھ جانے پر ماتم کناں بھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

وہ مظاہر علوم سہارنپور اور ندوہ کے ممتاز فرزند تو تھے ہی سرزمین اعظم گڑھ کے نیر تاباں بھی تھے۔ انہوں نے درس وتدریس، تحقیق وتدوین اور تصنیف وتالیف کے مختلف میدانوں میں گراں مایہ علمی، ادبی اور تحقیقی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

ہم نے جس زمانہ میں لکھنا شروع کیا اس زمانہ میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا مقالہ ''مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار'' ہر طرف موضوع گفتگو تھا۔ چونکہ وہ مولانا اسیر ادروی صاحب [۱۹۲۶-۲۰۲۰ء] کی ادارت میں نکلنے والے مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس میں شائع ہو رہا تھا، اس لئے جب اس کی کوئی قسط چھپ کر آتی کہیں نہ کہیں اس کا ذکر آ ہی جاتا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''شبلی نعمانی حیات اور کارنامے'' پر دارالمصنّفین سے

ان کا تنازعہ ہو چکا تھا۔اس تنازعہ کے دو پہلو تھے۔ایک یہ کہ وہ مقالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] کے پاس اردو اکادمی لکھنؤ سے اس رپورٹ کے لئے آیا تھا کہ ایا وہ شائع کرنے کے لائق ہے یا نہیں؟ صباح الدین صاحب نے نفی میں رپورٹ تو دی ہی اس سے پہلے قومی آواز لکھنؤ (۱۱/اگست ۱۹۸۵ء) میں ایم ایم زبیری کا اس کے خلاف مضمون شائع ہو گیا جو بہرصورت صحیح طرز عمل نہیں تھا۔اس تنازعہ کا دوسرا پہلو علمی تھا۔یعنی اس کا محاکمہ ہونا چاہئے تھا،مگر طباعت سے پہلے محاکمے کا بھی حق نہیں تھا،لیکن جب یہ مقالہ ترجمان الاسلام بنارس میں بالاقساط شائع ہونے لگا تو اس کے خلاف متعدد مقالات لکھے گئے۔اس میں دارالمصنّفین کے اہل قلم کا موقف بہرحال درست تھا۔اس لئے کہ اس میں علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی سیرۃ النبیؐ پر متعدد بے جا اعتراضات وارد کئے گئے تھے اور ایک ایک اعتراض پر طولانی بحث کی گئی تھی اور ہر اعتراض پر متعدد مثالیں دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ سیرۃ النبیؐ اغلاط کا مجموعہ ہے۔ظاہر ہے اس رویے سے پرستاران شبلی کو ٹھیس پہنچی اور چونکہ اس کی قسطیں جنوری ۱۹۹۴ء سے جنوری ۱۹۹۶ء تک مسلسل شائع ہوتی رہیں اور اس میں اور حضرات بھی اپنے مراسلات کے ذریعہ حصہ لیتے رہے۔ اس لئے اسے علامہ شبلی اور سیرۃ النبیؐ کے خلاف ایک پروپیگنڈہ قرار دیا گیا۔اور بے شبہ جب کتاب شائع ہوئی تو اول و آخر اس میں جو تحریریں شامل کی گئیں وہ روایتی تنقید بلکہ بیشتر پروپیگنڈہ ہی تھیں۔

دراصل ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی تعلیم و تربیت مظاہر علوم سہارن پور میں ہوئی تھی اور اس کتاب میں وہ اپنے حلقہ کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ یہ حلقہ تصنیف سیرت کے آغاز سے اس کا مخالف رہا ہے اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ان کے اسی قدیم موقف کی ترجمانی نئے اسلوب و انداز میں کی تھی،اس لئے ناچاقی ہوئی اور وہ برسوں قائم رہی۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے اعتراضات کے جواب میں کئی مقالے لکھے گئے۔ان میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مولانا عارف عمری سابق رفیق دارالمصنّفین کے مقالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے اعتراضات کا ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ماہنامہ الرشاد میں جواب بھی لکھا ہے۔ راقم نے بھی 'علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جو ماہنامہ معارف [فروری

۱۹۹۸ء] ہی کی زینت بنا اوراس کے بعد کے زمانہ میں شائع ہوا، مگر وہ اس سلسلہ کا مقالہ نہیں تھا لیکن بعض لوگوں نے اسے بھی اسی تنازعہ کا حصہ تصور باور کرایا۔ اب یہ مفصل مقالہ راقم کی کتاب ''آثار شبلی'' میں شامل ہے۔

ناچیز کو ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب کی جناب میں نیاز حاصل تھا اور ہمیشہ اچھے اور خوش گوار تعلقات رہے۔ میری ان سے بی ایچ یو بنارس کی ملازمت کے زمانہ میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اعظم گڑھ میں تو بارہا ملاقاتیں رہیں۔ البتہ علی گڑھ میں بس ایک بار ہی ان کے دولت کدے پر حاضر ہوسکا۔ مجھ سے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ہمیشہ محبت آمیز معاملہ کیا اور بہت عزت دی۔ اپنی کتابیں بطور تحفہ بھیجیں۔ میرے مضامین اور کتب ورسائل کی اشاعت پر وہ خوش ہوتے، مبارک باد دیتے۔ ان سے خط وکتابت بھی رہی۔ اس میں ایک بار کسی قدر تلخی بھی آئی، لیکن وہ تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان علامہ شبلی نعمانی اور بعض دوسرے موضوعات پر بارہا گفتگو رہی۔ مگر اس میں بھی کبھی تکرار کا پہلو نہیں آیا۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے ساتھ بعض مقالات بھی بھیجے۔ ایک بار علامہ شبلی کا ایک غیر مطبوعہ خط بھی بھیجا۔ میرے بعض تحقیقی مقالات شائع ہوئے تو انہوں نے ان کی کمیوں کی نشاندہی بھی کی اور تحقیق وتدوین کے جدید اصول وآداب پر بھی روشنی ڈالی۔ میں نے کئی بار ان پر تنقید کی۔ کبھی نام لے کر اور کبھی بغیر نام لئے، مگر انہوں نے کبھی برا نہیں مانا بلکہ آثار شبلی کی تحسین وستائش کی اور جب میری کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' شائع ہوئی تو اسے ایک اہم کتاب قرار دیا۔ ہم لوگ ایک موقع پر یکجا تھے، کسی نے کہا کہ دونوں ماہرین شبلیات کیا گفتگو کررہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ماہر شبلیات میں نہیں الیاس صاحب ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ صاحب نظر تھے۔ فکر شبلی وسلیمان کے پارکھ تھے۔ خاص طور پر علامہ شبلی کا انہوں نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، مگر وہ ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' لکھ کر ''یگانہ'' بن گئے حالانکہ دور آخر میں وہ ''بجنوری'' ہوکر رہ گئے تھے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کے ایک مقالہ ''اردو میں تدوین متن۔ فن اور روایت'' میں پہلی بار علامہ شبلی کو تدوین متن کا بنیاد گذار قرار دیا گیا ہے۔ جس کا سہرا بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] کی وجہ سے کسی اور کے سر باندھ دیا گیا تھا۔ ماضی میں علامہ شبلی کے ساتھ جو نارواروبہ روا رکھا گیا،

اب بھی کوئی ویسا ہی رویہ روا رکھے تو اسے جہل کے سوا کون سا نام دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی اردو کے نہایت ممتاز اہل قلم تھے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اردو کو بہت کچھ دیا ہے۔ وہ ایک بڑے مقالہ نگار تھے۔ بلکہ انہوں نے علمی و تحقیقی مقالات کے انبار لگائے ہیں۔ مستقل کتابوں کے علاوہ ان کے علمی و تحقیقی مقالات کے کئی مجموعے شائع ہوئے اور ابھی اور بھی شائع ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر علامہ شبلی نعمانی کے عظیم الشان کارناموں سے متعلق ان کا ایک عمدہ مجموعہ مقالات چھپ سکتا ہے۔

ان کا پہلا مجموعہ مقالات ''تنقیدی معروضات'' دسمبر ۱۹۸۳ء میں بنارس سے شائع ہوا۔ اس میں ان کے درج ذیل مقالات شامل ہیں:

۱۔ قصیدہ۔ اصل ہیئت اور حدود

یہ مقالہ ان کے ایک اور مجموعہ مقالات ''نقش معنی'' میں بھی شامل ہے۔ اور آخر میں اس میں انہوں نے اس قدر اضافہ کیا کہ علی گڑھ سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

۲۔ طرز مومن

۳۔ شعر العجم اور تنقید شعر العجم (اورینٹل کالج میگزین لاہور شیرانی نمبر ص ۱۰۳-۱۱۲)

۴۔ شبلی کا فارسی تغزل

۵۔ شبلی کی تنقید نگاری

۶۔ آغا حشر بہ حیثیت شاعر

۷۔ اردو زبان پر اسلام کا اثر

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا دوسرا مجموعہ مقالات ''نقش معنی'' ۱۹۹۹ء میں بنارس ہی سے شائع ہوا۔ اس میں درج ذیل مقالات شامل ہیں:

۱۔ قصیدہ۔ اصل ہیئت اور حدود

۲۔ بلاغت کی اصطلاحیں

۳۔ کلام آبرو

۴۔ طرز مومن

۵۔غالب کی معنویت کے چند نئے پہلو

۶۔غالب کا ایک شعر

۷۔غالب کی فارسی شاعری اور ہمارے سوسال

۸۔غالب کی ایک فارسی غزل کا تجزیہ

۹۔فاروقی۔ناقد غالب

۱۰۔مآثر غالب ترتیب وتدوین جدید

۱۱۔رشید حسن خاں ایک معتبر نام

تیسرا مجموعہ ''تحقیقی مقالات'' خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔اس میں اسلامی علوم،اسلامی تاریخ،اسلامی فلسفہ،اسلامی شخصیات اور دیگر اسلامی علوم وفنون سے متعلق ۹/مقالات شامل ہیں۔ان کے عناوین یہ ہیں۔

۱۔واقدی احوال وآثار

۲۔جرح وتعدیل کا تدریجی ارتقا

۳۔غزوہ بنی نضیر

۴۔علم کلام۔ایک تعارف

۵۔مجد الدین فیروز آبادی اور القاموس المحیط

(ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ اپریل مئی ۱۹۸۵ء ص ۴۶-۵۶)

۶۔مولانا احمد تھانیسری اور ان کا نعتیہ عربی قصیدہ

۷۔شیخ غلام نقش بند اور ان کی غیر مطبوعہ عربی تفسیر

۸۔مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی میں سلوک ومعرفت

۹۔علوم دینیہ اور مطبع نول کشور

(ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۱ء ص ۲۷-۳۴۔ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۶-۳۴)

یہاں عناوین اس لئے نقل کئے گئے ہیں کہ ان سے ایک نظر میں مقالات کے مشمولات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ان کا تعارف وتبصرہ یہاں طوالت کے سبب ممکن نہیں تھا۔البتہ یہ وضاحت

ضروری ہے کہ پہلا مقالہ جوایک مورخ اور سیرت نگار واقدی کے احوال وآثار پر مبنی ہے۔اس سلسلہ کا واقدی پر دوسرا مقالہ ماہنامہ معارف میں شائع ہوااور واقدی کے بارے میں شبلی وسلیمان کے موقف کے برعکس دوسرا موقف اس میں پیش کیا گیا ہے۔اس مقالے کی اشاعت معارف میں اشاعت پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب ہی کی ادارت میں ہوسکتی تھی ،اس کے لئے ایک بڑے دل ودماغ اور وسعت قلبی کی ضرورت تھی جو بحمد للہ ظلی صاحب کی شخصیت کا حصہ ہے۔ بہرحال تحقیقی مقالات کا یہ مجموعہ اہل علم کی نظر میں قابل ستائش قرار پایا۔

چوتھا مجموعہ مقالات ''افکار وشخصیات'' رضالائبریری رام پور نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔ اس میں عہد سرسید [۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء] سے عہد حاضر [۲۰۰۶ء] تک کے اعلام واشخاص اور ان کے آثار وافکار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اوران پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں درج ذیل مقالات شامل ہیں:

۱۔سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

۲۔سرسید کے اثرات شبلی،فراہی اور آزاد کے حوالے سے

(ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مارچ ۲۰۰۰ء ص۱۰-۳۲)

۳۔حجۃ اللہ البالغہ اور علامہ شبلی نعمانی

(ترجمان الاسلام وارانسی اپریل تا جون ۲۰۰۲ء ص۳۲-۴۴)

۴۔مولانا سید عبدالحی حسنی بحیثیت محقق

۵۔ترجمان القرآن۔ایک مطالعہ

۶۔مولانا آزاد۔فاضل علوم اسلامیہ

۷۔افادات میمنی

۸۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور فلسفہ وحدت الوجود

۹۔قاضی اطہر مبارک پوری۔مورخ ومصنف

۱۰۔نبی رحمت۔ایک متوازن کتاب سیرت

۱۱۔قرآنی مقالات (تبصرہ)

۱۲۔محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے (تبصرہ)

اس کے مشمولات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''افکار وشخصیات'' کس درجہ اہم اور متنوع موضوعات پر مشتمل مجموعہ مقالات ہے۔اس میں بعض مقالات فکری حیثیت سے خاصے اہم ہیں، مثلاً سرسید کے اثرات ایک ایسا مقالہ ہے جس کا دائرہ فکر واثر وسیع ومتنوع ہے۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور فلسفہ وحدت الوجود، اسی طرح قاضی اطہر مبارک پوری کی مورخانہ بصیرت اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بعض کتب اوران کی سیرت نگاری پر بڑے عمدہ مقالات سپرد قلم کے گئے ہیں۔ان میں بعض بے حد اہم مباحث پر مشتمل ہیں۔اس کا پیش لفظ ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی اور مقدمہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے قلم سے ہے اور دونوں بزرگوں نے فاضل مقالہ نگار کی تحسین وستائش کی ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی مقالہ نگاری کا آغاز اصلاً علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ کی کاوشوں کے تحقیقی وتنقیدی مطالعہ سے ہوا تھا جیسا کہ ''تنقیدی معروضات'' کے مشمولات سے واضح ہوتا ہے اور بلا شبہ انہوں نے علامہ شبلی کی سیرت وشخصیت، فکر وفن، بالخصوص تصنیفات وتالیفات پر بڑے گراں مایہ مقالات لکھے۔علاوہ ازیں علامہ شبلی سے متعلق ایک سلسلہ مضامین المعارف لاہور، جامعہ دہلی، فکر ونظر علی گڑھ وغیرہ میں انہوں نے لکھا ہے، جس میں علامہ شبلی کی شاعری، تنقید نگاری، علم الکلام اور مورخانہ فکر وبصیرت پر تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں۔ماہنامہ معارف کے شبلی نمبر میں منسوبات کی تحقیق پر بڑا عمدہ اور محققانہ مقالہ شامل ہے۔اسی طرح شبلی صدی کے موقع پر علی گڑھ کے شعبہ اردو میں جو سمینار ہوا تھا اور جس کا مجموعہ مقالات ''شبلی نعمانی شخصیت اور عصری معنویت'' کے نام سے شعبہ اردو سے شائع ہوا ہے اس میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے سید رشید رضا مصری صاحب تفسیر المنار کے حوالہ سے بڑا معلومات افزا مقالہ لکھا ہے۔

یہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے مقالات اوران کی مقالہ نگاری کا اجمالی ذکر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعض مقالات کسی کتاب سے کم رتبہ نہیں۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنے مجموعہ مقالات کے علاوہ دیگر اہل قلم کے مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کرائے۔ان میں ''مقالات نذیر'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ڈاکٹر نذیر احمد [۱۹۱۵ - ۲۰۰۸ء] فارسی شعر وادب کے اپنے

عہد کے نامور اہل قلم، مصنف و مرتب اور مقالہ نگار تھے۔ ''مقالات نذیر'' کے دیباچہ میں انہوں نے ڈاکٹر نذیر احمد کی شخصیت اور کمالات کا ایک جامع مرقع پیش کر دیا ہے۔ پانچ صفحے کے مقدمہ میں انہوں نے انتہائی جامعیت کے ساتھ ان کا تذکرہ اس طرح قلم بند کیا ہے کہ ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی اہم پہلو نظر انداز ہوا ہو۔ ان کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''پروفیسر نذیر احمد اگر چہ اصالتاً فارسی زبان و ادبیات کے فاضلِ یگانہ تھے، لیکن ان کی تحقیقات کا دائرہ فارسی و اردو دونوں زبانوں کو محیط ہے۔ فارسی میں ظہوری کی حیات و خدمات پر انہوں نے پی ایچ.ڈی کا مقالہ لکھا۔ مکاتیب سنائی کی تدوین کی، جس کے تین ایڈیشن بالترتیب رام پور، کابل اور تہران سے شائع ہوئے۔ دیوان حافظ کا قدیم ترین قلمی نسخہ مرتب کر کے شائع کیا۔ ہندوستان کے متعدد قدیم فارسی شعراء کے دواوین کا سراغ لگایا اور انہیں جدید اصولوں کے مطابق مرتب و مدون کیا، مثلاً دیوان سراجی، دیوان عمید لو یکی اور دیوان مہندس وغیرہ۔ ان سب سے بڑھ کر انہوں نے فارسی لغات کی خدمت کی۔ بلاشبہ انہیں فارسی لغات اور فرہنگوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور وہ اس عہد میں قدیم فارسی فرہنگوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔ فرہنگ قوّاس، دستور الافضل، فرہنگ زفان گویا اور لسان الشعرا جیسے نادر و کم یاب لغات کو فارسی مخطوطات کے دفینوں سے انہوں نے برآمد کیا۔ ان سے متعلق تعارفی مضامین لکھے۔ ان کے کرم خوردہ و ناخوانا مخطوطات کو بہ ہزار عرق ریزی و جاں فشانی پڑھ کر ان کا متن مرتب کیا۔ پھر تحقیقی مقدمے اور عالمانہ حواشی و تعلیقات سے مزین کر کے انہیں علمی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔'' (مقالات نذیر ص ۳)

جمع و تدوین کا یہ کام بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، مگر درحقیقت جو لوگ اس فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں کسی تصنیف سے نہ کم وقت لگتا ہے اور نہ کم پتہ ماری ہوتی ہے بلکہ بے شمار حوالہ دیکھنے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کو ان کے اساتذہ پروفیسر حکم چند نیر اور ڈاکٹر حنیف نقوی سے پتہ

ماری اورغواصی کا یہ ہنر ملا تھا اور خود انہوں نے یہ خوبی اپنے تلامذہ میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مقالہ نگاری اور ان کی تحقیق و تدوین کے سوا ان کا ایک کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں۔ انہوں نے جو کتابیں لکھیں یا مرتب کیں ان کی تعداد سترہ ہے۔اس میں پانچ کتابیں علامہ شبلی نعمانی سے متعلق ہیں۔جن کے نام یہ ہیں:

۱۔مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار (مطبوعہ از مصنف۔علی گڑھ،۲۰۰۵ء)

۲۔شبلی کی علمی وادبی خدمات (فیکلٹی آف آرٹس،مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،۲۰۱۲ء)

۳۔شبلی (ساہتیہ اکادمی۔۱۹۸۸ء)

۴۔شبلی معاصرین کی نظر میں (اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ،۲۰۰۵ء)

۵۔شبلی شناسی کے اولین نقوش (دارالمصنّفین اعظم گڑھ،جنوری ۲۰۱۶ء)

اول الذکر دونوں کتابیں دراصل ان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''شبلی نعمانی حیات اور کارنامے'' کا حصہ ہیں۔اور دونوں علاحدہ علاحدہ شائع ہوئی ہیں۔مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے ایک مشہور اشاعتی ادارہ دارالنوادر لاہور سے بھی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

''شبلی کی علمی وادبی خدمات'' ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی ایک بڑی اہم کتاب ہے۔جزوی اختلاف کے باوجو یہ شبلیات میں ایک اضافہ قرار دئے جانے کی مستحق ہے۔اس کے مشمولات کے بارے میں خود فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ:

> ''شبلی کی خدمات کے تجزئے کے سلسلے میں دو سوالوں کے جواب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ایک تو یہ کہ متعلقہ علم یا فن میں بہ حیثیت عمومی شبلی کا کیا مرتبہ ہے؟ دوسرے یہ کہ اردو زبان کی حد تک ان کی خدمات کی قدر و قیمت کیا ہے۔مثلاً متکلم شبلی، کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ علم کلام کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ کہ اس نے ارتقاء کی کیا کیا منزلیں طے کیں؟ پھر اس کا جائزہ لیا گیا ہے کہ علم کلام کی پوری تاریخ میں شبلی کا درجہ کیا ہے۔............اسی نہج پر ان کی تاریخ نگاری، سوانح نگاری اور سیرت نگاری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ادبی

خدمات کے ذیل میں خصوصیت کے ساتھ شاعری اور تنقید نگاری کو موضوع
بحث بنایا گیا ہے۔ آخر میں متفرقات کے عنوان سے چند دلچسپ مباحث بھی
شامل مقالہ ہیں۔ ان سب کے باوجود ہمیں یہ احساس ہے کہ شبلی کے اکتسابات
پر لکھنے کی ابھی بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔'' (شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۱۲)

تیسری کتاب ساہتیہ اکادمی کا مونوگراف ہے اور آخر الذکر دونوں کتابیں دراصل ایک ہی کتاب ہیں۔ پہلی کتاب شبلی معاصرین کی نظر میں اردو اکادمی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ شبلی صدی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اس میں اس قدر اضافہ کیا کہ وہ ایک مستقل کتاب بن گئی اور اسے نئے نام ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' سے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے شائع کیا۔ علامہ شبلی کی سیرت و شخصیت پر یہ بے حد اہم مجموعہ مقالات ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے احباب، معاصرین، متعلقین اور تلامذہ کے مقالات کو قدیم رسائل و جرائد سے یکجا کیا گیا ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی بے حد اہم مجموعہ مقالات ہے کہ اس میں علامہ شبلی کی سیرت و شخصیت، کتب و رسائل اور بنیادی موضوعات تحقیق و تصنیف پر موافق و مخالف اہل قلم کی تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں۔ یہ مقالات جن رسائل و جرائد سے یکجا کئے گئے ان کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسائل و مجلّات پر بھی ڈاکٹر صاحب کی گہری نگاہ تھی۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا مطالعہ شبلیات ان کی کتاب زندگی کا محض ایک باب ہے۔ ان کا دائرہ تصنیف و تحقیق اور بھی وسیع ہے۔ اس میں ایک بڑا حصہ غالبیات کا بھی ہے۔ غالب سے متعلق ان کے متعدد مقالات کے عناوین اوپر گذر چکے ہیں، ان کا مجموعہ مقالات ''نقش معنی'' کا بڑا حصہ غالب شناسی پر مبنی ہے۔ مگر ان کا اس سلسلہ کا سب سے اہم کارنامہ سید علی حیدر طباطبائی [۱۸۵۳-۱۹۳۳ء] کی ''شرح دیوان اردوئے غالب'' کی تدوین ہے۔ اسے ڈاکٹر صاحب نے ضروری حواشی و تعلیقات کے ساتھ از سر نو مدون کیا ہے اور ایک انتہائی عالمانہ مقدمہ لکھا ہے جو نہ صرف غالب شناسی پر ان کی گہری نظر کا ثبوت ہے بلکہ اس سے مشرقی ادبیات پر ان کے وسعت مطالعہ و معلومات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس مقدمہ اور اس کے حواشی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب شعر و ادب پر نہایت دقیق اور عالمانہ نظر رکھتے تھے۔ سخن فہمی اور دقیقہ سنجی کا مذاق

ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔ اردو شعریات سے آگے عربی و فارسی شعریات پر بھی وہ درک و بصیرت رکھتے تھے۔ ان کا ادبی و تنقیدی شعور بھی بڑا پختہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی ادبیات پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا شمار اعلیٰ پایہ کے تحقیقی و تنقیدی ادب میں ہوتا ہے۔

شرح دیوان اردوئے غالب کے ساتھ انہوں نے قصائد۔ اور بلاغت پر جو عالمانہ مضامین لکھے ہیں وہ ان کی اصناف سخن کے ساتھ دیگر فنی خصوصیات پر عمیق نظر کے شاہد ہیں۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی علمی و ادبی خدمات کے کئی میدان ہیں۔ اس میں ایک اہم شبلی شناسی ہے جس کا اجمالی ذکر گذشتہ سطور میں آچکا ہے، ان کا دوسرا قابل ذکر میدان غالبیات ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور پہلو شعرا کے کلام کا انتخاب اور ان کی تدوین و تحقیق بھی ہے۔ اس سلسلہ کی ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

۱۔ انتخاب مومن (اردو اکیڈمی لکھنو، ۱۹۸۳ء)

۲۔ انتخاب آبرو (اردو اکیڈمی لکھنو، ۱۹۹۷ء)

۳۔ دیوان ناظم (رضا لائبریری رام پور، ۲۰۱۱ء)

۴۔ مقالات نذیر (از مصنف۔ علی گڑھ، ۲۰۱۲ء)

۵۔ مثنوی موعظہ آرائش معشوق از شاہ مبارک آبرو (شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی، ۲۰۱۳ء)

۶، ۷۔ شبلی معاصرین کی نظر میں اور شبلی شناسی کے اولین نقوش

آخر الذکر کتب کا ذکر اوپر شبلیات کے ذیل میں آچکا ہے۔

اردو شعرا کے کلام کے انتخابات اور دیوان ناظم کی ترتیب و تدوین پر انہوں نے جو مفصل مقدمات تحریر کئے ہیں جس میں شعراء کے حالات، ان کے دواوین، مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کی تحقیق و تفتیش اور الحاقی و غیر الحاقی کلام کی نشاندہی اور تصحیح ایسے اہم پہلو ہیں جن سے ان کے تدوینی شعور کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ غرض متنوع پہلوؤں پر نہایت محققانہ بحث و تحقیق جہاں انہیں ایک بڑا محقق و مدون کا درجہ عطا کرتی ہے وہیں ان کی تلاش و تفحص کی خوبی اور اس میدان میں ان کی کوہ کنی کے پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ شاہ مبارک آبرو کی مثنوی موعظۂ آرائش معشوق کی تدوین و ترتیب ان کی ایک اہم کاوش ہے۔ کلام آبرو کا وہ ۱۹۸۳ء میں انتخاب اور اس پر طویل محققانہ مقدمہ لکھ چکے

تھے۔حق تھا کہ وہ مذکورہ بالا مثنوی کی تدوین کرتے اوراس کا مقدمہ لکھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ مثنوی اگر چہ مختصر ہے، تاہم اس میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے جس قدر محنت وتحقیق کی ہے وہ بلاشبہ کسی تحقیقی کتاب سے کم نہیں۔ان کے تفصیلی جائزہ کا یہ موقع نہیں ہے، تاہم اس کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ہماری تحقیقی اور تدوینی روایت کے اپنے عہد میں بلکہ ڈاکٹر حنیف نقوی [۱۹۳۸-۲۰۱۲ء] کے بعد سب سے بڑے محقق و مدون تھے۔اوراس میدان میں ان کا نام ایک حوالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بڑے سے بڑا محقق اس وقت تک درجہ اعتبار حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اس میں بھر پور تنقیدی صلاحیت نہ ہو۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی محقق و مدون کے ساتھ ایک بڑے نقاد بھی تھے۔ان کی متعدد تنقیدی نگارشات ان کے مجموعہ مقالات میں شامل ہیں۔ان کے مفصل تجزیہ کے بعد یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ہمارے عہد کے ایک ممتاز نقاد تھے۔البتہ ان کی سیرت وشخصیت کے انکسار کی طرح تنقید میں ان کا خاکسارانہ انداز سامنے آتا ہے، لیکن یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رویہ دور آخر کی تنقیدوں کا ہے۔ابتدا میں وہ بھی شدید اور تند وتیز لہجے میں نقد کرتے تھے، تاہم ان کی اس صفت کا ذکر ضروری ہے کہ وہ تنقید کے اپنے ہر دور میں دلائل و براہین کا اہتمام کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات اس قدر کثرت سے ثبوت وشہادت پیش کرتے تھے کہ یہ یقین ہوتا تھا کہ شاید انہیں خود اپنے دلائل پر اعتبار نہیں ہے یا اپنے موقف کی وضاحت کے لئے متعدد دلائل وہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ ایسا زیادہ تر ان کی پہلی متنازعہ کتاب مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار میں ہوا ہے۔ ہمارے عہد کے سب سے بڑے نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ان کے اس انداز پر نقد کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے اوصاف وکمالات میں ان کی صاف ستھری، سادہ اور دلکش نثر بھی شامل ہے۔ وہ ایک بڑے نثر نگار تھے۔سادگی، شائستگی اور سنجیدگی ومتانت کے ساتھ اختصار اور جامعیت ان کی نثر کی خاص خوبیاں ہیں۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ ادبی معاملات ومسائل نہایت سادہ نثر میں سپرد قلم کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں فلسفہ وکلام کے پیچیدہ معاملات ومسائل کو بھی وہ پانی پانی کر دیتے ہیں۔ان کا سادہ اسلوب، تحقیق وتنقید کی خاردار وادی میں بھی بڑی سبک

روی کے ساتھ قائم رہتا ہے اور علمی و دینی مسائل و مباحث میں بھی بدستور باقی رہتا ہے۔ تعلیقات وحواشی کا وہ بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اس میں بھی ان کا اسلوب نگارش گنجلک اور نا قابل فہم نہیں ہوتا۔ وہ ثقیل الفاظ و عبارات سے اپنی نثر کو بوجھل، بے معنی اور گراں بار نہیں ہونے دیتے۔ گویا ان کے انداز بیان کی دلکشی ان کے بیانیہ کو ممتاز کرتی ہے۔ ہمارے اس مضمون میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی تحریروں کے بہت کم اقتباسات شامل ہیں۔ یہاں بطور نمونہ چند سطور ملاحظہ ہوں۔ ان کی مشہور کتاب ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' کے ابتدائیہ میں اصولی مباحث کے بعد لکھتے ہیں۔

> ''جہاں تک علامہ شبلی کی شخصیت کا تعلق ہے تو وہ راقم کی نگاہ میں پہلے بھی محبوب و محترم تھی اور اب بھی محبوب و محترم ہے۔ ان کی علمی و ادبی فتوحات و اکتسابات کے سامنے پہلے بھی سرنیاز خم تھا اور اب بھی خم ہے۔ ان کی نثر کی رعنائی و دل کشی پہلے بھی دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی تھی اور اب بھی کھینچتی ہے، لیکن اس محبت و عقیدت پر حق گوئی کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔''
>
> (مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار ص۱۲)

یہی انداز ان کے خطبات میں بھی قائم رہتا ہے۔ انہوں نے ملک کی مختلف جامعات اور علمی و ادبی اداروں میں یادگاری خطبات دئے۔ نیشنل اور انٹرنیشنل سمیناروں میں مقالات پیش کئے۔ ہر جگہ ان کا یہی سادہ انداز بلکہ ساحرانہ انداز قارئین و شائقین کو متاثر کرتا رہا۔ دراصل ان کی سادہ طبیعت ان کی علمی طبیعت اور مزاج پر اثر انداز ہوگئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور مزاج و مذاق پر حلم اور بردباری کے عناصر حاوی ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے دیار مشرق کے علماء، فضلاء، ادبا و شعرا اور بعض مفکرین مثلاً مولانا قاسم نانوتوی، سرسید، غالب، میر، مومن، آبرو، شبلی، حالی، فراہی، آزاد، عبدالحی حسنی، علامہ میمنی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، قاضی اطہر مبارک پوری اور گذشتہ صدی کے دوسرے علماء و مفکرین پر جو گراں مایہ تحریریں لکھی ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ علوم اسلامیہ پر ان کی مفکرانہ نظر تو تھی ہی، ہندوستان کی سرزمین سے برپا ہونے والی علمی، ادبی، دینی، تعلیمی اور سماجی تحریکات کی تاریخ، مقاصد اور ان کے عزائم کے ساتھ ان کے نتائج فکر سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ بلاشبہ

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی شخصیت متنوع اوصاف وکمالات کا مجموعہ تھی۔انہوں نے چالیس برس کی تدریسی، تصنیفی اور تحقیقی زندگی میں جو سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ آئندہ علم وادب کے میدان میں ہماری رہبری ورہنمائی بھی کرے گا اور تشنگان علم وادب کی تشنگی بھی بجھا تا رہے گا۔اعظم گڑھ کے قصبہ گھوسی میں پیدا ہونے والی یہ مایہ ناز شخصیت اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہے۔

اے خاک علی گڑھ ہم نے علم وادب کا وہ سرمایہ تیرے سپرد کیا ہے جو گذشتہ چالیس برسوں سے ملت کے لئے مایۂ فخر ونازش تھا۔اور یقین ہے آئندہ بھی رہے گا۔اس کی حفاظت تیری ذمہ داری ہے۔

ooo

انور اعظمی ۔ایک مطالعہ

جن اہل علم اورارباب شعروسخن کی تابانیوں کی بدولت افق اعظم گڑھ مطلع انوار بنا ان میں ایک نام انوراعظمی [۱۹۲۶-۱۹۶۱ء] کا بھی ہے۔ وہ عالم تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، افسانہ نگار تھے، صحافی تھے، مبصر تھے، بچوں کے ادیب تھے۔ گویا ان کی شخصیت متنوع اوصاف و امتیازات سے عبارت تھی مگر ان کی کم عمری کی موت نے ان کی جولانیوں کو نکھرنے کا موقع نہیں دیا، تاہم انہوں نے جو سرمایہ شعروادب یادگار چھوڑا ہے وہ بے حد قیمتی ہے۔ اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

انوراعظمی ۱۹/ جولائی ۱۹۲۶ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں مہوارہ کلاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مولوی عبدالوحید سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل کئے گئے درمیان میں کچھ دن شبلی نیشنل پی جی کالج میں بھی زیر تعلیم رہے، مگر پھر مدرسۃ الاصلاح واپس آ گئے اور ۱۹۴۷ء میں سند فراغت حاصل کی۔ ان کا شمار ذہین، سنجیدہ اور باصلاحیت طلبہ میں ہوتا تھا۔ تکمیل کے بعد مادر علمی مدرسۃ الاصلاح میں استاذ مقرر ہوئے اور درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا انیس اعظمی کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''مرحوم انوراعظمی ہمارے اساتذہ میں تھے۔ ۱۹۴۸-۱۹۴۹ء کی بات ہے مختصر مدت کے لئے بحیثیت طالب علم ان سے استفادہ کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک ہمدرد اور شفیق استاذ تھے۔ نصف صدی سے زائد مدت گذر جانے کے باوجود ان کی دلآویز شخصیت کا اثر ذہن پر ہے۔ اقبال کا مصرعہ:
>
> آزادی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

ان کی ہستی پر پوری طرح منطبق ہوتا تھا۔انہیں دیکھ کراندازہ ہوتا تھا کہ
حیات کیا ہے خیال ونظر کی مجذوبی
(نالہ شب ص ۱۷)

ظاہر ہے محض انیس احمد اعظمی مرحوم ہی نے استفادہ نہیں کیا ہوگا بلکہ ان کی پوری جماعت ان کے فیضان نظر سے بہرہ ور ہوئی ہوگی، مگر کسی اور طالب علم کا اعتراف ہماری نظر سے نہیں گذرا۔

انور اعظمی مدرسۃ الاصلاح میں جماعت اسلامی، اس کے افکار ونظریات بالخصوص اغراض ومقاصد سے واقف ہوئے۔ پھر یہ واقفیت وابستگی میں بدل گئی۔ چونکہ ان میں دور طالب علمی ہی میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا بلکہ یہ صلاحیت ان میں پورے طور پر پروان چڑھ چکی تھی۔ دراصل اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں تصنیف وتالیف کا ذوق اس کے فضلا پر حاوی تھا اور وہ ملک کے مختلف حصوں میں داد تحقیق وتصنیف دے رہے تھے۔ چنانچہ انور اعظمی کی اس صلاحیت نے انہیں ۱۹۴۹ء میں رام پور پہنچا دیا اور وہ مولانا حامد علی کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ ''زندگی'' سے وابستہ ہو گئے۔ اور ۱۹۵۲ء تک وابستہ رہے۔ ان کا تعلق غالباً ادارتی امور سے تھا، اس لئے کہ ماہنامہ زندگی میں انہوں نے مضامین کے علاوہ اس کے مستقل کالم اخبار وافکار اور کتابوں پر نقد وتبصرے بھی سپرد قلم کئے ہیں۔ ان کی نثری تحریروں کا ایک مجموعہ ''مقالات'' کے عنوان سے ان کی وفات کے ۵۵ر سال بعد ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اسے مولانا احمد محمود کوثر اعظمی [۱۹۲۹-۲۰۱۸ء] نے مرتب کیا ہے اور مکتبہ الحسنات دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے، مگر انہوں نے یہ واضح نہیں کیا ہے کہ اس میں شامل تحریریں ماہنامہ زندگی رام پور سے نقل کی گئی ہیں یا دیگر رسائل وجرائد سے بھی اخذ کی گئی ہیں۔ ناچیز نے ماہنامہ زندگی کے اشاریہ ''زندگی کا خزانہ'' جسے میرے فاضل دوست ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے مرتب کیا ہے اور جو دہلی سے ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا ہے، اس سے تصدیق کی تو یہ بات سامنے آئی کہ ''مقالات'' میں تقریباً تمام تحریریں ''زندگی'' ہی سے لی گئی ہیں۔ اس کی فہرست یہ ہے:

۱۔شرک کا نقطہ آغاز	۲۔توحید کے مختلف مراحل
۳۔دین میں تحریف	۴۔تحریک اسلامی کا انقلابی طریقہ کار
۵۔فرد اور جماعت	۶۔تحریک اور تعمیر افراد (تین قسطیں)
۷۔سماجی انقلاب	۸۔سماج کی بنیادیں
۹۔دوزاوئے	۱۰۔اخبار وافکار

البتہ اس میں ماہنامہ زندگی کی چند تحریریں نقل ہونے سے رہ گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔قلندر کی صدا۔اکتوبر ۱۹۴۹ء،ص ۲۹

۲۔بے مایگی۔دسمبر ۱۹۴۹ء،ص ۳۳

۳۔(اخبار وافکار) موجودہ دور میں عالمی صورت حال۔اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۴۱-۴۵

۴۔(اخبار وافکار) انتخابات اور ملک کی سیاسی پارٹیوں کے بارے میں اظہار خیال۔ مارچ ۱۹۵۱ء ص ۳۳-۴۰

تبصرے

۱۔قانون مکافات (مصنف: ضیاءالہدیٰ) اگست ستمبر ۱۹۵۰ء،ص ۹۴-۹۵

۲۔اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں (مصنف: سید اصغر علی عابدی) اپریل مئی ۱۹۵۱ء،ص ۹۴-۹۵

۳۔جمہوریت کی مغربی تحریکیں (مصنف: عبدالوہاب ظہوری) اپریل مئی ۱۹۵۱ء

ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی تحریریں اوراق زندگی کی زینت بنی ہوں اور جن تک ہماری رسائی نہ ہوسکی ہو۔ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ابتدائی دور کے بعض شماروں میں ان کی غزلیں بھی شائع ہوئی ہیں۔مگر وہ شمارے دستیاب نہ ہو سکے اور نہ میں یہ تصدیق کرسکا کہ انور اعظمی کے غزلوں کے مجموعہ ''نالہ شب'' میں وہ غزلیں شامل ہیں یا نہیں۔

بہر حال گذشتہ سطور میں جن تحریروں کا ذکر آیا ہے وہ انور اعظمی کی زندگی کے زمانہ قیام رامپور کی یادگاریں ہیں۔اس کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور اعظمی کو نثر نگاری میں مہارت حاصل تھی۔اوران کا علم گہرا اور مطالعہ وسیع تھا اوران کا اسلوب نگارش نہایت شستہ وشگفتہ

اور دلکش ہے۔ یہاں بطور نمونہ ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ ''شرک کا نقطہ آغاز'' مقالات کا پہلا مقالہ ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ میں ہوا ہے:

''مذہب کے بارے میں نئی تحقیقات یہ ہیں کہ جب انسانوں نے زمین پر اپنی زندگی شروع کی تو انہیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ چلنا چاہے تو دریا اور پہاڑ راستہ روک لیتے، دیکھنا چاہے تو رات کی اندھیری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی، سونا اور آرام کرنا چاہے تو آگ برسانے والا سورج اپنی تیز تیز کرنوں کو جسم میں چبھو کر نیند حرام کر دیتا، اور خود زندگی کو برقرار رکھنا چاہے تو قدم قدم پر مہلک جانوروں اور خوں آشام درندوں سے سابقہ پڑتا۔ ان مشکلات کو انسان کی وہ لاعلمی اور بھی زیادہ کر دیتی، جو اسے شروع میں کائنات کے بارے میں لاحق تھی، جس کی وجہ سے وہ دنیا اور آسمانی آفت پر قابو حاصل کرنے کے بجائے خود اس کے ہاتھ میں بے بس کھلونا تھا۔ بارش اس کے گھر کو روند جاتی، بجلی اس کے دل کو دہلا دیتی اور لو کی تپش اس کے جسم کا خون چوس لیتی...... یہ انسان کی زندگی کا نقشہ تھا، اس وقت جب کہ اسے دنیا کے برتنے کا سلیقہ نہ آیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قدم قدم پر اپنی بے بسی اور مجبوری کو نمایاں طور پر محسوس کرتا اور اپنے مقابلہ میں دریاؤں کو، پہاڑوں کو، سورج کو اور بادل کو کہیں زیادہ طاقتور پاتا۔ اس لئے اس کے ذہن پر ان تمام چیزوں کی طرف سے، جن سے اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہوتا، ایک قسم کا خوف چھانے لگتا، پھر وہ خوف اپنی شکل بدلتے بدلتے جذبۂ بندگی کی صورت اختیار کر گیا اور اس طرح انسان کو مختلف خداؤں کی بندگی کا شکار ہونا پڑا۔'' (مقالات ص ٦)

مقالات کے مشمولات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تحریریں جماعت اسلامی اور اس کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اور ان میں سطحیت، جذباتیت اور رواروی نہیں بلکہ ان میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ ملت کے مسائل پیش نظر اور ان کے لئے فکر مندی کے جذبات عیاں ہیں۔

افرادسازی کی اہمیت کا احساس ہے۔ اخبار وافکار کی بعض وقتی تحریروں کے سوا ان کی تحریریں آج بھی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہیں اور ان سے آج بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ان مقالات سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی [۱۷۰۳-۱۷۶۲ء] اور ان کے افکار کا بڑی دلجمعی اور گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کے کئی مقالات ایسے ہیں جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار کی روشنی میں لکھے گئے ہیں یا ان کے افکار کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اسی زمانہ میں ان کے بڑے والد شیخ عبدالحمید جو برما میں مقیم تھے اور وہاں ان کا بڑا کاروبار تھا، انہوں نے اپنی معاونت کے لئے انور اعظمی کو برما بلا لیا۔ وہ برما گئے تو ضرور مگر ان کی اب تک کی زندگی علم، اہل علم اور کاغذ و کتاب کے درمیان گذری تھی۔ اور اسلام اور اسلامی علوم و ادبیات کا مطالعہ ان کا مشغلہ تھا، چنانچہ انہیں کاروبار راس نہیں آیا اور وہ اس غیر علمی شغل کو اختیار نہ کرسکے۔

برما رنگون میں انور اعظمی ہفت روزہ البلاغ سے وابستہ ہوئے اور کئی برس تک وابستہ رہے۔ پھر ان کی کوششوں سے رنگون سے روزنامہ پرواز او ہفت روزہ انقلاب جاری ہوئے۔ چنانچہ انہیں ترقی دینے کے لئے انہوں نے اپنی سب صلاحیتیں لگادیں اور انہیں ترقیات سے ہم کنار کیا۔ اس کی تفصیلات انقلاب رنگون کے انور اعظمی نمبر اور اذان سحر کے مقدمہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

انور اعظمی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اختراعی ذہن کے مالک شخص تھے۔ خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔ مہوارہ سے برما تک ادبی اور اصلاحی تنظیموں کا قیام اور ان کی سرپرستی کے کاموں سے ان کی ملی فکرمندی کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔

اسی طرح رنگون سے ایک ادبی رسالہ کے اجراء کا خیال ان کی ادبی دلچسپیوں کا مظہر ہے۔ ان کے ایک دوست احمر رنگونی نے لکھا ہے کہ

> ’’ایک دن انور بڑی حسرت سے کہنے لگے احمر صاحب! کیا اچھا ہو اگر یہاں سے ایک ادبی ماہنامہ نکلے۔ جو عہد حاضر کے ادبی تقاضوں کے مطابق اور بلند معیار ہو۔‘‘ (ہفت روزہ انقلاب رنگون۔ انور نمبر)

اردو اخبارات کے ساتھ وہ برمی زبان میں بھی صحافت کا چراغ روشن کرنا چاہتے تھے۔
سیف الدین شاہد نے لکھا ہے کہ

''مرحوم نے حد سے زیادہ اس بات کی کوشش کی کہ یہاں سے برمی زبان میں ایک اخبار نکالا جائے۔ تاکہ اس کے ذریعہ وقت کی پکار ان کے کانوں تک پہنچائی جا سکے۔ اگر چہ ان کی یہ کوشش رائیگاں گئی تاہم وہ اس حد تک اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوئے کہ لوگوں کی ذہنی سطح کسی قدر بدل گئی۔ ایک نیا ولولہ اور تازہ جوش ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔'' (انقلاب رنگون، ۲۴/اپریل ۱۹۶۱ء)

ان عزائم، منصوبہ بندی اور فکرمندی کے پس پشت دراصل ایک لازوال فکر تھی۔ ان کے ایک برمی دوست ابو بکر آزاد نے لکھا ہے کہ

''آپ کی زندگی کا اصل مقصد اسلام ہی پر جینا اور اسلام ہی پر مرنا تھا۔ آپ کی کائنات صرف اسلام تھی اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

(پرواز رنگون۔ ۴/اپریل ۱۹۶۱ء بحوالہ اذان سحر ص ۳۶)

مولانا عبدالاول امام جامع مسجد او چوکوں رنگون نے ایک تعزیتی جلسہ میں کہا کہ

''مرحوم نے پرواز و انقلاب کے ذریعہ مسلمانان برمی میں صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کی۔ یہ آپ کی تحریروں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے حق کی حمایت کو اولین فریضہ سمجھا۔ آپ صرف شاعر، جرنلسٹ اور مصنف ہی نہیں بلکہ خادم اسلام بھی تھے۔ آپ کی تحریریں اس کا زندہ ثبوت ہیں۔''

(روزنامہ پرواز۔ ۳۱/مارچ ۱۹۶۱ء)

انور اعظمی کی برما میں ادبی وصحافتی سرگرمیوں کا ایک مقصد مسلمانان برما میں اتحاد و اتفاق اور مذہبی و سیاسی شعور کی بیداری تھا جس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔ روزنامہ پرواز کے مینیجنگ ایڈیٹر آئی. ایم. ڈی باگیہ نے لکھا ہے کہ

''مرحوم رنگون آئے تو اپنے ساتھ خدمت اسلام و ہمدردی قوم کا قابل قدر جذبہ بھی لائے۔ انہوں نے اس جذبے کے زیر اثر خود بھی کام کیا اور یہاں کام

کرنے والوں کا ایک گروہ بھی پیدا کردیا۔'' (انقلاب۔انوراعظمی نمبر)

برما میں انوراعظمی کی مصروفیات اور خدمت کا ایک اور میدان شعروسخن سے ان کی گہری وابستگی بھی تھی۔ وہ نہ صرف بلند رتبہ شاعروسخن فہم تھے بلکہ ان کے وجود سے متعدد لوگوں نے شعرو ادب کی خدمت انجام دی۔ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے، کلام سناتے۔ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر منعقد ہونے والے سالانہ مشاعرے میں وہ اکثر شریک ہوتے اور انہیں خراج پیش کرتے۔ ان کے مجموعہ'' اذان سحر'' کی کئی نظمیں ایسی ہیں جو بہادر شاہ ظفر کی برسی پر منعقد ہونے والے مشاعروں میں پیش کی گئی ہیں۔

نوآموز شعرا کی حوصلہ افزائی، ان کے کلام کی اصلاح اور برما میں ادبی تنظیم کا قیام ان کی اس سلسلہ کی اہم کاوشیں ہیں۔ گویا ان میں زمانہ سازی کی بھی صلاحیت تھی۔

۸/برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۹۶۰ء میں برما سے وطن واپس آئے اور اپنے دوست مولوی قمرالدین اصلاحی [۱۹۲۵-۲۰۱۹ء] کی خواہش پر روزنامہ پیغام کان پور سے منسلک ہوگئے، مگر کان پور انہیں راس نہیں آیا اور ایک سال کے اندر ہی اوائل ۱۹۶۱ء میں سخت بیمار ہوکر اعظم گڑھ واپس آ گئے اور بیماری کا یہ حال ہوا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ غشی کے مسلسل دورے پڑنے لگے۔ دوا علاج بہت ہوا مگر زندگی کی شام ہو چکی تھی۔ ۶/مارچ ۱۹۶۱ء کو یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے حبیب خاص مولوی احمد محمود کوثر اعظمی نے نماز جنازہ پڑھائی اور مہوارہ کلاں کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کی بے وقت کی موت سے ہر شخص رنجیدہ ہوا۔ اور وطن سے برما تک ماتم برپا ہوا۔ برمی ادباء وشعراء نے وفیاتی مضامین اور مراثی لکھے۔ ان کے دوست شاہد پرتاپ گڑھی کا ''غم دوست'' ملاحظہ ہو:

اے ناؤ والو! دور کنارا چلا گیا — دریائے فن شعر کا دھارا چلا گیا
بزم ادب نے کھو دیا ایک در بے بہا — اہل ادب کی آنکھ کا تارا چلا گیا
افسردہ ہو گئی ہے محبت کی کائنات — ارباب ذوق و شوق کا تارا چلا گیا

صد حیف بادہ خواروں میں ساقی نہیں رہا — وہ جس نے میکدے کو سنوارا چلا گیا
اب دیکھتے ہیں اہل نظر یاس کا سماں — جان نظارا تھا جو نظارا چلا گیا
گم کردگان راہ کو جس سے ملی تھی ضو — دکھلا کے اک جھلک وہ ستارا چلا گیا
وہ پیکر خلوص کہ نقش حیات تھا — کر کے عدم کی سمت اشارا چلا گیا
بیباک بن کے خدمت ملی کی راہ میں — صدمے جو کر رہا تھا گوارا چلا گیا
انور کہ جس کی فکر سخن روح شعر تھی — لے کر سخن کا لطف وہ سارا چلا گیا

شاید اسیر غم ہیں فدایان فن تمام
دیتا رہا جو سب کو سہارا چلا گیا

ایک دوسرے دوست یعقوب الحسن احمر رنگونی نے اس شعر سے ماتم کیا:

ارباب ذوق روتے ہیں انور کی موت پر
کہتے ہیں آہ! چل بسا ایک صاحب نظر

ان کے ایک اور دوست مشتاق نے کہا کہ:

مولوی ہو کر بھی وہ ملائے خیراتی نہ تھا
بیکسوں کی حاجتیں وہ خود بھی بر لاتا رہا

(انقلاب انور اعظمی نمبر)

جوہر کا جوہر آئینہ ملاحظہ ہو:

تیرے مرنے پر عزاداری کا یہ عالم ہے آج
جس کو دیکھو آج نوحہ گر ہے انور اعظمی جوہر

منظور الحق منظور کے آنسو:

ترے دل کا پیمانہ نور انور — غم دو جہاں سے تھا بھرپور انور
نگاہوں میں تیری تھا جلوہ کسی کا — تو دل میں نہاں شعلہ طور انور
غم دو جہاں جھیلتا تھا خوشی سے — کبھی تو نہ ہوتا تھا رنجور انور
مئے عشق پی کر جہان وفا میں — ہمیشہ تو رہتا تھا مخمور انور

یہ کیا روٹھنا ہے خفا مجھ سے ہو کر تو دنیا ہی سے ہو گیا دور انور
تری بزم سونی پڑی ہے تو آج کہاں ہو گیا ہے تو مستور انور
تبسم بہ لب تیری گل ریز باتیں ترے غم پہ کرتی ہیں مجبور انور
تجھے تیری سلمٰی نے چھینا ہے مجھ سے ازل سے یہ ان کا ہے دستور انور
تری موت آئی تو فرط الم سے ہوا شیشۂ دل مرا چور انور
مجھے مرے انور سے مولٰی ملا دے
کہے گا سر حشر منظور انور

انور اعظمی کے ایک اور شاعر دوست غلام رحمان ہمدم رنگونی نے ان کی موت کا ماتم ان اشعار سے کیا ہے۔

اے لحد آغوش میں تیری فضا کا پی کے جام سو رہا ہے نیند راحت کی محمدؐ کا غلام
درس جو دیتا رہا ملت کو سعی و عزم کا تا میسر ہو اسے کھویا ہوا اس کا مقام
جس نے ہلچل ڈال دی دنیائے مال و جاہ میں اور توڑا خود غرض سرمایہ داروں کا نظام
گو زمانے کی نظر میں اک صحافی تھا ضرور تھا مگر وہ عالم علم صحافت کا امام!
طوطی شیریں نوائے گلشن شعر و ادب! آج بھی نغمے ہیں جس کے کیف پاش صبح و شام
کون ہے جس کو نہیں اس کی جواں مرگی کا غم ہے دل احباب میں رنج و الم کا اژدہام
اسکے پس ماندوں کی آنکھوں سے رواں ہے اشک خوں صدمہ بڑھ جاتا ہے جب مرحوم کا لیتے ہیں نام
محفل اہل خرد میں غل ہے انور چل بسا مرد دانا صاحب کردار اعلٰی نیک نام
اس کو مار آستیں سے عمر بھر شکوہ رہا اس کے مسلک میں نفاق و بغض تھا کار حرام
آج آتا ہے نظر وہ بھی سراپا سوگوار جس کے سینے میں تھے روشن شعلہ ہائے انتقام
اس کی خودداری پہ کوئی حرف لا سکتا نہیں تھا وہ اپنی منزل سعی و عمل میں تیز گام
وہ عمل پیرا رہا شام و سحر اس قول پر! با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام
دوستوں میں وہ گھرا رہتا تھا اپنے اس طرح جس طرح تاروں کے جھرمٹ میں رہے ماہ تمام

اس مرثیہ کا آخری شعر پڑھا نہیں جا سکا۔

ان کے علاوہ بھی کئی مراثی وقطعات انقلاب رنگون کے انور اعظمی نمبر میں شامل ہیں، مگر وہ اخبار کی بوسیدگی کے سبب پڑھے نہیں جا سکے۔طوالت کے باوجود یہاں کئی مراثی وقطعات کو اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی ہو جائیں اور اہل سخن یہ بھی دیکھ لیں کہ برمی اہل سخن کے درمیان ہمارا سخن ور کیا مقام رکھتا تھا۔اور اس نے دلوں کو کیسے فتح کیا تھا۔

انور اعظمی نے کل ۳۵ر سال کی مختصر سی زندگی پائی۔اس میں ایک برس تدریس اور بقیہ ۱۳ر برس ہندوستان اور برما میں اخبارات ورسائل سے وابستگی میں گذارے۔اس طرح زندگی کا زیادہ حصہ صحافت کی نذر ہوا اور جیسا کہ اوپر گذرا اس کا آغاز ماہنامہ زندگی رام پور سے ہوا تھا۔پھر برما اور آخر میں پیغام کان پور سے منسلک ہو گئے تھے۔لیکن ان کے مجموعہ مقالات میں جو تحریریں یکجا کی گئی ہیں وہ سب ماہنامہ زندگی سے یکجا کی گئی ہیں۔ان میں برما کے اخبارات ورسائل کی کوئی تحریر شامل نہیں ہے۔گویا ان کے ہندی احباب نے انہیں فراموش کر دیا مگر برما کے اہل قلم اور احباب نے انہیں یاد رکھا۔ان کی موت پر آنسو بہائے۔روزنامہ پرواز کے مدیر نے ان پر ایک مستقل اداریہ لکھا اور ان کی صحافیانہ خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ انہیں زبردست خراج پیش کیا۔اس کے بعد ہفت روزہ انقلاب کے مدیر نے انقلاب کا ''انور اعظمی نمبر'' شائع کیا اور متعدد ادبا وشعرا کی تحریریں اور ان کے بیانات شامل کئے۔یہ نمبر راقم کی نظر سے گذرا ہے، مگر اس قدر بوسیدہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے کہ مزید استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔اس کے متعدد اقتباسات مولانا احمد محمود کوثر اعظمی نے ''اذان سحر'' کے مقدمہ میں نقل کئے ہیں۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انور اعظمی برما میں خاصے مقبول تھے اور ان کی سیرت وشخصیت مختلف اوصاف کا مجموعہ تھی۔ان کے جن برمی احباب نے نظم ونثر میں تعزیت کی ہے اور جن کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں۔

۱۔احمر رنگونی ۲۔شمیم مولیمنی

۳۔وکیل جون پوری ۴۔محمد سلطان لطیفی۔مدیر پرواز وانقلاب، برما

۵۔قلندر شاہ ۶۔محمد صلاح الدین برق

۷۔ابوبکر آزاد

۸۔آئی.ایم.ڈی. باگبہ۔مینیجنگ ایڈیٹر پرواز وانقلاب رنگون برما

۹۔محمد سلطان حقیقی ۱۰۔مولانا عبدالاول۔امام جامع مسجد اوچوکوں

۱۱۔نظر دریابادی ۱۲۔سیف الدین شاہد

۱۳۔محمد اسماعیل: جوائنٹ سکریٹری حلقہ ادب رنگوں

۱۴۔قاسم سلیمان ۱۵۔محمد عمر

۱۶۔محمد صلاح الدین برق ۱۷۔خواجہ بشیر احمد

یہ انور اعظمی کے برمی احباب، اہل قلم اور صحافیوں کے نام ہیں۔ان میں ایک مولانا عبدالاول صاحب اوچوکوں کی جامع مسجد کے امام تھے اور دوسرے محمد اسماعیل حلقہ ادب رنگوں کے جوائنٹ سکریٹری،افسوس یہ یادگار نمبر محفوظ نہیں رہ سکا۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو انور اعظمی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ اعظم گڑھ کے اردو کے اولین صحافیوں میں ہیں،مگر اس کے باوجود ماہنامہ زندگی رام پور میں جس کی انہوں نے ادارت بھی کی تھی ان کی بے وقت کی موت پر آنسو بہانا تو دور کی بات ہے معمولی تذکرہ بھی نہیں کیا گیا۔ماہنامہ معارف میں بھی ان کا ذکر نہیں آسکا۔ان کے علاوہ بھی باوجود تلاش کے کہیں اور ذکر نہیں ملا۔اس سے ہماری بے حسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔شاید ہم ہمیشہ ہی ایسے تھے، جیسے کہ آج ہیں۔؟ آج پھر یہ پرانی چوٹ ابھر آئی کہ اعظم گڑھ کے ادبا و شعرا اہل قلم اور مصنفین کا ایک ترجمان ہونا چاہئے۔ورنہ انور اعظمی مرحوم جیسے لائق اہل قلم اور شاعر و ادیب اور ان کی کاوشیں تاریکیوں کی نذر ہوتی رہیں گی۔میں اعظم گڑھ کے پچاسوں ایسے اہل علم اور ادبا و شعرا کو جانتا ہوں جو ہماری بے حسی کی نذر ہو گئے اور آج کوئی ان کا نام ونشاں بتانے والا بھی نہیں۔خدا بھلا کرے مولانا کوثر اعظمی مرحوم کا جنہوں نے ایک مفصل اور طویل مقدمہ ''اذان سحر'' پر سپرد قلم کر دیا تھا کہ آج انور اعظمی کی مختصر کتاب زندگی کے بعض ابواب محفوظ ہیں۔اس میں اصلاً ان کے برادر خورد راشد اعظمی (اشتیاق احمد اعظمی) کی کوششوں اور دلچسپیوں کا بڑا دخل ہے۔سست روی ہی سے سہی ان کی دلچسپی ہی کا نتیجہ ہے کہ انور اعظمی کی تمام نگارشات منظر عام پر آ گئیں۔ان کے بھانجے برادر گرامی سلطان احمد نے بھی اشاعت سے دلچسپی لی اور اذان سحر کے جدید ایڈیشن میں چند سطور لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے ماموں کے فکر وفن کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔بہر حال

انوراعظمی کا جوسرمایہ علم وادب ہمارے سامنے ہے وہ درج ذیل ہے:

۱۔اذان سحر۔نظموں کا مجموعہ

طبع اول ۱۹۶۷ء،انوراکیڈمی سرائے میر،طبع دوم اپریل ۲۰۱۷ء،منشورات۔دہلی

۲۔افسانے۔مکتبہ الحسنات دہلی،۲۰۱۵ء

۳۔مقالات۔مکتبہ الحسنات دہلی۔۲۰۱۶ء

۴۔نالہ شب۔مجموعہ غزلیات۔مکتبہ الحسنات دہلی۔۲۰۱۶ء

۵۔سدھار کی سبیل۔یہ خطبہ ناچیز کی نظر سے نہیں گذرا ہے۔

ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر کسی نے پی ایچ ڈی کی سند لی ہے،مگر اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

انوراعظمی کے برادر خورد راشداعظمی خود بہت اچھے شاعر تھے۔بالخصوص غزلوں کے وہ ایک منفرد شاعر تھے۔ان کا مجموعہ کلام ''نشاط غم'' اس دور میں جگر واصغر کی یاد دلاتا ہے۔اسی ادبی مذاق کی بدولت وہ انوراعظمی کی شعری ونثری نگارشات کے تحفظ میں نہ صرف کامیاب رہے بلکہ ان کی بدولت ان کے مجموعہ ہائے نظم ونثر پر چند عمدہ تحریریں بھی وجود میں آگئیں۔طوالت کے باوجود جس کا شکوہ رشید احمد صدیقی[۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] نے اپنی تعارفی تحریر میں کیا ہے آج انور اعظمی کے فکر وفن کے سمجھنے کے لئے مولانا کوثر اعظمی کا مقدمہ سب سے اہم تحریر ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی اور انیس اعظمی کی تحریریں بھی قابل ذکر ہیں۔البتہ زندگی کے مدیر مولانا سید احمد عروج قادری نے اذان سحر پر جو مفصل تبصرہ قلم بند کیا ہے اسے بھی کہیں محفوظ کیا جانا چاہئے۔

(ملاحظہ ماہنامہ زندگی۔فروری ۱۹۷۰ء)

گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ انوراعظمی برما میں نہ صرف کئی اخبارات سے وابستہ رہے اور انہیں ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کیا بلکہ برما کے مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی شعور بھی بیدار کیا۔اس کے لئے انہوں نے بعض اخبارات کا اجراء بھی کیا اور ترقی دینے کی کوشش بھی۔گو اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی،تاہم میں یہ سوچ کر حیران اور سخت متعجب ہوں کہ ایک شخص جو مدرسہ کا فاضل ہے اور جو جرنلزم کے الف اور باء سے واقف نہیں اس کی صلاحیت اور حوصلہ مندی کی داد دیجئے کہ وہ اپنے وطن میں نہیں دور دیس جا کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتا ہے۔

اوراس میدان صحافت کے منجھے ہوئے صحافیوں سے دادتحسین وصول کرتا ہے۔

عہد حاضر میں صحافت چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الکٹرانک میڈیا، ایک خاص مقصد کے تحت صحافت اور صحافیانہ کردار ادا کررہے ہیں۔انہیں انسانی اقدار و روایات کے تحفظ کا ذرا بھی خیال نہیں رہ گیا ہے۔معروضیت یا غیر جانب داری اب ان کے نزدیک کوئی اصول نہیں رہا۔ایسے حالات میں انور اعظمی مرحوم کی ۶۰۔۷۰ر برس پہلے کی صحافت اور اس میں ان کے معاصرین کا اعتراف کمال اس بات کا اعلان ہے کہ انور اعظمی فطری اور وہبی صلاحیتیں لے کر دنیا میں آئے تھے اور جو لمحہ زندگی انہیں ملا اس کا پورا حق ادا کیا۔کئی برمی اہل قلم نے اس کا ذکر و اعتراف انقلاب کے انور اعظمی نمبر میں کیا ہے۔انہیں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

انور اعظمی مرحوم کے اوصاف و کمالات میں صحافت کے ساتھ ان کی شاعری کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ وہ ان کی کتاب زندگی کا سب سے خوب صورت باب ہے۔اصلاً وہ شاعر تھے، بلکہ فطری اور وہبی شاعر تھے۔ان کی شاعری کا آغاز کب ہوا اور اس کی نشو ونما کن حالات میں ہوئی اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔البتہ وہ ماہنامہ زندگی کی ادارت کے زمانہ میں نظمیں اور غزلیں بھی کہتے تھے جو معاصر رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔برما کے مشاعروں میں بھی وہ شریک ہوتے تھے اور معاصر شعرا سے دادو تحسین حاصل کرتے تھے۔ان کا پہلا مجموعہ کلام ''اذان سحر'' جو ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، انور اعظمی کی شاعری کا بڑا دلکش اور دلفریب نمونہ ہے، اس میں جہاں افکار و نظریات کی ایک دنیا آباد ہے۔وہیں انور اعظمی کے فنی شعور اور شاعرانہ کمالات اس سے پورے طور پر اجاگر ہوتے ہیں۔ان کی متعدد نظمیں معاصر شعرا سے کسی درجہ کم رتبہ نہیں۔مستقبل، قید تنہائی، انتظار، حسن، عید کا چاند، خود شناسی، بہار تخلیق انسان، بلبل، اشتراکیت، مساوات، لال قلعہ، تاج محل اور یاران حرم وغیرہ انتہائی اہم نظمیں ہیں۔انہیں اردو شاعری میں ایک اضافہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ان میں بڑی تابانی ہے۔مذہبیت کے ساتھ حب الوطنی کے جذبات بھی پنہاں ہیں۔ان کے موضوعات شعر میں ایک اہم موضوع ان کا تاریخی اور تہذیبی شعور ہے۔ان کا مطالعہ و مشاہدہ عمیق ہے۔زبان و بیان پر بے پناہ قدرت دکھائی دیتی ہے۔اذان سحر کے مطالعہ و تجزیہ کا حاصل یہ ہے کہ انور اعظمی اپنے عہد کے ممتاز اور بڑے باکمال نظم نگار تھے۔ان کی نظم نگاری کی

متعدد داد باو شعرا نے داد دی ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کی مثالیں حذف کی جاتی ہیں۔

اذان سحر کی اشاعت ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ اس کے ۴۸ رسال بعد ان کی غزلوں کا مجموعہ ''نالہ شب'' مکتبہ الحسنات دہلی سے شائع ہوا ہے۔ دیباچہ میں اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی ہے کہ یہ مجموعہ اب تک کہاں تھا، کس نے مرتب کیا اور کن اصولوں پر کیا۔ نظر ثانی کس نے کی۔ راقم نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نالہ شب خود شاعر کا مرتب کردہ مجموعہ غزلیات ہے جو ان کے کاغذات میں ان کی اہلیہ کے پاس محفوظ تھا۔ راشد اعظمی نے انہیں شائع کر کے صحیح بات تو یہ ہے کہ ادبی دنیا پر احسان کیا ہے۔ اگر وہ توجہ نہ دیتے تو سوز و ساز، فکر و نظر اور خواب و خیال کی باتیں خواب وخیال ہو جاتیں۔

نالہ شب کی اشاعت سے پہلے ان کے برادر خورد راشد اعظمی کے مجموعہ کلام پر ناچیز نے ماہنامہ الرشاد میں تبصرہ لکھا تھا اور اب انور اعظمی کے نالہ شب کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دونوں بھائیوں کے زمانے جدا جدا ہیں، لیکن دونوں کی پرواز ایک ہی فضا میں ہے۔ البتہ ایک کے یہاں ذات و کائنات کا شعور زیادہ گہرا ہے تو دوسرے نے شعری روایتوں کے مطالعہ کے ساتھ جدت و انفرادیت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ بلاشبہ نالہ شب اور نشاط غم دونوں بہت خوب صورت غزلوں کے مجموعے ہیں۔ ماضی قریب میں اعظم گڑھ کے شعری آسمان پر یہ دونوں مجموعہ غزلیات روشن آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں محض چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

انور اعظمی

جان دے دی نقش پائے یار پہ انور مگر
عشق پھر بھی ایک شوق رائگاں سمجھا گیا

مرے خدا تری دنیا میں یہ پسند آیا
جنوں تو عام ہے لذت جنوں کی عام نہیں

اس کا نغمہ محفل ہستی پہ چھا سکتا نہیں
جو شکست دل کی دھن پر گنگنا سکتا نہیں

راشداعظمی

شعور عشق نے بخشی وہ زندگی مجھ کو
ہجوم غم میں بھی ہوتی ہے اب خوشی مجھ کو

یقیں کی وادی پر نور تک بھی پہنچیں گے
حصار وہم و گماں سے نکل رہے ہیں ابھی

عالم آب و گل میں اے راشد
اک حسیں خواب زندگانی ہے

ناچیز پر بے جا تحسین کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے مگر وہ لوگ میرے خیالات سے اتفاق کریں گے جو نالہ شب سے بیدار ہوکر آفتاب تازہ کے جلو میں صبح امید کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی گواہی دیں گے کہ انور اعظمی اپنی نظموں کے ساتھ غزلوں میں بھی تغزل اور تفکر کی آمیزش سے ذوق و وجدان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان اشعار سے جذبہ عمل کو مہمیز کرتے ہیں۔ افسوس کہ انور اور راشد دونوں سے ہماری ادبی دنیا نے انصاف نہیں کیا۔

انور اعظمی کی ادبی زندگی کا ایک گوشہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ وہ افسانہ کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ پاگل، دوپٹے کا پھندہ، گرہن، مرشد، فیصلہ کن، آزادی کے بعد اور کالا ہاتھ جیسے افسانے دل و دماغ میں اضطراب پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے ان کے افسانوں کے مجموعہ ''افسانے'' پر پیش لفظ لکھتے ہوئے پریم چند [۱۸۸۰-۱۹۳۶ء] کا نام لیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید بے شعوری میں ان کے لب پر پریم چند کا نام آ گیا ہوگا۔ بلاشبہ پریم چند ایک بڑے فن کار کا نام ہے اور جدید روشن خیالی سے بھی ان کا ادبی شعور عبارت ہے۔ مگر انور اعظمی کے افسانے فکری و فنی ہر دو لحاظ سے ان

سے منفرد اور یکسر مختلف ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ انور اعظمی کے شعور کی افاقیت اور رچے ہوئے فنی شعور، ہیئت و کردار اور ان کے کرداروں کی انسانیت نوازی، رحم دلی، معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں پریم چند سے کہیں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ کمی ہے تو یہ کہ ہم نے اور ہمارے نقادوں نے اس اسلام پسند افسانہ نگار کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور نہ صرف ان کے افکار و خیالات بلکہ ان کے افسانے بھی گوشہ گمنامی میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے۔ ہم نے اب تک ان کا فنی تجزیہ بھی نہیں کیا۔ البتہ ڈاکٹر فیاض صاحب نے انور اعظمی کے افسانوں پر بڑا اچھا مضمون لکھا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی مرحوم نے ان چند رسائل کے نام لئے ہیں جن میں وہ شائع ہوئے مثلاً معیار، انوار، فردوس، سلسبیل اور حیات نو وغیرہ۔ ان رسائل کی محدود دنیا نے انور اعظمی کے فکر و فن کی شہرت کو فصیل شہر سے باہر جانے نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انور اعظمی اپنے عہد کے ایک معیاری افسانہ نگار ہیں۔ ان کی عظمت کہانیوں کی اس سیریز سے اور بڑھ جاتی ہے جو انہوں نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں: ایک بات۔ لہرو۔ مسلمان لڑکے۔ کچھ دن گھر سے دور۔ شاہین۔ مغرب بعد۔ اس سیریز کو البدر بک سینٹر سرائے میر نے شائع کیا ہے۔ یہ کہانیاں ادب اطفال کا بنیادی حصہ ہیں۔ افسانوں کی دنیا میں بالخصوص ادب اطفال کے میدان میں کون ہے جو بچوں کی ان کہانیوں سے واقف ہے؟ حالانکہ بچوں کی یہ کہانیاں آج بھی بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لئے ایک ڈرامہ ''براہیم'' بھی لکھا ہے۔ جو برابر شائع ہوتا ہے۔ اور بچوں میں خاصا مقبول ہے۔

اعظم گڑھ کے ادبی سرمایے کا اگر جائزہ لیا جائے تو انور اعظمی کا ادبی سرمایہ اور ادبی سفر مختصر ہونے کے باوجود فکری و فنی عظمت میں معاصر ادباء و شعراء سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ ذہنی اور فکری آسودگی کے لئے ان کے افسانے ممکن ہے کم کارآمد ہوں لیکن ان کی شاعری اذان سحر اور نالہ شب دیر و کلیسا کا مزاج برہم کرنے کے لئے کافی ہیں۔

انور مری اذان سحر کچھ نہ ہو مگر
برہم مزاج دیر و کلیسا ہوا تو ہے

ooo

ممتاز مورخ پروفیسر احمد سعید

۱۳رجنوری ۲۰۲۱ء کو ہمارے ایک علمی محسن، نامور اہل قلم اور مورخ و مصنف جناب پروفیسر احمد سعید [۱۹۴۲-۲۰۲۰ء] صاحب نے داغ مفارقت دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی طبیعت کئی ماہ سے خراب چل رہی تھی، درازی عمر کے سبب کمزور بھی ہو گئے تھے، مگر وہ اپنی بیماری اور نقاہت کے ذکر سے عموماً احتراز کرتے تھے۔ اتنے دنوں میں انہوں نے محض ایک بار اس کا ذکر کیا۔ چونکہ وہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، اس لئے کھٹکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ چراغ بجھ نہ جائے۔ مگر وہ تھے بڑے ہمتی اور حوصلہ مند۔ خود کو علمی و تحقیقی کاموں میں مستقل مصروف رکھتے تھے اور تلاش و تحقیق کا کام کرتے رہتے تھے۔ ادھر انہوں نے اپنی بعض کتابوں پر نظر ثانی کی اور متعدد اضافات کے ساتھ نیا ایڈیشن تیار کیا۔ انہیں وہ جلد شائع کرانا چاہتے تھے، مگر مشیئت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور وہ راہی ملک عدم ہوئے۔

پروفیسر احمد سعید صاحب ہمارے عہد کے نہایت ممتاز اور معتبر اہل قلم اور مورخ تھے۔ انہوں نے لکھا اور خوب لکھا اور خوب خوب داد تحقیق و تصنیف دی۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ تاریخ و تذکرہ، اس عہد کی شخصیات، خصوصاً برصغیر کی تاریخ پر ۴۰ر سے زاید مفید کتابیں ان کے قلم سے نکل کر اہل علم کے درمیان قابل قدر اور لائق تحسین و ستائش ٹھہریں۔ ان کی تحقیقات و تصنیفات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

تاریخ کے وہ طالب علم بھی رہے اور استاذ بھی۔ مختلف کالجوں میں پڑھا پڑھایا۔ تاریخی بلکہ تحقیقی کتابیں سپرد قلم کیں اور مدۃ العمر کاغذ، قلم اور کتاب سے تعلق رکھا اور انہیں کے درمیان اپنی پوری زندگی گذار دی۔ صحیح یہ ہے کہ وہ نہ صرف پاکستان بلکہ غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ کے بڑے واقف کار تھے۔ حتیٰ کہ اس کے نشیب و فراز سے بھی واقف تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علمی کاموں کو

شرف قبولیت بخشے۔

پروفیسر احمد سعید ۲۱ر نومبر ۱۹۴۲ء کو مشرقی پنجاب پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی وثانوی تعلیم کے بعد ۱۹۵۸ء میں چشتیہ ہائی اسکول لاہور سے میٹرک اور ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ اور سیاسیات میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے ایم اے او کالج لاہور اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے ممتاز اساتذہ سے تحصیل علم کیا۔ ان میں کرنل محمد اسلم، حافظ نذر احمد بانی شبلی کالج لاہور، خواجہ صادق حسن، ایم ایف بھٹی، ڈاکٹر عبدالحمید، جان جی ویسٹو، نعیم قریشی، یار محمد خاں، ڈاکٹر میور، پیٹر ہارڈی، علی عباس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان کے اساتذہ میں بعض محض استاذ تھے۔ ان کی ساری توجہ تعلیم وتربیت پر رہتی تھی، لیکن بعض اساتذہ اہل قلم تھے۔ وہ تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور انہوں نے بعض اہم کتابیں بھی لکھیں۔

پروفیسر احمد سعید نے تحصیل علم کے بعد ۱۹۶۷ء میں ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۸ء تک لاہور کے ایم اے او کالج میں تاریخ کے استاذ رہے۔ ۱۹۸۹ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے شعبہ تاریخ کے سربراہ منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں قائد اعظم بین الاقوامی کانگریس منعقدہ لاہور اور ۱۹۷۷ء میں لاہور میں منعقدہ بین الاقوامی کانگریس میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۲۰۰۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر احمد سعید نے تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی بڑے پیمانہ پر انجام دیا جو ان کی کتاب زندگی کا سب سے اہم اور روشن باب ہے۔ اس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے تن تنہا وہ کارنامہ انجام دیا جسے ادارے انجام دیا کرتے ہیں۔ انہوں نے مضمون نگاری کا آغاز رسالہ ''قندیل'' لاہور سے کیا تھا۔ ابتدا میں چھپنے کے شوق میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھا کرتے۔ پھر آہستہ آہستہ مقالات اور کتابیں لکھنے لگے اور ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا جس پر لکھتے ہوئے لوگ گھبراتے تھے۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اور تحریک آزادی۔ خالد ندیم پبلی کیشنز راولپنڈی طبع اول

۱۹۷۲ء۔طبع دوم۱۹۸۴ء۔طبع سوم۲۰۱۲ء

۲۔حصول پاکستان۔ایجوکیشنل بک امپوریم لاہور۱۹۷۲ء

۳۔ذکر مجذوب۔ایجوکیشنل بک امپوریم،لاہور۱۹۷۳ء،طبع دوم الفیصل ۱۹۹۴ء

۴۔بزم اشرف کے چراغ۔احیاء العلوم لاہور مئی ۱۹۷۵ء۔طبع دوم۱۹۹۰ء ۔طبع سوم المیزان لاہور۲۰۰۵ء

۵۔قائداعظم اور مسلم پریس۔ایجوکیشنل بک امپوریم لاہور ۱۹۷۶ء

۶۔اشاریہ قائداعظم۔اسلام آباد۱۹۷۶ء

۷۔گفتار قائداعظم۔اسلام آباد جون ۱۹۷۶ء

۸۔اقبال اور قائداعظم،اقبال اکادمی لاہور،۱۹۷۷ء،طبع دوم ۱۹۸۹ء،طبع سوم۲۰۰۰ء

۹۔حیات قائداعظم: چند نئے پہلو۔اسلام آباد۱۹۷۸ء

۱۰۔قائداعظم مسلم پریس کی نظر میں۔کراچی۱۹۸۱ء

۱۱۔تحریک پاکستان معاشی اور معاشرتی تناظر میں،پاکستان اسٹڈی سینٹر لاہور۱۹۸۵ء

۱۲۔انجمن اسلامیہ امرت سر۔ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور۱۹۸۶ء

۱۳۔روزنامہ زمیندار اور تحریک آزادی: توضیحی اشاریہ۔اسلام آباد۱۹۸۸ء

۱۴۔روزنامہ پیسہ اخبار اور تحریک آزادی،توضیحی اشاریہ۔اردو اکیڈمی لاہور۲۰۰۳ء

۱۵۔اسلامیہ کالج لاہور کی صد سالہ تاریخ ۱۸۹۲-۱۹۹۲ء،جلد اول، ریسرچ سوسائٹی لاہور،۱۹۹۲ء

۱۶۔اسلامیہ کالج لاہور کی صد سالہ تاریخ ۱۸۹۲-۱۹۹۲ء۔جلد دوم، ریسرچ سوسائٹی ، لاہور،۲۰۰۱ء

۱۷۔مسلمانان پنجاب کی سماجی اور فلاحی انجمنیں۔لاہور۲۰۰۴ء

۱۸۔نگارشات حمید نظامی۔لاہور۲۰۰۵ء۔

۱۹۔نوائے وقت اور تحریک آزادی۔لاہور۲۰۰۵ء

۲۰۔حمید نظامی کے کالم۔مغربی پاکستان،اردو اکیڈمی لاہور۲۰۰۶ء

۲۱۔دو قومی نظریہ منہ بولتے حقائق۔لاہور ۲۰۰۶ء۔طبع دوم ۲۰۰۹ء،

۲۲۔روز نامہ زمیندار، لاہور مقالہ ہائے افتتاحیہ وشذرات۔۱۹۲۳ء جلد اول جنوری تا اپریل ۱۹۲۳ء۔ظفر علی خاں ٹرسٹ لاہور ۲۰۱۲ء

۲۳۔ایضاً۔جلد دوم مئی تا اگست ۱۹۲۳ء۔ظفر علی خاں ٹرسٹ لاہور، ۲۰۱۲ء

۲۴۔ایضاً جلد سوم، لاہور ستمبر تا دسمبر ۱۹۲۳ء۔ظفر علی خاں ٹرسٹ ۲۰۱۲ء

۲۵۔روز نامہ زمیندار لاہور مقالہ ہائے افتتاحیہ وشذرات ۱۹۲۴ء جلد اول جنوری تا اپریل ۱۹۲۴ء۔

۲۶۔روز نامہ زمیندار لاہور ۱۹۲۴ء۔لاہور جلد دوم مئی تا اگست ۱۹۲۴ء

۲۷۔ایضاً جلد سوم ستمبر تا دسمبر ۱۹۲۴ء۔لاہور ۲۰۱۵ء۔

۲۸۔اقبالیات نوائے وقت مارچ ۱۹۴۰ء تا مارچ ۱۹۴۷ء، شیخ غلام علی لاہور، ۲۰۱۵

۲۹۔گفتار ظفر علی خاں جلد اول ظفر علی خاں ٹرسٹ ۲۰۱۵ء

۳۰۔چند تاریخی خطوط بنام احمد سعید۔اردا کیڈیمی بہاول پور، ۲۰۱۵ء

۳۱۔نگارشات ظفر علی خاں۔ظفر علی خاں ٹرسٹ، لاہور ۲۰۱۷ء

۳۲۔لاہور کی ثقافتی تاریخ۔زیر تکمیل۔

پروفیسر احمد سعید نے چند کتابیں انگریزی میں بھی لکھیں۔ان کے نام یہ ہیں۔

(1) Writings of Quaid-i-Azam (Progressive Books, Lahore 1976, Nazaria-i-Pakistan Trust, 2014)

(2) The Eastern Times on Quaid-i-Azam (National Commission on Historical and Cultural Research, Islamabad, 1983)

(3) Visitors of Quaid-i-Azam (Bazm-i-Iqbal, Lahore, 1990)

(4) Reflections on Pakistan - Economic Aspect (Bazm-i-Iqbal, Lahore, 1991)

(5) Reflections on Pakistan - Political Aspect (Research Society of Pakistan, Lahore, 1992)

(6) Muslim India 1857-1947 : A Biographical Dictionary (Pakistan Historical Research Institute, Lahore, 1997)

(7) Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah - A Bunch of RareLetters, (Pakistan Historical Research Institute,

ان کتابوں کے علاوہ سیکڑوں مضامین ومقالات بھی ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہوئے۔ ان کے مضامین ومقالات عموماً پاکستانی رسائل وجراید میں شائع ہوئے ہیں، البتہ بعض ہندوستانی رسائل وجراید نے بھی ان کے مضامین نقل کئے۔

پروفیسر احمد سعید صاحب ایک بڑے اشاریہ نگار بھی تھے۔انہوں نے کئی اخبارات ورسائل کا اشاریہ تیار کیا۔اس میں پیسہ اخبار لاہور کا توضیحی اشاریہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔یہ اشاریہ ناچیز کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔اسی اشاریہ سے میں نے انہیں اور بعض دوسرے اہل علم کو علامہ شبلی کی نادر تحریروں کی ایک فہرست بنا کر بھیجی اور ان سے فراہم کرنے کی درخواست کی تھی، مگر ان کے سوا کسی نے توجہ نہیں دی۔انہوں نے اس فہرست کی متعدد تحریریں بھیجیں۔البتہ چند تحریریں وعدہ کے باوجود اپنی مصروفیات کے سبب نہ بھیج سکے۔دیکھئے اب وہ کیسے دستیاب ہوتی ہیں۔

ان کے نام اور کام سے میں برسوں سے واقف تھا، مگر ان سے اور ان کی کتابوں سے استفادہ میں دونوں ممالک کی سرحدیں اور تلخ تعلقات حائل رہے۔ان کی پہلی تصنیف جو راقم کے مطالعہ میں آئی وہ ''بزم اشرف کے چراغ'' ہے۔اس میں انہوں نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی [۱۸٦۸-۱۹۴۳ء] کے خلفاء کا تذکرہ لکھا ہے۔علامہ شبلی کے دو شاگرد مولانا عبدالباری ندوی فلسفی [۱۸۸۹-۱۹۷٦ء] اور مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] بھی ''بزم اشرف'' کے چراغوں میں شامل ہیں اور ان کا بھی کتاب میں تذکرہ شامل ہے۔انہی کے مطالعہ کے لئے بزم اشرف کا مطالعہ کیا تھا۔

واٹس ایپ کا زمانہ آیا تو اس ناچیز کا ان سے رابطہ قائم ہوا۔مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور تقریباً دو سال کی مدت تک ہم میں برقی روابط قائم رہے۔ایک روز انہوں نے بتایا کہ میں آپ سے اور آپ کے کاموں سے پہلے سے واقف ہوں۔ان کے علمی تعلق سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ خاص طور پر مطالعات شبلی سے متعلق میں انہیں حوالے ڈھونڈ کر دیتا اور وہ وہاں سے قدیم اخبارات بالخصوص زمیندار، پیسہ، دکن ریویو اور پنجاب ریویو وغیرہ کے تراشے اور مضامین ومراسلات کے عکس ونقش فراہم کرتے۔کبھی کبھی وہ خود بھی علامہ شبلی کے متعلق تحریریں نقل کر کے بھیجتے۔جو لوگ علمی کام کرتے ہیں انہیں صحیح اندازہ ہوگا کہ اخبارات ورسائل سے مضامین نقل کرنا کتنا دشوار اور

صبر آزما کام ہے۔ میں جب ان کے ان احسانات کا ذکر کرتا تو وہ کہتے کہ یہ تو علمی تعاون ہے اور ہمیں بہر حال تعاون کرنا ہے۔ وہ آپ نہ ہوتے کوئی بھی ہوتا، ہم اس کا ضرور تعاون کرتے۔ گذشتہ دو برسوں میں انہوں نے میرا بڑا علمی تعاون کیا۔ وہ بیمار ہوئے تو اس بیماری میں بھی موبائل سے مضامین کے عکس لے کر بھیجتے رہتے۔ ان کے انتقال سے چار روز پہلے میری ان سے کئی مضامین کے سلسلہ میں باتیں ہوئی تھیں اور انہوں نے کہا کہ میں پنجاب لائبریری سے معلوم کر کے آپ کو مطلع کرتا ہوں بلکہ فراہم کروں گا۔

علامہ شبلی کا ایک مراسلہ پیسہ اخبار لاہور میں شائع ہوا ہے۔ اس کی دو قسطیں انہوں نے فراہم کیں۔ تیسری قسط کا صحیح حوالہ نہیں مل سکا تو میں نے قیاساً ان سے ایک تاریخ بتائی کہ اس تاریخ میں شائع ہوا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب پبلک لائبریری سے رابطہ قائم کیا اور اس کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ ان لوگوں نے امرتسر میں ایک لائبریرین اور کتابوں کے ایک بڑے شائق سے اس سلسلہ میں بات کی۔ انہوں نے اس امید پر مجھ سے رابطہ قائم کیا کہ علامہ شبلی سے متعلق ہے اس لئے بآسانی بتا سکتا ہوں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ میں ہی اس کی تلاش میں ہوں اور میں نے ہی پروفیسر احمد سعید کو پریشان کر رکھا ہے۔ آپ اس واقعہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ پروفیسر احمد سعید صاحب تشنگان علم وفن کے علمی تعاون میں کس درجہ غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ مراسلہ مجھے ابتک نہیں مل سکا ہے اور اب اس کے ملنے کی بظاہر امید بھی نہیں معلوم ہوتی۔

وہ اہل علم ودانش کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اپنے دوست ڈاکٹر رفیق افضل کے انتقال پر مجھے لکھا کہ

> ''اس وقت طبیعت کچھ پریشان ہے۔ کل میرے ایک بہت ہی عزیز دوست ڈاکٹر رفیق افضل کا انتقال ہو گیا۔ موصوف ایک نامور مورخ تھے۔ ان کی اہم کتابوں میں ''گفتار اقبال'' اور A History of the All India Muslim League شامل ہیں۔ دعا فرمایئے اللہ تعالی اپنا کرم فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔''

ان کی فراہم کی ہوئی جو تحریریں پڑھنے میں مجھے دقت اور دشواری ہوتی اسے وہ نقل کر کے

بھیج دیتے۔حوالے چھوٹ جاتے اور میں انہیں یاد دلاتا تو اسے تلاش کرکے بھیجتے۔کچھ نقول ایسی تھیں کہ پڑھی نہیں جارہی تھیں۔ میں نے اس پریشانی کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ حل نکالا کہ آڈیو کلپ بنا کر بھیجنے لگے۔اس طرح میرے پاس ان کے کئی کلپ آگئے اور اب بعداز مرگ انہیں سننے کی تاب نہیں۔آنسو نکل آتے ہیں اور دل بے قابو ہوا جاتا ہے۔اللہ تعالی ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔

ایک بار میں نے ان سے بار بار پریشان کرنے کا ذکر کیا تو انہوں نے لکھا کہ ''آپ اس طرح نہ لکھا کیجئے۔اہل علم کی خدمت کرنا تو فرض ہے۔'' دیکھئے اب یہ فرائض کون یاد رکھتا ہے۔ اس مصروف ترین دنیا میں ان پرانی قدروں کے وارث ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے ہیں۔ بھلا اب ان زریں قدروں کو کون برتے اور نبھائے گا۔

وہ جب لائبریری جاتے اور کتب ورسائل اور اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے انہیں علامہ شبلی نعمانی سے متعلق کسی طرح کی معلومات مل جاتیں تو فوراً اسے میرے پاس بھیج دیتے۔ ایک بار پنجاب پبلک لائبریری گئے تو مجھے لکھا کہ

''السلام علیکم

آج بہت مدت کے بعد پنجاب پبلک لائبریری جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ایک دوست کی وساطت سے زمیندار کا پہلا فائل جون ۱۹۰۳ء یہاں اسکین کروالیا تھا،اس کے مطالعہ کے دوران مولانا شبلی کے حوالہ سے ایک تحریر آپ کی نذر ہے۔

میں اس کوشش میں ہوں کہ کسی صورت آپ تک اپنی کتاب ''روزنامہ زمیندار شذرات،ادارئے'' بھیج دوں۔یہ دو برسوں کے اداریوں کا مجموعہ ہے،یعنی ۱۹۲۳ء/۱۹۲۴ء۔یہ چھ جلدوں میں ہیں اور ایک جلد ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بڑے سائز پر ہے۔یہ اس دور کی تاریخ ہے۔ (۱۱/مارچ ۲۰۲۰ء)

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انجمن اسلامیہ امرت سر سے علامہ شبلی کا بھی یک گونہ تعلق رہا ہے۔ مین نے انجمن کی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔ایک روز میں نے

پروفیسر احمد سعید سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے انجمن کی ۱۹۷۳ سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ لکھی ہے جو کتابی صورت میں دانش گاہ پنجاب لاہور سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوچکی ہے۔ پھر انہوں نے اس کے ضروری حصے کا عکس بھیجا کہ میں استفادہ کرسکوں۔

۱۱/مارچ ۲۰۲۰ء کو وہ پھر پنجاب پبلک لائبریری گئے اور قیمتی رسائل وجرائد دیکھے۔ وہ اپنے کاموں کے درمیان جہاں کہیں بھی شبلی لکھا ہوا دیکھتے فوراً میرے لئے اسے محفوظ کر لیتے۔ ۱۲/مارچ کو انہوں نے لکھا کہ

> ''کل پنجاب پبلک لائبریری سے بہت سی چیزیں ملی ہیں۔ میں اب انہیں علاحدہ کر کے آپ کو ارسال کرتا ہوں۔ اس میں مولانا شبلیؒ کی وفات پر لکھی گئی تضمین ہیں۔ اور ندوہ کی ہڑتال کے سلسلے میں بہت کچھ ہے۔ اس وقت میرے سامنے مولانا ظفرعلی خاں کا رسالہ پنجاب ریویو ہے۔ اس میں مولانا شبلی کا ایک مضمون ہے، جو فروری ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ کیا اس کو تلاش کر کے بھیج دوں۔''

ابھی میں آں محترم کو کچھ جواب لکھتا کہ مولانا غلام رسول مہر[۱۸۹۳-۱۹۷۱ء] کے صاحب زادے جناب امجد سلیم علوی صاحب نے پنجاب ریویو کی متعدد تحریریں بھیج دیں۔ اس میں علامہ شبلی کی ایک غیر مدون فارسی غزل بھی تھی، جو کلیات شبلی فارسی میں شامل نہیں ہے۔ اسے میں نے چند دوسری غیر مدون تحریروں کے ذکر کے ساتھ اشاعت کے لئے ماہنامہ معارف میں بھیج دیا ہے۔ اس طرح پروفیسر احمد سعید نے بہت ساری معلومات فراہم کیں، لیکن ان کی بیماری اور خراب صحت کی وجہ سے اور بہت سی تحریریں دستیاب ہونے سے رہ گئیں، تاہم انہوں نے میرا بڑا علمی تعاون کیا، جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا، بلکہ ایک موقع ایسا آیا کہ ان کی بھیجی ہوئی بعض تحریریں جو ناقابل خواندہ تھیں، میں نے اس طرف متوجہ کیا تو کہنے لگے کہ اب میں نقل بھیجنے کے بجائے ہاتھ سے صاف کر کے بھیجتا ہوں۔ چنانچہ بعض تحریریں نقل کر کے بھیجیں۔ اللہ تعالی انہیں اس نیک عمل کا بدل اپنے دربار سے عطا کرے۔ سچ یہ ہے کہ ان کی وفات سے میں اپنے ایک بڑے کرم فرما اور ملت ایک بڑے مصنف سے محروم ہوگئی۔

پروفیسر احمد سعید صاحب نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں کئی ایسی ہیں جن کی دوسری اور تیسری جلدیں بھی اشاعت کے لئے تیار تھیں۔ بعض نئے موضوعات پر بھی ان کی کئی کتابیں مکمل ہو چکی تھیں، مگر وہ انہیں شائع نہیں کرا سکے۔ اب یہ اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ باقیات احمد سعید نہ صرف محفوظ رہے بلکہ جلد از جلد شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

پروفیسر احمد سعید سے میری آخری گفتگو ۹ رجنوری ۲۰۲۱ء کو یعنی انتقال سے چار روز پہلے ہوئی تھی۔ چونکہ میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ میں نے ان سے دعا کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ

> ''میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کئی ماہ سے مختلف بیماریوں نے گھیر رکھا ہے۔ پہلے شدید قسم کے قبض نے پریشان رکھا۔ پھر عوارض قلب۔ پھر جسم پر شدید قسم کی خارش۔ آپ میرے لئے دعا کیجئے، میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں۔''

یہ اقتباس پہلا ایسا اقتباس ہے جس میں انہوں نے اپنی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ وہ عموماً اپنی ذاتی باتوں سے احتراز کرتے تھے۔ حالانکہ اب ان سے میرے بے تکلفانہ مراسم ہو گئے تھے۔ غرض پروفیسر احمد سعید مرحوم نہ صرف سچے اہل علم اور محقق و مصنف تھے بلکہ اہل علم کے ایک محسن، مربی اور بڑے قدرداں بھی تھے۔ اللہ تعالی ان کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے۔ اور ان کی نیکیوں کا اجر جزیل عطا فرمائے۔

پروفیسر احمد سعید کی گراں قدر خدمات کا اہل علم اور ارباب حکومت نے اعتراف بھی کیا اور انہیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ حتیٰ کے صدارتی اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا، لیکن سب سے بڑا اعزاز اور صدقہ جاریہ تو یہ ہے کہ ان کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور ان سے استفادہ کیا جارہا ہے۔ بلاشبہ پروفیسر احمد سعید کی وفات دنیائے علم و تحقیق کا ایک بڑا اور جلد پر نہ ہونے والا خلا ہے۔ اللہ تعالی ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ اور انہیں اعلی علیین میں جگہ دے۔ آمین

ooo

آہ! محمد فاروق اعظمی

۵/اپریل ۲۰۲۱ء کو شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کے ایک فرزند، ممتاز اہل قلم، استاد، ماہر تعلیم اور معروف علمی شخصیت محمد فاروق اعظمی نے جل گاؤں میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انـا لـلـہ وانا الیہ راجعون۔

ظہر بعد جل گاؤں کے محلّہ مہرون اقبال کالونی کے قبرستان میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

ماسٹر محمد فاروق اعظمی صاحب قصبہ مبارک پور سے متصل ایک موضع لوہیا کے باشندہ تھے، ۱۹۳۸ء میں لوہیا ہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور ایم پی انٹر کالج مبارکپور میں حاصل کی۔ بعد ازاں ویسلی انٹر کالج شہر اعظم گڑھ سے انٹر میڈیٹ اور شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ سے بی اے اور بی ایڈ کیا۔ اردو اور انگریزی ان کے خاص مضامین تھے۔

تحصیل علم کے بعد مہاراشٹر کے شہر جل گاؤں میں ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ کچھ دن بعد اینگلو اردو ہائی اسکول جل گاؤں میں اردو کے استاذ مقرر ہوئے۔ ترقی کرکے اس کے پرنسپل ہوئے۔ اور پھر پوری زندگی اسی جل گاؤں میں تعلیم وتدریس اور ادب کی خدمت میں گذار دی۔ اور پھر اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

فاروق اعظمی جس زمانہ میں شبلی نیشنل کالج میں طالب علم تھے وہ اس کے شباب کا زمانہ تھا۔ مرحوم شوکت سلطان صاحب پرنسپل تھے۔ ان کے اساتذہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر سید اعجاز الحسن، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، مسعود الحسن موسوی، عبدالمنان ہلالی اور صاحب حکیم الاوقات ڈاکٹر عبدالحکیم کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں وہ شمس الرحمٰن فاروقی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے زیادہ مستفید ہوئے اور ان کے علم

وفضل کے بڑے معترف اور مداح تھے۔جس طرح وہ صباح الدین صاحب کی اردوشعروادب پر
گہری نگاہ کے مداح تھے،اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی کی انگریزی زبان وادب پر ماہرانہ نظر کے
بھی قائل اور معترف تھے۔ یہ بات کم لوگوں کومعلوم ہوگی کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم
دارالمصنّفین کی رفاقت کے ساتھ شبلی نیشنل پی جی کالج میں اردو کے اور شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم
انگریزی کے استاذ تھے۔ فاروقی صاحب شبلی کالج اعظم گڑھ کے زمانہ ملازمت میں IAS امتحان
میں شریک ہوئے اوراول ولہ میں کامیاب ہوکرافسر مقرر ہوئے۔فاروق اعظمی نے اس دور کے
شبلی کالج کا بڑا خوب صورت نقشہ اپنی خودنوشت ''یادوں کے چراغ ''میں کھینچا ہے۔

فاروق اعظمی مرحوم مدۃ العمر تدریس سے وابستہ رہے اور بے شمار لوگوں کوفیض پہنچایا۔ان
کے تلامذہ ان کی تدریس کے ساتھ ان کی نیکی اورشرافت کے مداح ہیں۔ وہ نہ صرف استاد کی
حیثیت سے بلکہ پرنسپل کی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہے۔

بلاشبہ ان کی تعلیم اورفن تعلیم پر گہری نظر تھی۔انہوں نے فن تعلیم وتربیت کی تحصیل شبلی نیشنل
کالج کے انتہائی ممتاز اساتذہ سے کی تھی۔ پھر درس وتدریس سے وابستگی اوران کے اپنے تجربات و
مشاہدات نے ان کی صلاحیتوں میں اوراضافہ کردیا تھا۔انہوں نے نہ صرف عملی تدریس کا بہتر اور
مثالی نمونہ پیش کیا بلکہ ان موضوعات پرانہوں نے متعدد مضامین بھی لکھے۔جن کا ایک مجموعہ''
مسلمانوں کے تعلیمی مسائل'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔اردو اساتذہ کے لئے یہ ایک بیش قیمت
مجموعہ مضامین ہے۔اس سے تعلیم وتدریس کے بہت سے مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔

فاروق اعظمی مرحوم ایک عمدہ اہل قلم اور مضمون نگار بھی تھے۔کئی کتابیں ان کے قلم سے
نکلیں۔تعلیمی مقالات کا ذکراوپر آچکا ہے ۔انہوں نے فریضہ حج ادا کیا تو اس کا ایک بڑا روح
پروراوربصیرت افروز سفرنامہ لکھا اوراس خوب صورت انداز میں لکھا ہے کہ پڑھنے کے بعد سفرحج
اورزیارت حرمین شریفین کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ صرف سفرنامہ ہی نہیں بلکہ حج بیت اللہ کی
ایک گائڈ بھی ہے۔

۲۰۰۷ء میں یعنی آج سے ۱۳/برس پہلے ان کی خودنوشت ''یادوں کے چراغ'' شائع ہوئی
تھی۔اس میں انہوں نے مبارک پور سے جل گاؤں تک کے اپنے علمی وتعلیمی سفر کی روداد قلم بند کی

ہے۔اور اس خوب صورتی سے قلم بند کی ہے کہ ایک بار کتاب ہاتھ آجائے تو بغیر پوری کتاب پڑھے ہوئے قرار نہیں آسکتا۔اس کے معلومات افزا ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔اس خودنوشت کی اس قدر خوب صورت اور پاکیزہ نثر لکھی ہے کہ ایسی کم خودنوشتوں کی زبان ملے گی۔

اپنی پیدائش، ابتدائی تعلیم، وطن، شبلی نیشنل کالج، کالج کے اساتذہ، احباب و معاصرین، اس دور کے شبلی کالج اور اس کی تعلیمی و ادبی سرگرمیاں، ماحول، معیار و مذاق غرض سب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔شبلی کالج کی تاریخ لکھنے والوں کو اس سے بڑی مدد ملے گی۔اس دور کے اعظم گڑھ شہر اور اس کے باشندوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اعظم گڑھ شہر میں ۱۹۵۵ء میں بڑا زبردست سیلاب آیا تھا اور شہر کو محفوظ رکھنے والا باندھ لال ڈگی کا باندھ ٹوٹ گیا تھا جس سے شہر میں پانی آ گیا تھا۔اس سیلاب نے بڑی تباہی و بربادی مچائی تھی۔فاروق صاحب نے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

تحصیل علم کے بعد وہ جل گاؤں میں استاذ مقرر ہوئے تو جل گاؤں کو وطن ثانی بنا لیا۔ وہاں ان کے احباب کا ایک حلقہ قائم ہوگیا تھا۔وہاں کے احباب کے ساتھ جل گاؤں کی ممتاز تعلیمی و ادبی شخصیات اور ان سب کی ایک ایک جزوی اور فروعی تفصیل بھی انہوں نے اپنی خودنوشت میں سپرد قلم کی ہے۔وہاں کے نظام تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کیا ہے۔تدریسی مسائل و معاملات اور اساتذہ کی ذہنی کیفیت اور انتظامیہ کی بے حسی وغیرہ کو بھی قلم بند کر دیا ہے۔

فاروق اعظمی مرحوم ایک دینی خانوادے کے چشم و چراغ اور شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری کے داماد تھے۔اس تعلق سے انہیں دینی معلومات بھی بہت تھیں۔اور وہ اسی مسلک پر کاربند بھی تھے۔اس سلسلہ میں احباب اور اساتذہ سے جو مباحثے ہوئے ان کی دلچسپ روداد یں بھی انہوں نے قلم بند کی ہیں۔اس کا سب سے اہم پرتو یہ تھا کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔داڑھی سے جہاں ان کا چہرہ نورانی تھا، وہیں صوم وصلوٰۃ کی پابندی نے ان کے دل و دماغ کو بھی منور کر دیا تھا۔تھے تو وہ ایک کالج کے استاذ، مگر پہلی نظر میں کسی دینی مدرسے سے وابستہ لگتے تھے۔ان میں شرافت، وضع داری اور خاکساری بھی بہت تھی۔اہل علم اور پڑھے لکھوں سے تعلق کو وہ استوار رکھتے تھے۔جب وطن آتے تو دارالمصنّفین اور شبلی کالج کا ایک چکر ضرور لگاتے۔دارالمصنّفین میں ایک طرف ان کے استاذ سید صباح الدین صاحب ابدی نیند سو رہے

ہیں تو دوسری طرف مولانا ضیاء الدین اصلاحی، جن سے ان کے بڑے گہرے مراسم وتعلقات تھے پہلوئے حامد حسن نعمانی [۱۸۸۰-۱۹۴۲ء] میں خوابیدہ ہیں۔ اخیر زمانہ میں جب وہ اعظم گڑھ آتے تو مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی رفیق دارالمصنّفین سے ملاقات کے لئے آتے۔ میں نے پہلی بار انہیں مولانا مرحوم ہی کے پاس دیکھا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد وہ آئے تو اپنے بھائی کے ساتھ ناچیز کے گھر بھی تشریف لائے اور بہت دیر تک اپنے عہد کے اعظم گڑھ اور شبلی کالج کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی خودنوشت پچاس کے عشرے کے اعظم گڑھ کی ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ متعدد اہل علم اور اکابر کا ذکر بھی اس میں آیا ہے۔ اعظم گڑھ کے بعض اہل علم وکمال اور بزرگوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور انہیں روشنی کا مینار قرار دیا ہے۔ ان میں مولانا عبیداللہ رحمانی، قاضی اطہر مبارک پوری، پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، مولانا مختار احمد ندوی، اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا نام قابل ذکر ہے۔

آج ان کی موت کی روح فرسا خبر نے یہ سب باتیں اور عہد گذشتہ کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

•••

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

کا ایک خط

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی [۱۹۶۶-۲۰۱۴ء] مرحوم اس حقیر ناچیز کے ہم وطن اور ہم عمر تھے۔ البتہ ان کی شخصیت کئی خوبیوں اور کئی خصوصیات سے عبارت تھی۔ مثلاً وہ ایک صالح باپ کی لائق اولاد تھے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے فاضل اور اس کے ممتاز فرزند تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورٹی کے فیض یافتہ تھے۔ اس طرح وہ قدیم وجدید علوم وفنون سے آراستہ تھے۔ عربی زبان و ادب پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اجمل خاں طبیہ کالج میں عربی زبان وادب کے پروفیسر اور لائق استاد تھے۔ وہ جماعت اسلامی سے وابستہ اور حلقہ علی گڑھ کے امیر تھے۔ اور ان میں امارت کی خوبیاں بھی بدرجہ اتم تھیں۔ تحقیقی و تصنیفی ادارے ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے سکریٹری تھے اور عصر حاضر کے مسائل ومعاملات اور مسلمانوں کو درپیش چیلنج سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اور ان سے نبرد آزما ہونے کا عزم بھی رکھتے تھے۔

کسی شخص کی انفرادیت اور معاشرہ میں اس کو نمایاں مقام دلانے کے لئے مذکورہ بالا خوبیاں ہی کافی ہیں لیکن ان میں تین اور قابل ذکر باتیں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ خطابت کے فن سے بھی آشنا تھے اور عمدہ گفتگو کرتے تھے۔ دوسرے تصنیف وتالیف اور تحقیق وتنقید کا بھی اچھا سلیقہ اور پختہ مذاق رکھتے تھے۔ انہوں نے جو تحریری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ کم ہونے کے باوجود کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ناچیز کا خیال ہے کہ ان کے علمی و تصنیفی سرمائے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔

ایک اورخوبی جس کا ذکراس لئے ضروری ہے کہ اگر وہ خوبی کسی شخص میں نہ ہوتو یہ حقیر اسے انسان ہی نہیں سمجھتا۔اوروہ ہےان کی علم دوستی کے ساتھ انسان دوستی کے جذبات ۔ بلاشبہ وہ ایک بڑے انسان دوست تھے ۔اس کے متعدد واقعات سے میں واقف ہوں اور میرے احباب اورہم عصروں نے بھی بہت سی باتیں گوش گذار کیں ،مگر میں ان کا ذکر انہیں کے لئے چھوڑ تا ہوں جن کے بیان کرنے کے وہ زیادہ حقدار ہیں ۔

دس برس پہلے کی بات ہے میں نے''اشاریہ مصنّفین اعظم گڑھ'' کا کام شروع کیا تھا اور اس کا ایک معتد بہ حصہ مکمل کر چکا تھا۔تقریباً ۲۰۰ رصفحات میرے لیپ ٹاپ میں کتابی صورت میں اب بھی محفوظ اور تکمیل کے لئے میری صحت اور فرصت کے منتظر ہیں ۔میری مصروفیات نے اس کی طرف سے ذہن ایسا ہٹایا کہ یہ کام دوبارہ شروع نہیں ہوسکا۔اسی سلسلہ میں ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی مرحوم سے موبائل پر گفتگو ہوئی ۔ چنانچہ دوسرے ہی دن انہوں نے میرے چندسوالوں کے جوابات اور اپنے بارہ میں ایک خط لکھ بھیجا۔ یہ خط کئی لحاظ سے بہت اہم ہے ۔اولاً اس میں جو کچھ تحریر ہے، ان کے اپنے قلم سے ہے۔دوسرے ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ جس کے وہ سکریٹری تھے اس کے لئے اس خط سے ان کی گہری دلچسپی اور فکرمندی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی خواہش کی تکمیل میں علی گڑھ بوجوہ نہ جا سکا۔ ورنہ اس حوصلہ مند دیوانہ دین وملت کے عزائم سے پوری آ گاہی ہوجاتی ۔ڈاکٹر صاحب کا یہ خط برسوں سے میرے کاغذات میں دبا رہا۔اور کئی بار غائب ہوہوکر پھر ہاتھ آ گیا۔اب اسے احباب کی نذر کر کے میں ہمیشہ کے لئے اسے محفوظ کر دینا چاہتا ہوں ۔

محترمی ومکرمی جناب ڈاکٹر الیاس اعظمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

کل آپ سے ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی ۔اس کے مطابق چند تفصیلات ارسال کرر ہا ہوں ۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ چونکہ میری کوئی کتاب طباعت کے مرحلہ سے نہیں گذری ہے اس لئے مجھے مصنف یا مولف کہنا یا اس کی حیثیت دینا مناسب نہیں ہے ۔ بہر حال حکم کی تعمیل میں چند

باتیں درج کردی ہیں۔انہیں ملاحظہ فرمالیں۔

کل کی گفتگو میں میں نے اپنی یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ آپ کبھی علی گڑھ تشریف لائیں تو اس کی پیشگی اطلاع دیں تاکہ آپ سے ادارہ (تحقیق وتصنیف اسلامی) کے وابستگان کو مستفید کرنے کا پروگرام بنایا جاسکے۔اور اگر کوئی دوسرا مقصد نہ بھی ہو تو خالصۃً ادارہ تحقیق کے رفقاء سے ملاقات کو مقصد قرار دے کر بھی آپ علی گڑھ کا سفر کرسکتے ہیں۔ادارہ آپ کی ضیافت اور خدمت کو اپنے لئے باعث شرف ومسرت امر تصور کرے گا۔انشاءاللہ۔امید ہے کہ غور فرماکر اپنی رضامندی سے مطلع کریں گے۔

والسلام،طالب دعا

صفدر سلطان اصلاحی

۲۰۱۲/۸/۲۲ء

نام	:	صفدر سلطان ابن محترم سلطان احمد صاحب
مولد	:	موضع لاہی ڈیہہ، پوسٹ طویٰ سرائے میر ضلع اعظم گڑھ
تاریخ ولادت	:	۱۶/دسمبر ۱۹۶۶ء
تعلیمی سلسلہ	:	فاضل مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ
		ایم اے/ایم فل/پی ایچ ڈی۔شعبہ عربی اے ایم یو علی گڑھ
ذریعہ معاش	:	تدریس (ایسوسی ایٹ پروفیسر) طبیہ کالج اے ایم یو علی گڑھ
دیگر سرگرمیاں	:	۱۔سکریٹری ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔علی گڑھ
		۲۔رکن/امیر مقامی جماعت اسلامی ہند اے ایم یو علی گڑھ
		۳۔رکن مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند۔یوپی مغرب
		۴۔رکن مجلس نمائندگان جماعت اسلامی ہند
		۵۔ممبر اسٹڈی گروپ مرکز جماعت اسلامی ہند
چند علمی سرگرمیاں	:	۱۔تقریباً دس قومی/بین الاقوامی کانفرنسز اور سیمناروں میں شرکت

۲۔دو درجن سے زائد تحقیقی مقالات کی ملک کے معروف
جرائد میں اشاعت
۳۔ایک درجن سے زائد مضامین (دینی موضوعات پر) کی
مختلف رسالوں/ماہناموں میں اشاعت

غیر مطبوعہ کتابیں : ۱۔جدید مصر کے چار ممتاز نثر نگار
(احمد لطفی السید، احمد امین، زکی مبارک، طٰہٰ حسین)
۲۔عربی زبان میں خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقاء
(۱۹۵۲ء کے بعد سے)
۳۔عربی طبی ریڈر (برائے طلبہ بی یو ایم ایس۔سال اول)
۴۔مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی تحریکی خدمات
۵۔مولانا صدر الدین اصلاحی مرحوم کی تحریکی خدمات

مذکورہ کتابوں میں بعض اب طبع ہوگئی ہیں۔

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی مرحوم ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے سلسلہ میں پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب کی معیت میں کو مرکز جماعت اسلامی دہلی جارہے تھے کہ راہ میں کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔حادثہ سخت تھا اور جان عزیز۔دونوں مسافر سخت زخمی ہوئے۔اس حادثہ میں ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جس وقت اس سانحہ کی اطلاع ملی دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں سمینار ہو رہا تھا۔ اور ہم لوگ اس میں شریک تھے۔بے سان وگمان اس حادثہ نے ہر شخص کو رنجیدہ اور ملول کر دیا۔ سمینار ہال ماتم کدہ میں تبدیل ہوگیا۔اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔

ان کے ہم سفر، ہمارے کرم فرما، نامور اہل قلم اور ممتاز مصنف پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب بھی اس حادثہ میں شدید زخمی ہوئے، مگر اللہ نے زندگی باقی رکھی تھی۔چنانچہ کئی ماہ کے علاج ومعالجہ کے بعد بحمد اللہ صحت یاب ہوئے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے اور مرحوم صفدر سلطان صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ان کی بے وقت لیکن

شہادت کی موت یادرہے گی۔ان کے برادر خرد مولانا اختر سلطان اصلاحی نے بڑی دلدوز نظم کہی ہے۔راقم اس سے بہت متاثر ہوا۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ہے شاق بہت قلب پہ بھائی کی جدائی
یہ زخم ہے ناسور نہیں جس کی دوائی

گھر کی مری جو سب سے درخشندہ شمع تھی
افسوس ہواؤں نے وہی شمع بجھائی

ہر فیصلے پہ رب کے ہم راضی بہ رضا ہیں
جانے کے کہاں دن تھے ترے اے مرے بھائی

طاری ہے تیری موت سے ہر ایک پہ سکتہ
گردوں نے مرے گھر پہ عجب برق گرائی

بے شک وہ قیامت تھی ،قیامت تھی، قیامت
پیاروں نے جو کاندھوں پہ تری لاش اٹھائی

دیکھی نہیں جاتی ترے معصوموں کی حالت
حالات نے چہروں سے ہنسی ان کے اڑائی

ہے عید کا دن اور تری یادوں کی یورش
تکلیف کی حسرت فضا دل پہ ہے چھائی

یادوں نے تری اس قدر بے چین کیا ہے
اک لمحہ طبیعت نے مری چین نہ پائی

بھیا بنے تربت تری اک گوشہ جنت
ہر وقت دعا لب پہ یہی ایک ہی آئی

تقوی وطہارت سے عبارت تھی تری زیست
عقبی میں ہو مقبول تری پاک کمائی

بچوں کے ترے سر پہ رہے ہاتھ خدا کا
حاصل ہو انہیں دونوں جہانوں کی بھلائی

تونے تو نچھاور کیا سب راہ خدا میں
بچے بھی بنیں کاش ترے دیں کے فدائی

اعزاز شہادت کا دیا تجھ کو خدا نے
تا عمر رہا حق کا تو بیباک سپاہی

تو اس طرح آباد ہے سینوں میں ہمارے
ہے کون سی ساعت جو تری یاد نہ آئی

بھیا تری رحلت کا اثر دل پہ ہے ایسا
تاریک ہے نظروں میں مری ساری خدائی

اے! زندۂ جاوید تجھے موت نہیں ہے
یہ ایسی حقیقت ہے جو قرآں نے بتائی

تو اس طرح آباد ہے سینوں میں ہمارے
ہے کون سی ساعت جو تری یاد نہ آئی

دل تھا ابھی تنویر کی رحلت ہی سے زخمی
اس غم نے عمارت سبھی امیدوں کی ڈھائی

ہر زخم مرے زخموں کو کردیتا ہے تازہ
للہ وہ طاقت دے ملے غم سے رہائی

تھوڑا سا سکوں پاتی ہے بے کیف طبیعت
یادوں کی شمع دل نے جو رہ رہ کے جلائی

چھوٹے بڑے ہر ایک کی آنکھوں میں نمی تھی
اختؔر نے جو کل رات میں یہ نظم سنائی

ooo

شمس الرحمٰن فاروقی کی یادیں

گذشتہ سال ۲۰۲۰ء میں اسی ماہ دسمبر کی ۲۵؍تاریخ کو آبروئے اردو شمس الرحمٰن فاروقی نے وفات پائی تھی۔ اس حادثۂ فاجعہ پر ایک سال گذر گیا مگر کوئی دن شاید ہی ایسا گذرا ہو کہ کسی نہ کسی نوع سے ان کی یاد نہ آئی ہو اور رنجیدہ نہ کر گئی ہو۔ بلاشبہ یہ دنیائے علم وادب کا ایک بڑا سانحہ تھا۔ یہ صرف ایک ادیب اور نقاد کی موت نہ تھی بلکہ علم وفضل کی موت تھی۔ اردو کے ایک جانباز سپاہی کی موت تھی۔ اردو کے ایک سرپرست اور مربی ومحسن کی موت تھی۔ ایک بڑے مصنف، محقق اور نقاد کی موت تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ماتم کا سلسلہ آج بھی رکا نہیں اور شاید برسوں نہ رکے گا۔ ان کی کمی ہر جگہ محسوس ہوگی۔ یہ ایک ایسا خلا ہے جو شاید کبھی نہ پر ہو سکے۔ اردو کی زمین اگرچہ ابھی بنجر نہیں ہوئی ہے۔ ہمیشہ لعل وگہر پیدا ہوتے رہیں گے مگر اب دوسرا فاروقی پیدا نہیں ہوگا۔

فاروقی صاحب کے علم وفضل سے ہند وپاک کا ہر صاحب علم واقف ہے۔ ان کی یادیں تازہ کرنے کے لئے ان کی لافانی تصنیفات کافی ہیں، جن کا دائرہ متنوع اور گوناگوں ہے۔ مدۃ العمر قلم ان کے ہاتھ میں رہا اور ایسے لازوال نقوش ثبت کرتا رہا جن کی چمک شاید ہی مرورِ زمانہ مٹا سکے۔ ان کے فضل وکمال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ دسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بیسیوں لکھی جائیں گی۔ رسائل وجرائد کے فاروقی نمبر کے علاوہ جناب اطہر فاروقی کی کتاب ''ارمغان فاروقی'' اور ڈاکٹر رضا حیدر کی مرتبہ کتاب ''شمس الرحمٰن فاروقی: ادیب و دانش ور'' فاروقی صاحب کی شخصیت پر عمدہ تحریروں کے مجموعے ہیں اور فاروقی صاحب کو سمجھنے میں ان سے کافی مدد ملے گی۔ فاروقی صاحب اور ان کی کتابوں پر مضامین اور تبصرے تو کثرت سے لکھے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی اردو کے کسی ادیب و دانش ور کے بارہ میں اس کی زندگی

میں اتنا لکھا گیا ہوگا جتنا کہ فاروقی صاحب کے بارہ میں لکھا گیا ہے۔ میں اپنی اس تحریر کو ذاتی حدود تک محدود رکھنا چاہتا ہوں تا کہ اسے سمیٹ کر اپنی رنجیدگی کم کر سکوں اور ان کی شفقتوں کو دکھا سکوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کارناموں کے بیان کے لئے دفتر بھی کم ہوگا۔

فاروقی صاحب اسی خطہ اعظم گڑھ جس پر فیضان تجلی ہے یکسر سے اٹھے تھے اور واقعی آسمان علم وادب پر نیر اعظم بن کر چمکے۔ وہ جہاں گئے اور جس محفل میں بیٹھے بزم کی آبرو اور شان رہے۔ ادبیات کی کسی محفل میں رہے جان محفل رہے۔ گویا ہوئے تو ارباب کمال ان کی گویائی پر مر مٹے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا ایک نقش قائم کیا۔

کوئریا پار سے وہ اعظم گڑھ آئے۔ شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے طالب علم رہے۔ پھر میاں جی اسلامیہ کالج گورکھپور سے تعلیم حاصل کی۔ میری پیدائش سے پہلے وہ شبلی نیشنل کالج میں انگریزی ادبیات کے استاذ منتخب ہوئے۔ خوب پڑھا اور پڑھایا۔ اسی زمانہ میں معیار میرٹھ میں بعض انگریزی نظموں کے ترجمے شائع ہوئے۔ لکھنے کا آغاز تو انہوں نے کم عمری میں اور میاں جی اسلامیہ کالج گورکھپور کی طالب علمی ہی میں کر دیا تھا۔ مگر معیار میں جو تراجم اور تخلیقات شائع ہوئیں ان سے ان کے معاصرین متاثر ہوئے۔ کئی برس ہوئے ناچیز نے معیار میرٹھ کی بعض تخلیقات کا عکس فاروقی صاحب کو بھیجا تو انہوں لکھا کہ

> ''مجھے یاد نہیں لیکن زبان میری ہی لگتی ہے۔ آڈن کی نظم کا ترجمہ کرنا ضرور یاد ہے۔ میں نے کچھ محفوظ نہیں کیا۔ نام بھی ابھی متعین نہیں کیا تھا۔ چلئے آپ دوستوں نے دیکھ لیا، یہی بہت ہے۔'' (۲۵/اپریل ۲۰۲۰ء)

فاروقی صاحب جس زمانہ میں شبلی کالج میں استاد تھے کالج کے ارباب حل وعقد نے علامہ شبلی کی یاد میں ایک ہفتہ منانے کا منصوبہ بنایا اور بہت بڑے پروگرام کا منصوبہ بنا جس میں اردو، ہندی اور انگریزی کے ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی گئی اور ایک ہفتہ تک علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر وفن پر متعدد مجالس کا انعقاد ہوا، جس میں تقریریں ہوئیں اور مقالات پیش کئے گئے۔ اس میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی علی گڑھ سے اور پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنا مقالہ شبلی کا تنقیدی مسلک اسی تقریب میں پڑھا تھا۔ فاروقی صاحب بھی

ان مجالس میں شریک رہے اور علامہ شبلی کی تنقید نگاری پر مقالہ پیش کیا۔ وہ مقالہ میں نے بہت تلاش کیا، مگر دستیاب نہیں ہوا۔ اس کی بابت فاروقی صاحب سے بھی دریافت کیا مگر وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ پتا نہیں اب کچھ یاد نہیں۔

شبلی کالج ہی کے زمانہ قیام میں وہ IAS کے امتحان میں بیٹھے اور منتخب ہوئے۔ کالج کی تاریخ میں یہ ایک نمایاں اور پہلا واقعہ تھا۔ یہاں سے جب وہ مستعفی ہوئے اور اپنی ملازمت پر جانے لگے تو طلبہ و اساتذہ نے ایک الوداعی تقریب منعقد کی۔ جس میں IAS منتخب ہونے پر جہاں تہنیت پیش کی گئی وہیں کالج سے سبکدوش ہونے پر احباب اور طلبہ رنجیدہ بھی ہوئے۔ اس تقریب میں ماسٹر محمد مسلم صاحب مرحوم نے اپنے والد امین اللہ امین اعظمی کی لکھی ہوئی الوداعیہ نظم پیش کی تھی جو ان کے مجموعہ ''سرمایہ امین'' میں شامل ہے۔ وہ نظم یہ ہے:

وداعِ فاروقی

مبارک شمس رحماں! آپ کو یہ فضل ربانی
مبارک ہو مبارک طالعِ قسمت کی تابانی
مبارک ہو ترقی ، خوش نصیبی ، اوجِ سامانی
مبارک ہو نشاط انگیز جلووں کی فراوانی
نظر روشن ہے دل روشن ، جہانِ آرزو روشن
چمک اٹھا ہے یوں نجمِ سعادت ، نورِ پیشانی
یہ عہدہ اور یہ منصب اگرچہ کم نہیں لیکن
حقیقت یہ ہے کب اہلِ نظر نے قدر پہچانی
زہے تقدیر وہ جوہر ملا ہے علم و دانش کا
بنے گی مشعلِ راہِ ترقی اس کی رخشانی
بجز فرقِ مراتب ، سب سے یکساں طور پر ملنا
نہ کیوں ہو ذات فاروقی پہ نازاں خلق انسانی
گھرانا آپ کا مشہور ہے خلق و مروت میں

اسی نورِ شرافت کی ہے ساری پرتو افشانی
دبستاں چھوڑ کر ایسا شفیق استاد جاتا ہے
پریشاں جس کی فرقت سے ہے ہر طفلِ دبستانی
بچشم اشکبار آئے ہیں ہم یہ معذرت لے کر
خدارا بخش دیں جو کچھ ہوئی ہو ہم سے نادانی
خدا کا خوف اور حسنِ عمل پر ہے نظر لازم
اسی سے طے کریں گے آپ ہر منزل بہ آسانی
ستارہ اوج پر ہو آپ کے بامِ ترقی کا
ہمیشہ آپ پر ہو سایہ افگن ظلِ سبحانی
عجب عالم ہے اپنا کچھ کہا جاتا نہیں مسلم
ترقی کی مسرت ہے ، جدائی کی پریشانی
۵ستمبر ۱۹۵۸ء

''سرمایہ امین'' کی اشاعت کے بعد یہ نظم میں نے فاروقی صاحب کو بھیجی تو انہوں نے لکھا کہ ''نظم کے لئے شکریہ۔ بھولا بسرا وقت یاد آ گیا۔ آپ کو کہاں سے ملی؟''

ان کے شبلی کالج کے زمانہ ملازمت میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد [۱۹۲۹ – ۲۰۱۶ء] بھی شبلی کالج میں انگریزی ادب کے استاد تھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''رقص شرر'' میں اس دور کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔

ناچیز ان کی شفقتوں کے سایہ میں کب آیا؟ کچھ صحیح یاد نہیں۔ یہ شاید ۱۹۹۰ء کے بعد کا واقعہ ہے کسی رسالہ میں میرا مضمون شائع ہوا تو فاروقی صاحب نے فون سے داد دی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ اس کے بعد فاروقی صاحب کبھی کبھی فون کر کے مضامین اور کتابوں پر حوصلہ افزائی کرتے یا اعظم گڑھ کا احوال دریافت کرتے۔ جس دن ان کا فون آتا میں پھولے نہ سماتا۔ اور احباب سے ان کا ذکر نہایت ادب واحترام بلکہ فخریہ کرتا۔ اس سے نفس کو جو تقویت ملتی تھی وہ اپنی جگہ البتہ احباب میں اہمیت اور بڑھ جاتی۔ ایک دفعہ فاروقی صاحب کا فون آیا تو میں نے بے خیالی میں جی

ڈاکٹر صاحب کہہ دیا۔ کہنے لگے ''ابے میں کب سے ڈاکٹر ہوگیا۔'' میں نے کہا آپ ڈاکٹر ہیں بس کسی دن ڈاکٹریٹ کی سند کوئی یونیورسٹی دے دے گی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے دوسرے ہی دن کسی یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی سند دینے کا اعلان کیا تو میں نے انہیں مبارک باد دی۔ ایک دن پہلے کی گفتگو انہیں یاد آئی تو کہنے لگے ''ابے تو نجومی کب سے ہوگیا؟۔''

۲۰۰۲ء میں میرا مقالہ ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات'' خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہوئی اور اسے فاروقی صاحب کی خدمت میں بھیجا تو انہوں نے پوسٹ کارڈ لکھا:

برادرم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی السلام علیکم

آپ کی کتاب ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات'' نہایت دلچسپ ہے
اور سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ آپ نے محدود موضوع کو اس طرح برتا ہے کہ
اس میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کا انداز گفتگو بھی سادہ اور دل نشیں ہے۔
اس کتاب کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ آپ کا

شمس الرحمٰن فاروقی

۲؍ستمبر ۲۰۰۴ء

فاروقی صاحب کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور میرا یہ مقالہ حوالہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں ہمارے بزرگ کرم فرما پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی صاحب کی کتاب ''دارالمصنّفین کی تاریخی اور علمی خدمات'' بے حد وقیع کتاب ہے اور دارالمصنّفین سے شائع ہوئی ہے، تاہم یہ سچ ہے کہ اس موضوع پر لکھتے ہوئے میرے مقالے کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ۲۰۰۵ء میں میرے مضامین کا مجموعہ ''عظمت کے نشاں'' شائع ہوا اور فاروقی صاحب کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے قدرے مفصل خط لکھا، جس سے مجھے بڑی رہنمائی ملی۔ وہ خط درج ذیل ہے:

برادرم ڈاکٹر الیاس الاعظمی سلام علیکم

آپ کی کتاب ''عظمت کے نشاں'' میں نے بہت دلچسپی سے پڑھی۔

آپ کے اسلوب نگارش کی خوبی اس بات سے ثابت ہے کہ میں پوری کتاب ایک نشست میں پڑھ گیا اور مجھے کسی قسم کی گرانی کا احساس نہ ہوا۔ آپ کے وفیاتی مضامین تو عموماً ٹھیک ہیں لیکن ان کا کوئی جوڑ بقیہ کتاب سے نہیں ہے، اس لئے انہیں کسی اور مجموعے کے لئے اٹھا رکھنا تھا۔ کئی مضامین تو معلومات کا خزانہ ہیں اور میں ان کے لئے آپ کا ممنون رہوں گا۔ آپ نے معلومات کو پیش کر دیا ہے لیکن تجزیہ اور تعبیر سے گریز کیا ہے۔ لہٰذا ان تحریروں کی معلوماتی قدر تو مستحکم ہے، لیکن علمی اعتبار سے یہ ہمیں بہت دور نہیں لے جاتے۔ علامہ شبلی، سرسید، مولانا ابوالکلام، ان صاحبان کے ذکر میں تجزیہ اور تعبیر کی بہت گنجائش تھی۔ بہر حال ہر کتاب کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔

مجھے یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے عربی زبان اپنی محنت سے کسی مکتب یا کالج میں تلمیذ ہوئے بغیر حاصل کی۔ مبارک ہو۔ ایں کار از تو آید

آپ کی کتاب میں کتابت کی غلطیاں بہت کھٹکتی ہیں۔ کچھ تو کاتب کی لاپروائی کے سبب ہیں لیکن ایک ایسی ہے جس میں آپ کی بھی لاپروائی شاید شامل ہے۔ یعنی آپ نے (اور مقتدر معاصر ''معارف'' نے بھی) ہمزہ کو تقریباً دیس نکالا دے دیا ہے۔ لطف یہ کہ جہاں ہمزہ اردو کے قاعدے سے غلط ہے وہاں ہمزہ ضرور دیا گیا ہے۔ خیر اس سے معنی میں کچھ خلل نہیں پڑتا، لیکن ذرا مندرجہ ذیل کو ملاحظہ کریں:

مجموعہ نظم شبلی: سفرنامہ روم ومصر وشام (ص۴۲) ہدیہ سلیمانی: سرمہ سلیمانی (ص۶۴) فلسفہ جدیدہ (ص۶۷) تلامذۂ شبلی (ص۸۳)۔ میں نے مولانا ضیاء الدین صاحب کو ''معارف'' میں اس طرح کے فک ہمزہ کی طرف متوجہ کیا لیکن ان پر خدا معلوم کیوں کچھ اثر نہ ہوا۔

مندرجہ بالا تمام تراکیب میں ہمزہ اضافت غائب ہے۔ لطف یہ کہ ص۸۳ پر ''انشاء پرداز'' لکھا ہے، حالانکہ یہ کوئی لفظ ہی نہیں۔ الف کے آگے

ہمزہ لگانے کے شوق نے لفظ کی شکل بگاڑ دی۔اسی طرح جگہ جگہ ''معرکہ آراء''
لکھا ہے۔(مثلاً ص ۴۸)۔یہ محض دوستانہ استدراکات ہیں، تنقیص نہیں۔

آپ کا نیازمند
شمس الرحمٰن فاروقی

۲؍ستمبر ۲۰۰۶ء

اس عالمانہ اور تصحیحاتی خط سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور خاص طور پر زبان و بیان درست کرنے میں بڑی مدد ملی اور حتی الامکان اس طرح کے اغلاط سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لکھتے وقت اکثر خیال آجاتا کہ اگر یہ تحریر فاروقی صاحب کی نظر سے گذری تو وہ ضرور گرفت کریں گے۔افسوس ایسا شفیق مربی اب نہیں رہا۔

''عظمت کے نشاں'' کے بعد کئی برس خاموشی رہی۔اس دوران ناچیز کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کی خدمت میں بھیجی گئیں، مگر وہ خاموش رہے۔غالباً وہ ان کی نظر سے نہیں گذریں یا قابل اعتنا نہ ٹھہریں۔

۲۰۱۱ء میں کتابیات شبلی دارالمصنّفین نے شائع کی تو انہوں نے میری محنت کو سراہا۔اس کا ذکر خبرنامہ شب خون میں کیا۔فون سے بھی حوصلہ افزائی کی۔بلاشبہ کتابیات شبلی کی ترتیب و تدوین میں ناچیز نے رات دن ایک کر دیا تھا اور اس میں علامہ شبلی سے متعلق بے شمار معلومات یکجا کی ہیں۔

۲۰۱۲ء میں ناچیز نے علامہ شبلی کے متفرق مکاتیب کا مجموعہ ''مکتوبات شبلی'' مرتب کیا۔ اس کے طبع اول میں ۲۱۰؍خطوط شامل تھے۔یہ میرا پہلا تدوینی کام تھا۔اس میں تلاش و جستجو سے جو کام لیا گیا ہے وہ اپنی جگہ، اصل کام تحقیق متن کا تھا۔ناچیز نے اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، تاہم سہما ہوا تھا کہ خدا جانے محققین کا کیا رویہ ہو۔متعدد اہل علم کی خدمت میں مکتوبات شبلی پیش کی۔ڈرتے ڈرتے فاروقی صاحب کی خدمت میں بھی بھیجی۔انہوں نے کئی ماہ بعد ایک مفصل خط لکھا اور تعریف و تحسین کے ساتھ اس کی ایک ایک کمیاں دکھائیں۔اس سے میرا حوصلہ نہیں ٹوٹا بلکہ جس شفقت و مروت سے انہوں نے اغلاط کی نشاندہی کی تھی اس سے حوصلہ ملا۔اور عزم و ہمت میں مزید اضافہ ہوا۔وہ مفصل خط اس لائق ہے کہ ترتیب و تدوین کا کام کرنے والے ہر شخص کو ایک

بارضرور پڑھنا چاہئے۔اس لئے طوالت کے باوجود یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

برادرم الیاس الاعظمی،سلام علیکم۔

کچھ دن پہلے آپ کی کتاب ''مکتوبات شبلی'' ملی تھی، بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ۔آپ اس زمانے کے چند لوگوں میں سے ہیں جو دل لگا کر کام کرتے ہیں۔علامہ مرحوم کے ان خطوط کی تدوین بھی آپ کے اچھے کاموں میں گنی جائے گی۔یہ ضرور ہے کہ اس کام میں بہتری کی مزید گنجائش ہے۔ایک تو یہ کہ عربی عبارتیں جو جگہ جگہ خطوط میں آئی ہیں ان کا ترجمہ دینا چاہئے تھا۔دوسری بات یہ کہ آپ نے جگہ جگہ مفصل حاشیے لکھے ہیں خاص کر رجال پر آپ نے بہت محنت کی ہے۔لیکن کئی مقام ایسے آئے ہیں جہاں علامہ کے خط کے بین السطور پر بھی آپ کو کلام کرنا چاہئے تھا۔مثلاً یہ کہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے نام پہلے ہی خط میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ علامہ اور مولانا مونگیری کے درمیان کچھ چھوٹی موٹی غلط فہمیاں یا آپسی شکایتیں بھی تھیں۔چنانچہ مولانا مونگیری کے پہلے خط کا کچھ پس منظر آپ کو پہلے بیان کرنا چاہئے تھا۔پھر یہ کہ ایک طرف تو آپ نے امام بخاری پر تقریباً پورا صفحہ لکھا اور دوسری طرف امام مسلم کے بارے میں جن کی صحیح کا حوالہ علامہ کے خط میں ہے ان پر آپ نے کوئی تفصیل نہیں لکھی۔مولوی بشیر الدین کے نام خط میں صفحہ ۴۶ پر جو جملہ ہے ''ندوہ کی ہمدردی پر بعض حامیان کالج مجھ کو رقیبانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔'' اسی صفحے پر علامہ نے صاف صاف شکایتیں مولوی بشیر الدین کے طرز عمل کے خلاف کی ہیں لیکن آپ نے ان عبارتوں پر کوئی بھی توجہ نہیں کی۔صفحہ ۸۷ پر علامہ نے لکھا ہے کہ ''آج کل پروفیسری کے لئے معقول تنخواہ پر بلایا ہے۔'' یہ اشارہ غالباً علی گڑھ کی طرف ہے۔آپ نے اس پر کوئی تفصیل نہیں لکھی۔اسی صفحے پر آپ نے ''اہل خانہ'' پر حاشیہ نمبر ۱۳ لگایا ہے اسے ۱۴ ہونا چاہئے تھا۔اسی صفحے پر علامہ کے پاؤں کے حادثے کا ذکر ہے۔مگر آپ نے اس پر کوئی نوٹ

نہیں لگایا۔صفحہ۱۰۱پر علامہ نے ''انجمن'' کو مذکر لکھا ہے، یہ صراحت ضروری تھی کہ اصل میں یوں ہی ہے۔یعنی علامہ ''انجمن'' کو مذکر لکھتے تھے۔اسماء رجال پر اتنی محنت کرنے کے باوجود آپ نے مولوی حمیدالدین (صفحہ۱۰۹) پر کوئی نوٹ نہیں دیا۔اسی طرح عبدالحی کو ۱۰۸صفحہ پر مع ہمزہ لکھا ہے۔امید ہے یہ کتابت کی غلطی ہوگی۔ کیونکہ آپ کے حاشیے میں بھی (صفحہ۱۱۰اور صفحہ۱۵۲) یوں ہی ہے۔گمان گذر سکتا ہے کہ علامہ سے سہوِقلم ہو گیا ہوگا۔کتابت کی ایسی غلطی افسوس ناک ہے۔اس صفحے پر مولانا عبدالحی کے نام جو خط ہے اس کو بھی حاشیے کی ضرورت تھی۔

صفحہ۱۴۱ پر نواب سید علی حسن خاں کے خط میں علامہ لکھتے ہیں 'آپ حضرت عمرؓ کی طرح دریا سے ڈرتے ہیں۔'اس پر آپ نے کوئی حاشیہ نہیں دیا۔مجھے بالکل نہیں معلوم کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں اس اطلاع کا ماخذ کیا ہے۔

مولانا عبدالباری کے نام جو خط صفحہ۱۶۲ پر ہے اس پر آپ کی طرف سے حاشیہ بہت ضروری تھا۔اس خط کی تاریخی اور سوانحی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔(برسبیل تذکرہ، اس صفحے پر بھی عبدالحی جہاں جہاں لکھا ہے مع ہمزہ لکھا ہے۔)

صفحہ۱۷۱ پر نظام المشایخ مع تحتانی لکھا ہے یہ آپ کا املا ہے یا علامہ کا؟ اسی خط میں یہ جملہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا 'کیا آپ کچھ فیض انگیز یاد دلائیں گے۔'

صفحہ۱۹۱ پر عربی عبارت حسب معمول بے ترجمہ ہے اور نسخ کے بجائے نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔صفحہ۱۴۹ پر عربی کا شعر ہے، بے ترجمہ۔صفحہ۱۹۸ پر ''گئے'' کو ''گیے'' لکھا ہے۔یہ کس کا املا ہے؟ علامہ کا؟ صفحہ۲۰۵ پر عبدالوہاب بہاری پر جو حاشیہ ہے اس میں صرف وہی بات کہہ دی گئی ہے جو علامہ نے اپنے خط میں کہی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود کتاب بہت کارآمد ہے۔ میں آپ کو

مبارک باد دیتا ہوں۔ دو چار دن ہوئے آپ کی ایک کتاب اور ملی ہے شکریہ۔
اس کی رسید الگ سے لکھوں گا، انشااللہ۔ آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی

۱۶ اپریل ۲۰۱۳ء

''مکتوبات شبلی'' کی اشاعت کے بعد دوسری کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں فارقی صاحب کا یہ خط نقل کر کے میں نے فاروقی صاحب کو یقین دلایا کہ آئندہ تحقیقات اور مکتوبات شبلی کے دوسرے ایڈیشن میں ان کے خیالات کا لحاظ بہر صورت رکھا جائے گا اور اس کتاب میں بڑی حد تک اس کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' کا انتساب فاروقی صاحب کے نام ہے۔ اس پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے کہا کہ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

۲۰۱۳ء میں ناچیز کی ضخیم کتاب آثار شبلی دارالمصنّفین نے شائع کی تو مکتوبات شبلی پر تبصراتی تحریر کے شکریہ کے ساتھ آثار شبلی ان کی خدمت میں بھیجی۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ

برادرم محمد الیاس الاعظمی سلام علیکم

آپ کے خط کا مجھے انتظار تھا کیونکہ میں نے بڑی محنت سے آپ کی کتاب پر اظہار خیال کیا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں ای میل پہنچی ہی نہ ہو۔ آج کل یہ سب بھی ہونے لگا ہے۔ اب آپ کی ای میل سے طبیعت کو اطمینان ہوا۔ اور اس بات پر خوشی ہوئی کہ آپ نے میری معروضات کو قابل لحاظ جانا۔

''آثار شبلی'' مجھے کچھ دن ہوئے مل گئی تھی، مگر میں نے جواب اس لئے نہیں لکھا کہ یقین نہیں تھا کہ میری پچھلی ای میل آپ کو ملی کہ نہیں۔ ''آثار شبلی'' میں نے کم وبیش پوری پڑھ ڈالی۔ ایک آدھ لوگوں سے ذکر بھی آیا تو میں نے کہا کہ کتاب کیا ہے، شبلی پر معتبر اور محققانہ معلومات کا خزانہ ہے۔ آپ کا طرز تحریر مجھے ہمیشہ شگفتہ اور واضح معلوم ہوا جو بڑی بات ہے۔ شبلی کے مخالفین پر بھی آپ نے جگہ جگہ بہت متانت اور دیانت سے اظہار خیال کیا ہے۔

آپ کی کتاب چونکہ شبلی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے، اس لئے اس میں علمی مباحث کی گنجائش زیادہ نہ تھی۔ لیکن بہتر تھا کہ بعض معاملات پر کچھ زیادہ بحث کی جاتی۔ مثلاً حافظ محمود شیرانی صاحب کے اعتراضات، مولانا اسلم جیراج پوری کے اعتراضات اور ہمارے زمانے میں ظفر احمد صدیقی صاحب کی بعض رائیں (خاص کر شبلی کی سیرت نگاری اور علم حدیث کے بارے میں) ان کا کچھ اور ذکر ہونا چاہئے تھا۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ اسلم جیراج پوری کی کیا ہستی ہے۔ حافظ صاحب نے بھی لکھا ہے، اس سے ''شعر العجم'' کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ لیکن پھر بھی آپ کو تھوڑی سی مزید بحث کرنا ضروری تھی۔ خاص کر شبلی کے نظریۂ شعر اور نظریۂ تاریخ کے بارے میں آپ کو کچھ کلام کرنا تھا۔ سر سید نے ''الفاروق' کے منصوبے پر کوئی خاص جوش ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس پر اور بعض دوسرے سید صاحبان کی شکایات پر بھی تھوڑی سی بحث کرتے تو خوب تھا۔

بعض باتیں بالکل نظر انداز ہو گئی ہیں۔ شاید مصلحت کا تقاضا تھا، لیکن حقیقی اور ایماندار سوانح نگار مصلحت کے اوپر بھی کچھ چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔ شبلی کی بیماریاں جو تقریباً اوائل عمر سے آخر تک رہیں، شبلی کی ازدواجی زندگی، شبلی کے حلقۂ احباب اور ان کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر، خود شبلی کی پسند اور ناپسند، خاص کر لباس اور کھانے کے معاملے میں۔ موسیقی اور نغمے اور عوامی کھیل کود، میلوں تقریبوں وغیرہ میں شبلی کی دلچسپی پر آپ نے کچھ نہیں کہا۔ ندوے میں پہلی اسٹرائک کا کوئی ذکر نہیں، جس میں شاید مولانا عبدالسلام ندوی بھی شریک تھے۔ شبلی کے سیاسی خیالات اور کانگریس سے ان کی ہم خیالی اور وابستگی اس پر بھی آپ نے بہت سرسری گفتگو کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی ''حیات شبلی'' میں جو کمیاں ہیں وہ کم و بیش یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ بس یہ ہے کہ آپ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے بہت

بعد میں ہیں لہٰذا آپ کی دست رس ان کاغذات اور واقعات تک ہے جو مولانا مرحوم کی دسترس سے باہر تھے۔

بھائی صاحب آپ نے مجھ پر بڑا کرم کیا جو شبلی کے نام مشاہیر کے خطوط کا مسودہ اشاعت کے پہلے مجھے دکھانا چاہتے ہیں۔ حاشا وکلا میری یہ حیثیت اور لیاقت نہیں۔ علاوہ بریں نہ عمر، نہ صحت، نہ فرصت۔ یہ سب چیزیں اب اوراق پارینہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ خود اپنے اوپر کچھ کام میں نے لگا رکھے ہیں یا لے لئے ہیں جو بہت دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ آہستہ خرام سے مخرام کی منزل میں آ گئے ہیں۔

میں آپ کی لیاقت اور بالخصوص علامہ شبلی سے آپ کی لگن اور علمی دلچسپی کا قائل ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ اب میں کوئی ایسا کام قبول نہیں کر سکتا جس کے لئے میں خود کو صلاحیت اور فرصت دونوں سے عاری پاتا ہوں۔

حضرت عمرؓ اور پانی والے معاملے کے لئے الفاروق ایک بار پھر دیکھوں گا۔ یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں نظر پڑ جائے گی اور تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔

''معارف'' کا معاملہ یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہاں شبلی کے بارے میں ایک طبقہ کسی بھی تازہ خیالی یا مقررہ راستے سے ہٹ کر دیکھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مجھے ''معارف'' کی مجلس ادارت کی رکنیت باعث اعزاز تو تھی لیکن ایسے اعزاز سے کیا فائدہ جس سے کوفت پیدا ہو اور لوگوں کو گمان گذرے کہ فاروقی صاحب کو یہ رکنیت کتنی عزیز ہے کہ بے حیائی کر کے بھی اسے گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ مانا کہ اس زمانے میں بعض ایسے بڑے ادیب موجود ہیں جو ذلت کھاتے ہیں اور پھر بھی محفل میں جلوہ افروز رہتے ہیں۔ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوا تو اب کیا ہوگا، جب سفینہ کنارے پر آ لگا ہے۔ آپ کی محبت کے لئے شکر گذار ہوں۔ آپ کا

شمس الرحمٰن فاروقی

۲۵راپریل۲۰۱۳ء

یہ خط بہت اہم ہے۔اس سے ان کی علامہ شبلی پر گہری اور عالمانہ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔خط کے آخر میں معارف کے ایک معاملہ کا ذکر ہے۔وہ معاملہ یہ ہے کہ دارالمصنّفین کے اس وقت کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے فاروقی صاحب کو ماہنامہ معارف کی مجلس ادارت کا رکن نامزد کیا جسے انہوں نے قبول کر لیا۔چند ماہ بعد مرحوم پروفیسر سید عبدالباری شبنم سبحانی [۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] نے ان کے خلاف ایک مراسلہ لکھا جو ماہنامہ معارف میں شائع کر دیا گیا۔فاروقی صاحب نے اس سے دل برداشتہ ہوکر مجلس ادارت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور تمام تر کوششوں کے باوجود مجلس ادارت کی رکنیت کے لئے راضی نہیں ہوئے۔

دارالمصنّفین کے تعلق سے ایک اور بات یاد آ گئی۔ایک سال انہیں توسیعی خطبے کے لئے مدعو کیا گیا۔چنانچہ وہ تشریف لائے اور ''شبلی کی فارسی غزل'' کے موضوع پر خطبہ دیا۔اس موقع پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے موجود مہمانوں کا ان سے تعارف کرایا اور جب میرا تعارف کرانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو میرا پرانا دوست ہے۔میرے لئے یہ بڑی بات تھی آج بھی وہ منظر میری آنکھوں میں ہے۔اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ظلی صاحب کو ان سے میرے دیرینہ تعلق کا شاید علم نہیں تھا۔

ان کا توسیعی خطبہ علی العموم پسند نہیں کیا گیا۔ہوا یہ کہ جب انہوں نے خطبہ شروع کیا تو دارالمصنّفین کی انتظامیہ کے ایک رکن نے ان سے فرمائش کی کہ فارسی اشعار کی تشریح بھی کرتے جائیں۔علامہ شبلی کی فارسی غزلیں غزلیں کاہے کو ہیں وہ تو بقول مولانا حالی شراب دوآتشہ ہیں۔چنانچہ ان کی تشریح بھی اسی لحاظ سے فاروقی صاحب نے کی،لیکن اعظم گڑھ میں علامہ شبلی کو ایک عالم اور سیرت نگار کی حیثیت سے جو تقدس حاصل ہے،غزل کی تشریحات اس سے میل نہیں کھا رہی تھیں اس لئے وہ مقالہ لوگوں کو ناگوار گذرا،لیکن وہی مقالہ جب بغیر اشعار کی تشریح کے سہ ماہی اردو ادب دہلی میں شائع ہوا تو کچھ بھی معیوب نہ تھا۔

فاروقی صاحب میں بڑا استقلال تھا۔وہ انگریزی ادب کے طالب علم تھے مگر اردو سے

وابستہ ہوئے تو پھر مدۃ العمر کسی اور طرف نہیں دیکھا اور مدۃ العمر اردو ادب ہی کے رہے۔ اسی طرح ماہنامہ شب خون جاری کیا تو اسے چالیس برس تک شائع کرتے رہے۔ اور بند کرنا ہوا تو اعلان کر کے بند کیا۔ اس موقع پر شب خون کا انتخاب نمبر بھی شائع کیا۔ ایک صاحب نے اس کا اشاریہ بھی بنایا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ کچھ دن خبرنامہ شب خون چھپتا رہا پھر پیرانہ سالی نے فاروقی صاحب کو اسے بھی بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل میں جی جان سے لگے اور کئی کام کو پایہ تکمیل تک پہونچایا۔ اسی دور میں ان کا لاثانی شاہ کار ''کئی چاند تھے سرآسماں'' بھی منظر عام پر آیا۔ میں نے اس کی تحسین وستائش کی تو انہوں نے بالکل سچی بات کہی کہ تمھیں میری کون سی چیز ناپسند آئی ہے۔

۲۰۱۸ء میں ناچیز کی کتاب ''شبلی خود نوشتوں میں'' تیار ہوئی تو اس کا پیش لفظ لکھنے کے لئے میں نے فاروقی صاحب سے گذارش کی۔ یہ گذارش میل سے نہیں واٹس ایپ سے کی تھی۔ فاروقی صاحب اس وقت آن لائن تھے مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن بھی کوئی جواب نہیں آیا تو مجھے خیال ہوا کہ شاید مصروفیت بہت ہے اور وہ نہ لکھ سکیں گے۔ لیکن تیسرے دن علی الصبح ان کا فون آ گیا اور کہا کہ کل میں گر گیا تھا اور جب تک سنبھلتا کتابیں میرے اوپر آ گریں جس سے ہاتھ میں کچھ تکلیف ہو گئی ہے۔ اس لئے اب تمہارے کام میں تاخیر ہوگی۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں اللہ آپ کو صحت دے اور سلامت رکھے۔ البتہ مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ میرے خط کے جواب کے بجائے سیدھا پیش لفظ لکھ کر بھیجنا چاہ رہے تھے۔ لیکن پھر چار پانچ دن بعد ہی پیش لفظ لکھ کر بھیج دیا۔ اور ایسا شاندار پیش لفظ لکھا کہ آج تک میری کسی کتاب پر شاید ہی کسی اہل قلم نے ایسا پیش لفظ لکھا ہو۔ اس پیش لفظ میں انہوں نے تین باتیں لکھی ہیں۔ پہلی یہ کہ کسی ایک موضوع پر کام کرنے کی کیا شرائط ہیں۔ وہ لکھتے ہے:

> ''کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے کسی ایک مصنف کی زندگی اور تحریروں کے مطالعے کے لئے اپنی عمر وقف کر دی ہو اور ان کے مطالعات کا ثمرہ قابل قدر تصنیفات کی صورت میں بھی سامنے آیا ہو۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کے لئے اور شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ جس شخص کو اپنا موضوع

بنایا گیا ہو اس کی تحریروں میں اتنا تنوع اور اتنی قوت ہو کہ وہ تا زیست مطالعے
اور گہرے مطالعے کی متحمل ہوسکیں۔ پھر یہ بھی ایک شرط ہے کہ جس شخص نے
ایسے کام کا بیڑا اٹھایا ہو، وہ خود صلاحیت اور لیاقت رکھتا ہو اور اس کے مزاج
میں اتنی استقامت بھی ہو کہ ناسازگار حالات میں بھی اس کی لگن کم نہ ہو۔''

دوسری بات یہ لکھی کہ ہماری علمی تاریخ میں علامہ شبلی نعمانی کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟۔اس کی انہوں نے ایسی تصریح کی ہے کہ گذشتہ صدی میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے اپنے استاذ علامہ شبلی کو رازی و غزالی اور ابن تیمیہؒ سے تشبیہ دی ہے، مگر فاروقی صاحب فرماتے ہیں:

حجت الاسلام علامہ شبلی نعمانی نے بہت کم عمر پائی۔ ان کا زمانہ تصنیف و تالیف و
تدریس بھی نسبتاً بہت مختصر تھا، لیکن بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ صرف
تصنیفات ہی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ موضوعات کے تنوع، مطالعے کی
وسعت، تفکر کی گہرائی اور گیرائی اور استحضار علم کے اعتبار سے ان کا ثانی
مسلمانوں میں علم کی بہار کے زمانے میں البیرونی، بوعلی، غزالی جیسوں میں تو
مل سکتا ہے، لیکن شبلی کے اپنے زمانے سے لے کر آج تک شبلی کا ثانی تو کیا ایسا
بھی کوئی نہ ہوا جسے ہم شبلی کا ظل کہہ سکیں۔

فاروقی صاحب کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر میں علامہ شبلی کا مرتبہ کس قدر بلند تھا۔ اس کے بعد انہوں نے میری اور میری کتاب کی انفرادیت کا بڑے محبت آمیز انداز میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

شبلی پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن سوانح کے نقطۂ نظر سے اور علمی مباحث کے نقطۂ
نظر سے بھی بہت چھان بین ابھی باقی ہے۔ ہمارے دوست محمد الیاس الاعظمی
نے پوری زندگی مطالعۂ شبلی میں گذار دی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اب
شبلی اور الیاس الاعظمی لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ الیاس الاعظمی نے اب تک شبلی
پر بارہ کتابیں لکھی یا مرتب کی ہیں، اور ہر ایک میں شبلی کی علمی یا سوانحی زندگی کو

کسی نئے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے۔ان میں 'شبلی شناسی کے سو سال'، 'شبلی اور جہان شبلی'، 'نوادرات شبلی' اور 'متعلقات شبلی' کو خاص دلچسپی سے دیکھا گیا ہے۔اب الیاس الاعظمی نے ایک بالکل نیا موضوع دریافت کیا ہے: شبلی کا ذکر خودنوشتوں میں۔ یہ موضوع کچھ ایسا غیر متعین سا ہے کہ اس کا نہ کوئی نقطۂ آغاز ہے اور نہ نقطۂ انجام۔ پھر بھی، الیاس الاعظمی نے کم و بیش چوبیس ایسی خودنوشتیں تلاش کی ہیں جن میں شبلی کا ذکر کسی اہم انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ تعداد کم نہیں، بلکہ بڑی حد تک استعجاب انگیز ہے۔اتنے بہت سے اہم لوگوں نے شبلی کا ذکر اپنی خودنوشت میں کیا، یہ امر بجائے خود شبلی کی عظمت اور اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔

محمد الیاس الاعظمی نے حسب معمول دقت نظر سے کام لیا ہے اور شبلی شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔خدا ان کی کوششوں کو مزید ترقی دے۔شبلی کو الیاس الاعظمی جیسا جاں نثار زیب بھی دیتا ہے۔اللہم زد فزد۔

شمس الرحمٰن فاروقی

شب خون۔الہ آباد

۱۳؍ستمبر ۲۰۱۸ء

''شبلی خودنوشتوں میں'' کے بعد ناچیز نے کلام شبلی کے اعلام و اشخاص پر کام شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی فرہنگ کلام شبلی بھی تیار کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ یہ میرے لئے بالکل نیا موضوع تھا اور فاروقی صاحب اس کے مرد میداں تھے، چنانچہ میں نے ان کی کتاب ''لغات روزمرہ'' منگائی اور فاروقی صاحب کو لکھا کہ میں فرہنگ کلام شبلی تیار کرنا چاہتا ہوں۔آپ کی لغات روزمرہ منگا لی ہے اور اس سلسلہ میں آپ کے مفید مشوروں کا متمنی ہوں۔اس کے جواب میں ان کا چند سطری خط آیا۔اور واقعہ یہ ہے کہ ایسا صائب مشورہ وہی دے سکتا ہے جو موضوع پر انتہائی گہری نظر رکھتا ہو۔انہوں نے لکھا کہ

''لغات روزمرہ اس کام کے لئے بیکار ہے۔نور اللغات اور آصفیہ اشد ضروری

ہیں۔ فارسی کا ایک لغت مثلاً ''بہارعجم'' یا آنندراج بھی رکھیں۔ فیروزاللغات
اورفرہنگ عامرہ سے دوررہیں۔ بہار یا آنندراج نہ ملیں تو بدرجہ مجبوری کشوری
کودیکھیں۔'' (۲۹رجون۲۰۲۰ء)

سچ ہے فاروقی صاحب جیسے اہل علم اور باکمال اشخاص صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جتنے بڑے ادیب ونقاد تھے، اتنے ہی بڑے زباں داں اور ماہرلغات بھی تھے۔ تنقید کے متنوع پہلوؤں پر وہ عالمانہ نظر رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک بڑے شاعر، افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ جس طرح شعرشورانگیز کبھی نظر انداز نہیں کی جا سکے گی اسی طرح ''کئی چاند تھے سرآسماں'' سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکے گا۔ اس ناول کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا کہ کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سرمایہ ہماری زبان کا راس المال ہے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ فاروقی صاحب میری تحریریں پڑھتے تھے۔ اغلاط کی نشاندہی کرتے، حوصلہ افزائی کرتے۔ یہی نہیں مجھے اردو اکادمی لکھنؤ اور مغربی بنگال اردو اکادمی کے انعامات ملے تو انہوں نے مبارک باد دی اور تہنیتی کلمات کہے۔ شبلی کالج کے شعبہ اردو نے مجھے ''امتیاز شبلی'' سے سرفراز کیا اور اس کی خبر اخبارات میں مع تصویر شائع ہوئی تو انہوں نے میرے بیٹے سے کہا کہ میری مبارک باد پہنچا دینا اور یہ تمہارے باپ نے اپنے بال ابھی سے گنوا دئے، کہو کم محنت کرے۔ یہ شفقت آمیز باتیں اب افسانہ ہوگئیں۔

میرا بیٹا الہ آباد میں بی ٹیک کر رہا ہے اس لئے چند برس سے یہ سہولت ہوگئی تھی کہ وہ فاروقی صاحب سے ملاقات کے لئے چلا جاتا، کتابیں اور سلام پہنچا دیتا، اور وہاں سے خیر وعافیت کی اطلاع کے ساتھ کتب ورسائل بھی لے آتا۔ اب مجھ سے زیادہ وہ اس سے خوش رہنے لگے تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو مجھ پر جو بیتی وہ بیتی میرے بیٹے کو بھی بہت قلق ہوا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　　افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

میری آخری کتاب جو ان کی خدمت میں پہونچی وہ مقالات کا مجموعہ ''نقوش شبلی'' تھی۔ اس کے بارے میں فاروقی صاحب کا دوسطری واٹس ایپ میسج آیا کہ ''باوجود ضعف بصارت زیادہ تر اسی وقت پڑھ لیا۔ لاجواب کتاب ہے۔'' (۹راکتوبر۲۰۲۰ء)

اس کے بعد وہ بیمار ہو گئے۔ کرونا کی زد میں آئے۔ الہ آباد سے دہلی منتقل ہوئے۔ احباب سے خیر و عافیت معلوم کرتا رہا۔ پہلے مایوس کن خبریں آئیں، پھر اطلاع ملی کہ اب بہتر ہیں۔ کئی بار پروفیسر احمد محفوظ صاحب سے خیر و عافیت معلوم کی، لیکن ۲۵ر دسمبر [۲۰۲۰ء] کو ان کی وفات کی خبر ملی۔ میں اس وقت لکھنؤ علاج کے لئے گیا ہوا تھا۔ الہ آباد نہ جا سکا۔ اس طرح آخری بار ان کو نہ دیکھ سکا اور نہ ایک مٹھی مٹی دے سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

اپریل ۲۰۲۰ء میں ان کے یار غار ڈاکٹر ابرار اعظمی نے وفات پائی تو میں نے ہمت کر کے انہیں مطلع کیا۔ انہیں بڑا سخت صدمہ پہنچا اور کہا کہ اب جی کے کیا کریں گے۔ کس کو معلوم تھا کہ اب وہ بھی تیار بیٹھے ہیں۔ دوسرے دن فون آیا کہ ابرار خاں پر کچھ لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے تم ایک اچھا سا مضمون لکھ دو۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں مضمون لکھا تو بہت پسند کیا اور اسے اوراق سبز ڈاٹ کام (auraqesabz.com) اور ہماری زبان دہلی میں شائع کرایا۔ اور مجھے لکھا کہ یہ مضمون ان کے بیٹے شہاب کو بھی بھیج دو۔

ان دونوں کے درمیان بڑا گہرا یارانہ تھا۔ دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ میاں جی اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور کے ہم سبق تھے۔ دونوں نے میدان شعر و ادب میں ساتھ ہی قدم رکھا۔ اسلامیہ انٹر کالج میگزین میں دونوں کی تخلیقات چھپی ہیں۔

ابرار اعظمی صاحب نے ان پر متعدد مضامین لکھے۔ ایک مضمون میں فاروقی صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی مکمل فہرست درج کی ہے اور ان کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ فاروقی صاحب کے ابتدائی دور کے بعض افسانے اور ناولٹ جو فاروقی صاحب کے پاس محفوظ نہیں تھے ابرار صاحب کے پاس محفوظ تھے، ان کو یکجا کر کے حواشی اور ضروری تعلیقات کے ساتھ ''باز یافت'' کے نام سے شائع کیا۔ فاروقی صاحب بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے، ان کی آخری کتاب تنقیدی معاملات کا انتساب ڈاکٹر ابرار اعظمی کے نام ہے۔ ابرار اعظمی صاحب تو ان کے ایسے عاشق زار تھے ان کی ساری گفتگو کا خاتمہ فاروقی صاحب پر ہوتا تھا۔ مجھے ان دونوں بزرگوں کی شفقت حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کی وفات سے میں خود کو یکہ و تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے صرف نظر کرے اور ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

ناچیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مہراج پور میں ۲۳ر ستمبر ۱۹۶۶ء کو بروز جمعہ صبح ساڑھے آٹھ بجے پیدا ہوا۔ یہ تاریخ پیدائش والد مرحوم کی ڈائری میں درج ہے اور یہی تاریخ میری اسناد میں بھی ہے۔

میرا گاؤں مہراج پور جس کے بازار کا نام انور گنج ہے، شہر اعظم گڑھ سے ۵ر کلو میٹر شمال مغرب میں شاہراہ فیض آباد پر واقع ہے۔

میں نے ناظرہ اور دینیات کی تعلیم والد مرحوم حاجی عبدالرزاق [۱۹۱۸-۱۹۹۶ء] بانی مدرسہ اسلامیہ انور گنج سے حاصل کی۔ کچھ دنوں تک گاؤں کے مکتب میں حافظ ادریس صاحب سے ناظرہ اور دینیات کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مکتب کی تعلیم کے لئے مدرسہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں داخل ہوا۔ والد مرحوم کی خواہش تھی کہ سند یافتہ عالم بنوں، مگر گھر کے مالی حالات اس قدر خراب تھے کہ تعلیم ادھوری رہی اور میں چند سال بعد گاؤں واپس آ گیا۔ والد صاحب کو بہت قلق ہوا۔ انہیں تعلیم کی اہمیت بخوبی معلوم تھی۔ گاؤں میں ان کے علاوہ کوئی شخص تعلیم یافتہ نہ تھا۔ وہ ۱۹۳۲ء کے مڈل پاس تھے اور بڑی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ گاؤں کی مسجد، مکتب اور قبرستان کے وہی ناظم و متولی تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند حتیٰ کہ اشراق اور چاشت کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ ایک بزرگ مولوی سعید احمد خاںؒ سے بیعت تھے۔ ان کے مقرر کردہ اوراد و وظائف کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ انہیں قرآن پاک سے بڑا شغف تھا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ [۱۸۶۳-۱۹۴۳ء] کا ترجمہ قرآن اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ [۱۸۸۷-۱۹۴۹ء] کی تفسیر مسلسل ان کے مطالعہ میں رہتی تھی۔ حکیم الامت ''بہشتی زیور'' پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اکثر اس کا مطالعہ

کرتے اوراسی سے مسئلے مسائل بتاتے۔انہیں کودیکھ کر مجھےاولاً مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔والدمرحوم کی عدم موجودگی میں ان کی الماری سے کتابیں نکال کر میں بھی پڑھا کرتا تھا۔والدمرحوم کی الماری میں مذکورہ کتابوں کے سوا چند اور دینی رسائل تھے۔جب میں انہیں بھی پڑھ چکا تو مزید کتب کی احتیاج ہوئی۔چنانچہ شہر اعظم گڑھ کے مکتبات سے چند کتب خرید کر پڑھیں اور انہیں کتب کی مدد سے پہلے گاؤں کی مسجد میں، پھر اپنے گھر پر ایک کتب خانہ قائم کیا۔اس کی تمام دیکھ بھال میں خود ہی کرتا تھا۔میں خود ہی اس کا قاری بھی تھا اور خود ہی منتظم بھی۔میرے اس شوق کو میرے گاؤں کے لوگ بیکاری کا مشغلہ تصور کرتے تھے اور مذاق اڑایا کرتے تھے۔اس میں کبھی کبھی خود میرے اپنے بھی شامل ہوجایا کرتے تھے۔

اس کے بعد میں ایک دوست کے ساتھ کتابت سیکھنے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی آ گیا۔ یہاں کتابوں کا ذخیرہ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔بہت بڑا کتب خانہ، ہزاروں کتابیں اور سیکڑوں رسائل کی موجودگی نے مجھے ایک نئی دنیا سے آشنا کیا۔یہاں سے میری نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ادھوری تعلیم کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا اور کسی طرح خود کو ریزہ ریزہ جوڑ کر تعلیم کا آغاز کیا۔ چنانچہ پھر سے زندگی معمول پر آ گئی۔میں روزانہ بلاناغہ کتب خانہ دارالمصنّفین پہنچنے لگا۔ریڈنگ روم کی میز پر لگے سیکڑوں رسائل کی ورق گردانی نے میری دنیا ہی بدل دی۔نئے رسائل، نئے شہر، نئے مدیر اور تمام نئے پرانے اہل قلم سے اسی کتب خانہ اور انہی رسائل کے ذریعہ واقف ہوا۔ہر روز ایک رسالہ کا مطالعہ معمول بنالیا اور جب تک کتب خانہ بند نہ ہوجاتا مطالعہ میں مشغول رہتا۔چونکہ سیکڑوں کی تعداد میں رسائل آتے تھے۔سب کا مطالعہ ممکن نہ ہوتا تو منتخب رسائل کے مطالعہ کا سلسلہ شروع ہوا۔اور جیسے جیسے مصروفیات بڑھیں انتخابات کا سلسلہ بھی اسی قدر بڑھا۔آخر میں یہ معمول ہوگیا تھا کہ اداریہ، مطبوعات جدیدہ اور چند منتخب مقالات تک سلسلہ مطالعہ محدود ہوکر رہ گیا تھا۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ قدیم رسائل کی فائلیں نکلوا کر دیکھیں۔ایک زمانہ میں رسائل سے عجب دلچسپی ہوگئی تھی۔دارالمصنّفین میں محفوظ پچاسوں رسائل کے قدیم شمارے نکال کر دیکھے۔ اس سے میری معلومات میں بے حد اضافہ ہوا اور خاص طور سے اردو کی علمی صحافت پر پوری نظر ہوگئی تھی اور چونکہ اس زمانہ میں رسائل کے اشاریے شائع نہیں ہوئے تھے، اس لئے رسائل کی

ورق گردانی نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے احباب کے لئے بھی بڑی مفید ثابت ہوئی۔

جب کسی رسالے میں کوئی تحریر پڑھتا اور تشنگی بڑھ جاتی تو کتب خانہ سے اس موضوع کی دیگر کتابیں مطالعہ کرتا اور کوشش کرتا کہ مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے میری معلومات اس سے بڑھ جائیں۔مطالعہ کا یہ معمول ایم اے تک جاری رہا۔اور بلا مبالغہ میں اس طریقہ کار سے ہندو پاک کے سیکڑوں رسائل سے نہ صرف واقف ہوا بلکہ غور و تحقیق سے ان کا مطالعہ کرتا رہا۔متعدد رسائل میں اولاً مراسلے لکھے جو شائع بھی ہوئے۔رسائل میں مجھے ترجمان الاسلام بنارس، ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ، معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ آج کل دہلی،فکر ونظر اسلام آباد،فکر ونظر علی گڑھ، ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ،نوائے ادب ممبئی، ماہنامہ برہان دہلی وغیرہ سے میں بہت متاثر ہوا۔ معارف اور فکر ونظر علی گڑھ اور اسلام آباد دونوں کو تو میں دل و جان سے پسند کرتا تھا اور ان کا بڑی بے صبری سے انتظار رہا کرتا تھا۔یہ دونوں رسائل اب بھی میری نگاہ میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور معارف تو اب بھی حرز جاں بنا ہوا ہے۔البتہ حالات نے فکر ونظر اسلام آباد سے محروم کر دیا۔

ایم اے کے زمانہ میں ادبیات کے گہرے مطالعے کا موقع ملا۔اردو ادب کی تمام بنیادی کتابیں جو نصاب کے علاوہ تھیں سب کو دارالمصنّفین میں بیٹھ کر پڑھا۔ دارالمصنّفین کی تمام مطبوعات اسی زمانہ میں پڑھیں۔میں آج بھی دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ الفاروق، سیرۃ النبیؐ اور شعرالعجم جیسی بلند پایہ کتابیں اب تک اردو میں لکھی ہی نہیں گئیں۔یہ کتابیں نہ صرف علمی اور فکری تشنگی بجھاتی ہیں بلکہ زبان و ادب اور اسلوب کی دلکشی اور رعنائی کی لذت سے بھی ہم کنار کرتی ہیں۔دارالمصنّفین کے سابق ناظم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی [۱۹۰۳-۱۹۷۴ء] علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] اور مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کی تصانیف کے مطالعہ کو ہر اس شخص کے لئے ضروری قرار دیتے تھے جو قلم پکڑنا اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی [۱۹۰۸-۱۹۸۵ء] جس زمانہ میں شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر تھے وہ ریسرچ اسکالرس کو پہلا مشورہ یہ دیتے تھے کہ المامون، الفاروق، شعرالعجم حیات شبلی اور خیام وغیرہ کا اہتمام سے مطالعہ کیجئے۔ان کا خیال تھا کہ ان کتابوں سے نہ صرف مطالعہ و تحقیق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ لکھنے پڑھنے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔علمی نثر لکھنے اور علمی انداز میں

تحقیق وتجزیہ کے لئے ان کتابوں کے اسلوب وانداز نگارش سے واقفیت انتہائی ضروری ہے۔

مجھے یہ کتابیں بلکہ دارالمصنّفین کی تمام مطبوعات کے مطالعہ کا موقع زمانہ ایم اے تک میسر آ گیا تھا اور انہیں کی بدولت میں نے لکھنے پڑھنے کا آغاز کیا اور الحمداللہ معارف، الرشاد، فکر و نظر اسلام آباد، فکر ونظر علی گڑھ، برہان دہلی، ترجمان الاسلام بنارس اور ملک کے پچاسوں معتبر اور موقر رسائل میں دور طالب علمی میں مضامین ومقالات لکھے۔

اس دور میں میرے دوست حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی رفیق دارالمصنّفین نے میری بڑی رہبری اور رہنمائی کی۔ دارالمصنّفین کا کتب خانہ جس کی ترتیب مولانا سید سلیمان ندوی نے اس انداز سے کرائی ہے کہ محققین کے لئے اس سے بڑی سہولت ہوتی ہے اور جس موضوع پر داد تحقیق دینی ہوتی ہے اس موضوع کی کتابیں یکجا بآسانی مل جاتی ہیں۔ اس سے مجھے بے حد فائدہ پہنچا۔ نہ صرف ادبیات بلکہ مختلف اسلامی علوم وفنون کی کتب سے اسی کی بدولت آشنا ہوا، اور گہرائی سے ان کا مطالعہ بھی کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ دارالمصنّفین ہی کی بدولت میرے ذوق علم وتحقیق و تصنیف کو جلا ملی۔

یہ عام بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو اس موضوع کی نہ صرف بنیادی کتب کا مطالعہ کرتا ہے بلکہ اس موضوع پر جہاں تک کام ہو چکا ہوتا ہے اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بنیادی باتیں مجھے مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] مدیر معارف اور میرے استاذ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمیؒ [۱۹۳۶-۲۰۰۵ء] نے بتائیں۔ چنانچہ میں یہ کوشش کرتا تھا کہ دارالمصنّفین کے کتب خانہ کے علاوہ دوسرے کتب خانوں مثلاً مدرسہ جامعۃ الرشاد کا کتب خانہ، یا شہر اعظم گڑھ کی ایک اور مشہور اور قدیم لائبریری مہتہ لائبریری اور بعض دوسرے کتب خانوں میں اپنے موضوع کی کتب تلاش کرتا۔ یہی نہیں کئی زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کر لیتا۔ اس کے بعد ہی قلم اٹھاتا تھا۔ مجھے اس کا ایک فائدہ یہ ملا کہ بہت جلد میری تحریریں اہل علم اور ممتاز اہل قلم کی نظر میں آ گئیں۔ اور ان کی داد تحسین نے میرا بڑا حوصلہ بڑھایا۔

ایم اے کے بعد ریسرچ یعنی پی ایچ ڈی کے لئے بڑے پاپڑ بیلے۔ بی ایچ یو سے مظفر پور بہار تک متعدد یونیورسٹی کے چکر کاٹے۔ بالآخر شبلی نیشنل میں ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی صدر شعبہ

اردو کی زیرنگرانی مقالہ لکھنے کا موقع ملا۔ ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات'' موضوع قرار پایا۔ چنانچہ اس دور میں دارالمصنّفین کی تاریخی کتابوں کا اہتمام سے مطالعہ کیا۔ یہی نہیں جن تاریخی موضوعات پر دارالمصنّفین نے کتابیں شائع کی ہیں ان پر دوسرے اداروں اور دوسرے مصنّفین نے کون سی کتابیں لکھیں یا شائع کی ہیں، نہ صرف معلوم کرتا بلکہ ان کا بھی مطالعہ اسی ذوق وشوق اور غور وفکر کے ساتھ کیا کرتا اور ساتھ ساتھ موازنہ وتقابل بھی کیا کرتا۔ اور یہ خوبی تحریروں میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب مطالعہ میں گہرائی اور گیرائی ہو۔

یہ رسمی مطالعات تھے۔ اس کے بعد استاذی مولانا مجیب اللہ ندویؒ [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] نے ماہنامہ الرشاد کی مجلس ادارت میں شامل کر کے اولاً تعارف وتبصرہ کتب کا کام سونپا۔ یہاں ایک بڑے مرحلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ چاہے جس موضوع کی کتاب ہو آپ کو تبصرہ کرنا ہے۔ میں نے اس پریشانی سے حضرۃ الاستاذ کو آگاہ کیا تو انہوں نے بڑا صائب مشورہ دیا اور کہا کہ جب کسی کتاب پر تبصرہ کرنا ہو اس موضوع کی چند بنیادی کتابوں کا مطالعہ کرلیا کرو، اس کے بعد تبصرہ کیا کرو، اس سے یہ مشکل بآسانی حل ہو جائے گی۔ چنانچہ جب تک میں نے ماہنامہ الرشاد میں کتابوں پر تعارف وتبصرہ لکھتا رہا، اس وقت تک اس کا اہتمام کرتا رہا اور پھر اس کی ایسی عادت پڑ گئی کہ جب تبصرہ لکھتا اس موضوع پر دو ایک کتابوں کو پڑھ ہی لیتا۔ اس سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا۔ اخیر میں اس مطالعہ میں کسی قدر کمی آ گئی تھی، تاہم مطالعہ کا یہ سلسلہ اب بھی کسی قدر باقی ہے۔

میں نے جس زمانہ میں تصنیف وتالیف کی طرف توجہ کی میرے احباب اور بزرگ تذکروں کی تصنیف وتالیف میں مصروف تھے۔ مثلاً دارالمصنّفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی ''تذکرۃ المحدثین'' لکھ رہے تھے۔ حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی ''تذکرۃ الفقہا'' اور مولانا محمد عارف عمری صاحب ''تذکرہ مفسرین ہند''۔ یہ دارالمصنّفین کے پروجیکٹ تھے اور انہیں دارالمصنّفین کے اہل علم اور ارباب حل وعقد کے مشورے سے تفویض کئے گئے تھے۔ میں نے خود سے ''تذکرۃ القراء'' کا انتخاب کرلیا اور الحمد للہ تمام مصادر کتب کے حوالہ سے اسے قلم بند کیا۔ باوجود عربی زبان سے ناواقف ہونے کے میں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ صرف عربی زبان پڑھی بلکہ اس موضوع کی تمام کتابیں کتب خانہ سے نکال کر پڑھیں اور ان کے حوالے دئے۔ پروفیسر محمد

یٰسین مظہر صدیقی مرحوم سابق صدر ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنی کتاب ''اندلس میں علوم قرات کا ارتقاء'' میں ''تذکرۃ القراء'' کو اردو زبان میں اپنے موضوع کی اولین کاوش قرار دیا ہے۔اس سے زیادہ میرے لئے فخر کی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد نہ جانے کب خود بخود میرا موضوع تحقیق وتصنیف شبلیات ہوگیا اور میں اس میں اس قدر منہمک ہوا کہ وقت کے گذر جانے کا احساس تک نہیں ہوا۔اب تک میری اس موضوع پر ۲۰ ر کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

علامہ شبلی کی تصانیف کا مطالعہ ناچیز طالب علمی ہی میں کر چکا تھا۔تاہم وہ اس قدر دلچسپ اور دلنشین انداز واسلوب میں ہیں کہ اب بھی ان کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔میں جب اس موضوع پر لکھنے لگا تو علامہ شبلی پر لکھی جانے والی کتابوں کا سلسلہ وار مطالعہ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف تصانیف شبلی بلکہ مطالعہ شبلی میں لکھی جانے والی بیش تر کتابوں کا یہ حقیر مطالعہ کر چکا ہے۔البتہ اس موضوع کی تین چار ایسی کتابیں ہیں جو کہیں سے ابتک دستیاب نہیں ہوسکی ہیں اور ان کے محض جا بجا حوالے ملتے ہیں۔ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

شبلیات پر نہ صرف کتابوں کے مطالعہ کا اہتمام کیا بلکہ موضوع زیر تحریر سے متعلق متعدد مضامین ومقالات اور تبصروں اور تجزیوں کا بھی مطالعہ کیا۔اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کی بدولت ''کتابیات شبلی'' پایہ تکمیل کو پہنچی۔

میرے مطالعہ کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جس موضوع پر لکھنا ہوتا اس موضوع کی کتب تلاش کرتا اور مطالعہ کرتا رہتا۔میرے مطالعہ کا کوئی وقت متعین نہیں رہا۔جب موقع ملتا کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔لیکن مجھے احساس ہے کہ آہ سحر گاہی کے اوقات میں جس طرح دعائیں قبول ہوتی ہیں اسی طرح حافظہ بھی بہت ساتھ دیتا ہے اور وہ بہت کچھ اخذ وقبول کرتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کا مطالعہ بہت مفید رہا اور ہمیشہ کام آیا۔

علامہ شبلی بھی یوں تو ہمہ وقت کتابوں کے مطالعہ اور تلاش وتفحص میں سرگرداں رہتے تھے، لیکن ان کے مطالعہ کا خاص وقت بھی صبح ہی کے اوقات رہے۔وہ تو محض دو گھنٹے تصنیف وتالیف کا کام کرتے تھے۔بقیہ اوقات میں کتابیں الٹ پلٹ کے دیکھا کرتے تھے اور یہی طریقہ ہمارے

بہت سے اسلاف کا رہا ہے۔ میرا طریقہ کار یعنی جب موقع ملا مطالعہ شروع کر دیا، قطعی طور پر مفید نہیں بلکہ صحت خراب اور برباد کر دینے والا طریقہ ہے۔ میرے بعض بزرگ اور بعض احباب میری خرابی صحت کا ذمہ دار میری مطالعاتی اور تصنیفی زندگی ہی کو قرار دیتے ہیں۔ بہر حال ایک متعینہ وقت پر مطالعہ کرنا زیادہ مفید اور نفع بخش ہے۔

مطالعہ کے دوران اہم اور ضروری باتوں کو میں نے نقل کرنے کا ہمیشہ اہتمام کیا۔ خاص طور پر جو موضوع زیر تحقیق رہتا اس سے متعلق تمام باتوں کو کوعلاحدہ نوٹ کرتا جاتا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا کہ اپنی بات مرتب اور مدلل انداز میں قلم بند کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دیگر اہل قلم کے بنیادی خیالات سامنے رہتے ہیں اور ان کا حوالہ بآسانی دیا جاسکتا ہے۔ چاہے حمایت میں ہو یا مخالفت میں۔ تائید میں ہوں یا تردید میں۔ فٹ نوٹس تیار کرنے کا اہتمام میں نے ہمیشہ انجام دیا اور آج بھی اس کا اہتمام کرتا ہوں۔

اس اہتمام سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے کے بعد مخالف وموافق آرا و خیالات کی علاحدہ علاحدہ درجہ بندی کی جاسکتی ہے اور پھر سنہ کے اعتبار سے تقسیم کر کے عہد بہ عہد کا جائزہ پیش کیا جاسکتا ہے اور اپنی بات کو مستحکم کرنے کے لئے ادوار اور سنہ کی تعیین بھی بآسانی کی جاسکتی ہے۔ یہ باتیں تحقیق وتنقید کے ضمن میں آتی ہیں۔ اگر نظریاتی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اس کا اہتمام خاص طور پر کیا جانا چاہئے۔ گو میں نے اس طرح کا کام کم کیا ہے، مگر جس قدر کیا اس میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔

مجھے ایک زمانہ میں تمام بڑے اردو کے ادیبوں اور نقادوں کے اہم خیالات بالخصوص تنقیدی نظریات جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ میں نے معروف اور مشہور مصنّفین کی کتابوں سے اس طرح کے متعدد اقوال اور اقتباسات جمع کئے تھے اور جب کوئی ضرورت در پیش ہوتی ان پر ایک نظر ڈال لیتا۔ افسوس یہ خزینہ مکان میں پانی آجانے سے ضائع ہو گیا۔

مجھے مختلف موضوعات کی کئی کتابوں مثلاً موازنہ انیس ودبیر، اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر تاریخ اعظم گڑھ، اسفار مجیب، متاع رفتگاں وغیرہ مرتب کرنے کا موقع ملا۔ موازنہ انیس و دبیر کے مرتب کرنے میں میں نے نہ صرف انیس و دبیر اور مونس وخلیق کے مراثی کا مطالعہ کیا بلکہ بعض

دیگر مرثیہ گویوں کو بھی دقت نظری سے پڑھا۔ انیس کے مراثی کے جو بند علامہ شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' میں نقل کئے ہیں ان کی تصحیح و تخریج کے لئے میں نے مراثی انیس و دبیر کا ایک اشاریہ تیار کیا تھا۔ اس میں اولاً مراثی کے پہلے بند نقل کر لئے اور اسی کو بنیاد بنا کر موازنہ میں درج تمام اشعار کی تصحیح کی۔ موازنہ انیس و دبیر میں اکثر کے حوالے تو مل گئے، مگر چند بند ایسے بھی تھے جن کی نشاندہی نہ ہوسکی۔ میرا خیال ہے شعر و ادب کے مطالعہ میں یہ طریقہ مطالعہ بے حد نفع بخش اور مفید ہوسکتا ہے۔ مجھے اس طریقہ کار سے بلاشبہ بہت فائدہ ہوا، یعنی کم وقتوں میں زیادہ کام ہوا۔ افسوس یہ اشاریہ مراثی انیس و دبیر بھی ضائع ہو گیا۔

مطالعہ بلاشبہ دل و دماغ کو جلا بخشتا ہے۔ نئے نئے موضوعات اور نئے نئے خیالات مطالعہ ہی سے جنم لیتے ہیں۔ مطالعہ میں یہ امر بھی ضروری ہے کہ کم از کم طالب علمی تک کسی مخصوص موضوع کا مطالعہ نہ جائے بلکہ ہر طرح کی کتب زیر مطالعہ رہنی چاہئے۔ وسعت فکر و نظر بالخصوص وسعت قلبی کا دار و مدار متنوع موضوعات کے مطالعہ و مشاہدہ اور تنقیح و تجزیہ پر مبنی ہے۔ میرے استاد مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے ''الم غلم''، ہر طرح کی کتابیں پڑھا کرو۔

مطالعہ اور کتب بینی کے بارے میں تمام بڑے اہل علم اور ارباب کمال نے اپنے تجربات اور مشاہدات قلم بند کئے ہیں۔ اس پر متعدد کتب بھی شائع ہوئی ہیں۔ ماہنامہ آجکل دہلی میں ''غبار کارواں'' کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھا گیا ہے۔ اس میں مطالعہ کے سلسلہ میں بڑی مفید باتیں آ گئی ہیں اور بلاشبہ وہ بڑے مفید واقعات پر مشتمل ہیں۔ ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک اور نظریہ یہ ہے کہ تحصیل علم کے بعد منتخب اہل علم و کمال اور منتخب علوم و فنون یا موضوعات پر اپنے مطالعہ کو مرکوز رکھنا زیادہ بہتر اور زیادہ مفید ہے۔

اردو اہل علم و قلم کے دبستانوں میں سب سے ممتاز دبستان شبلی ہے۔ اس کی کتب و رسائل میں یہ خصوصیت پوشیدہ ہے کہ ان سے لکھنے اور تصنیف و تالیف کا ہنر آتا ہے۔ اس لئے میں بھی منتہی طلبہ کو دبستان شبلی کے مصنّفین کی کتب کا مشورہ دیتا ہوں۔ مجھے خود اسی دبستان کی کتب کے مطالعہ سے یہ ہنر ہاتھ آیا۔ میری سب سے پسندیدہ کتاب تو قرآن مجید ہے اور میری ہی نہیں سب کی

پسندیدہ ہے اور جو سب کے لئے نازل ہوئی ہے۔ میں اس کے مطالعہ کے ساتھ علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ کو خاص طور پر مطالعے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اس لئے کہ شہنشاہ کونین کے دربار میں ایک انسان کا شاید یہ سب بڑا اور سب سے خوب صورت نذرانہ ہے۔ انسان ہی نہیں احکم الحاکمین نے بھی انسانیت کی معراج کمال اسی کے مطالعہ وعمل میں پوشیدہ رکھی ہے۔

میرے مطالعہ کتب کا آغاز تو ذوق وشوق سے ہوا، لیکن پھر یہ عادات واطوار میں شامل ہوگیا۔ میرا مطالعہ اولاً محض علم ومعلومات کے لئے تھا، بعد ازاں غور وفکر کا سلسلہ خود ہی قائم ہوگیا اور آخری مرحلہ یہ آیا کہ اس میں تحقیق وتدقیق کے پہلو شامل ہو گئے۔ ارتقاء کی یہ تصویر خود بخود پیدا ہوئی۔ اس میں کسی اصول کی قطعی طور پر کوئی کارفرمائی نہیں تھی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ مطالعہ کا ارتقاء شعوری نہیں بلکہ لاشعوری ہے اور یہ خود بخود ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔

میرے پسندیدہ مصنّفین میں سرفہرست علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تلامذہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد بھی کی کتب نے بھی میرے ادبی ذوق کو جلا بخشی ہے۔ میں نے مولانا سعید انصاری کو بھی غور سے پڑھا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی میرے پسندیدہ مصنّفین میں شامل ہیں۔ میرے استاد مولانا مجیب اللہ ندوی کی سادہ اور دلکش نثر نے بھی مجھے اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سابق ناظم دارالمصنّفین کی نثر نے بھی اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ غرض یہ کہ شبلی اور دبستان شبلی کے اہل قلم کی نثر بالخصوص ان کے سادہ، پرکشش اور دلکش اسلوب نے بے حد متاثر کیا ہے۔ اور ان کی کتابیں ہمارے ادبی ذخیرے کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کا مطالعہ بلاشبہ ذوق ووجدان پر اثر انداز ہوتا ہے۔

میں اپنے عہد کے دو نامور اہل قلم سے خاصا متاثر ہوا ہوں۔ ان میں ایک مشہور محقق رشید حسن خاں اور دوسرے آبروئے اردو نامور نقاد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم شامل ہیں۔ فاروقی صاحب کی تنقید کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ان کے اور بھی متنوع ادبی، تنقیدی اور تخلیقی کارنامے ہیں، تاہم ''شعر شور انگیز'' بلاشبہ ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ تخلیقی کارناموں میں ''کئی چاند تھے سر آسماں'' ان کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔

افسانے، ناول اور طنز ومزاح سے مجھے ذرا کم ہی سروکار رہا ہے، تاہم نسیم حجازی، رشید احمد صدیقی، مشتاق یوسفی اور مشتاق اعظمی کی کتب زیر مطالعہ رہی ہیں۔ نسیم حجازی کا اسلوب و آہنگ بے حد متاثر کن ہے۔ رشید احمد صدیقی کی کتاب ''طنزیات ومضحکات'' اب تک ذہن میں انبساط کا باعث ہے۔ آب گم اور شام شعر یاراں بھی اردو ادب کی بہترین یادگاریں ہیں۔ آخر الذکر پر کسی کو اعتراض ہوسکتا ہے، مگر مجھے اس میں مشتاق یوسفی پورے طور پر جلوہ گر نظر آئے۔ مشفق خواجہ کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ ان کتابیں علاحدہ رہیں۔ ایک تبصرے ''منشی یا منشی'' نے تو تنقید کی اک نئی دنیا سے متعارف کرایا۔ مشتاق اعظمی کے افسانوں کا مجموعہ نارسیدہ بھی ایک یادگار مجموعہ ہے اور آج نہیں تو کل اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

مطالعہ کی رفتار کے بارے میں رائے دینا کسی قدر مشکل کام ہے، اس لئے کہ میں خود کبھی اس پر قابو نہ پاسکا۔ کبھی کم، کبھی زیادہ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے گھنٹوں میں کتاب ختم اور کبھی چند صفحات کے مطالعہ میں گھنٹوں صرف ہوگئے ہیں۔ مطالعہ کے سلسلے میں نئے اہل قلم کے لئے میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ خود کو کسی خول میں بند نہ کریں اور کھلے ذہن سے تمام اہل قلم کی بنیادی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کسی ایک موضوع پر جا کر ٹھہر جائیں اور اس میں مہارت پیدا کریں اور کچھ کر گذرنے کے لئے مطالعہ میں ذرا بھی کوتاہی نہ کریں۔ ابتدائے زمانہ میں بارہا ایسا ہوا کہ کسی بڑے اہل قلم پر اعتماد کرلیا اور آگے چل کر معاملہ کچھ کا کچھ نکل آیا۔

مطالعہ کی رفتار میں اعتدال وتوازن باقی رکھیں، ورنہ صحت متاثر ہوگی اور کام کی رفتار بھی۔ ہاں غور وخوض کے لئے بھی وقت فارغ رکھیں، اس لئے کہ مطالعہ کا اصل حاصل اور جوہر اس کا ماحصل ہے۔ طلبہ کو اولاً اپنے اساتذہ کے زیر نگرانی مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس سے اساتذہ کے تجربات ومشاہدات سے استفادہ کا پورا موقع ملتا ہے۔ اور موضوع کے بنیادی امور تحقیق کا علم بالکل ابتدائی دور میں ہو جاتا ہے، جو خود کے برسوں کے مطالعہ کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا اور استاذ دفعتاً ان امور کو بہت آگے اور بہت بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ اور علم ومطالعہ اور تحقیق وتدقیق کی معراج کمال یہی ہے۔

•••

کتابیات

کتب

- آثارِ شبلی ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
- اذانِ سحر۔انور اعظمی، منشورات پبلشرز. دہلی، ۲۰۱۷ء
- ارمغان فاروقی ۔اطہر فاروقی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۲۰۱۹ء
- ارمغان کلام ۔مسعود الرحمٰن کلام جیراج پوری، بزم ادب جیراج پور
- اشاریہ اسلام اور عصر جدید دہلی ۔ پروفیسر اختر الواسع، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ۱۹۹۹ء
- اشاریہ ماہنامہ الرحیم ۔ڈاکٹر سفیر اختر، دارالمعارف راول پنڈی،۲۰۰۴ء
- اشاریہ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ،۲۰۰۴ء
- اشاریہ ماہنامہ برہان دہلی، ڈاکٹر شائستہ بیدار، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۹۵ء
- اشاریہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔محمد رضی الاسلام ندوی، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء
- اشاریہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، حکیم نعیم الدین زبیری، دائرہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۸۵ء
- اشاریہ جرنل، خدابخش لائبریری ۔خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۵ء
- اشاریہ ماہنامہ رحیق ۔ڈاکٹر سفیر اختر، دارالمعارف راولپنڈی،۲۰۰۴ء
- اشاریہ عالم اسلام اور عیسائیت ۔ڈاکٹر سفیر اختر، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،

اسلام آباد،۲۰۰۰ء

- اشاریہ علوم القرآن علی گڑھ، ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ،۲۰۰۵ء
- اشاریہ فکر ونظر اسلام آباد۔ شیر نوروز خاں، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد،۲۰۰۱ء
- اشاریہ معارف۔ جمشید احمد ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء
- اشاریہ معارف۔ محمد سہیل شفیق، قرطاس، جامعہ کراچی،۲۰۰۵ء
- افسانے۔ انور اعظمی، مکتبہ الحسنات دہلی،۲۰۱۶ء
- افکار سہیل۔ علی حماد عباسی رشوکت سلطان، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ،۱۹۵۷ء
- افکار وشخصیات۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، رامپور رضا لائبریری رام پور،۲۰۰۶ء
- بازیافت۔ ڈاکٹر ابرار اعظمی، سوسل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن خالص پور،۲۰۱۵ء
- بزم اشرف کے چراغ، پروفیسر احمد سعید، دارالکتاب دیوبند،۱۹۹۷ء
- تاریخ اعظم گڑھ۔ شاہ افضال اللہ قادری، ترتیب وتقدیم: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء
- تاریخ صحافت حصہ سوم، امداد صابری، کوٹہ راجستھان،۱۹۶۸ء
- تحقیقی مقالات۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،۲۰۰۳ء
- تذکرہ ماہ وسال۔ مالک رام، مکتبہ جامعہ دہلی،۱۹۹۱ء
- تذکرۃ القراء (طبع دوم)، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء
- تعلق بالقرآن اہمیت اور تقاضے، انیس احمد مدنی، ادارہ علمیہ، بلریا گنج اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
- توضیحی اشاریہ ہفتہ وار سچ لکھنو۔ ڈاکٹر عبدالعلیم قدوائی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ،۲۰۰۰ء
- توضیحی اشاریہ ہفتہ وار صدق لکھنو۔ ڈاکٹر عبدالعلیم قدوائی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،۲۰۰۰ء
- حضرت عبداللہ ابن عمرؓ۔ مولانا عبدالسلام ندوی، پنڈی بہاء الدین، گجرات
- جہاں آرا۔ مولوی محبوب الرحمٰن کلیم، مطبع فیض عام علی گڑھ،۱۹۰۶ء

- حیات جاوید۔الطاف حسین حالی،قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۱۹۹۷ء
- حیات شبلی۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- ڈاکٹر آدم شیخ حیات شخصیت اورفن۔ڈاکٹر شیخ عبداللہ، مجروح اکیڈمی ممبئی،۲۰۰۳ء
- رسالہ معارف کی اردو ادبی خدمات: ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ۔(مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ۲۰۰۹ء) عتیق احمد جیلانی، شعبہ اردو جامعہ سندھ جام شورو
- زندگی کا خزانہ، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، آر یہ پرنٹرس دہلی، ۲۰۱۶ء
- ساحلوں کے شہر میں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،طبع اول ۲۰۰۴ء
- سخنوران اعظم گڑھ (حصہ اول)۔مولانا قمر الزماں مبارکپوری، جعفریہ لائبریری مبارک پور، ۲۰۱۵ء
- سرمایہ امین۔امین اللہ امین اعظمی، مرتبہ مسلم اعظمی، نشان امین اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
- شبلی: خودنوشتوں میں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، نومبر ۲۰۱۸ء
- شبلی سخنوروں کی نظر میں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
- شبلی شناسی کے اولین نقوش۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء
- شبلی کی علمی و ادبی خدمات، ظفر احمد صدیقی، پبلی کیشن ڈویژن علی گڑھ، ۲۰۱۱ء
- شبلی معاصرین کی نظر میں۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۲۰۰۵ء
- شذرات شبلی۔اکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
- عظمت کے نشاں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء
- عکس و اثر۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء
- علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ۔(طبع اول) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۱ء
- علمی اجالے۔امیر حسن نورانی، راجہ رام کمار بک ڈپو لکھنو، ۱۹۵۹ء
- فہرست اخبارات ہند۔مولوی محبوب عالم، کارخانہ پیسہ اخبار لاہور، ۱۹۰۴ء
- قد اور سائے۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء

- کاروان رفتگاں ۔مولانا مجیب اللہ ندویؒ، ترتیب وتقدیم: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء
- کلام شبلی کے اعلام واشخاص۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء
- متاع رفتگاں۔شاہ معین الدین احمد ندوی، ترتیب وتقدیم: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
- محبت نامے۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء
- مطالعات ومشاہدات۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء
- مکاتیب شبلی (اول ودوم) مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، علی الترتیب ۲۰۱۰ء،۲۰۱۲ء
- مکتوبات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۲۱ء
- مقالات۔انور اعظمی، مکتبہ الحسنات دہلی،۲۰۱۶ء
- مقالات عبدالسلام ندوی۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۱۹۶۸ء
- مقالات عبدالسلام ندوی سمینار۔ہارون اعظمی، عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی،۲۰۰۶ء
- مقالات نذیر۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔۲۰۱۲ء
- مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی،۲۰۰۶ء
- مندرجات تہذیب الاخلاق۔ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ،۱۹۸۷ء
- مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار۔ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، علی گڑھ،۲۰۰۵ء
- نالہ شب۔انور اعظمی، مکتبہ الحسنات دہلی،۲۰۱۶ء
- ہندوستانی پریس۔نادر علی، اترپردیش اردو اکادمی لکھنو،۱۹۷۲ء
- یادِ سہیل۔مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ
- یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

رسائل

- اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۱ر اگست ۱۸۷۴ء، سرسید احمد خاں
- ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ اگست، ستمبر ۱۹۸۱ء، اپریل، مئی ۱۹۸۵ء، مدیر: مجیب اللہ ندویؒ
- سالانہ مجلّہ الاصلاح ندوہ لکھنو، ایڈیٹر: سید اشفاق عالم اصلاحی
- ماہنامہ العلم، چریا کوٹ، اگست ۱۹۱۶ء
- ہفت روزہ انقلاب رنگون۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۶۱ء
- باغ سخن میرٹھ: ستمبر، اکتوبر ۱۹۰۳ء
- روز نامہ پرواز رنگون۔ ۴ر اپریل ۱۹۶۱ء بحوالہ اذان سحر ص ۳۶
- پیام یار لکھنو۔ مئی ۱۸۹۱ء، جنوری تا جولائی ۱۸۹۲ء، فروری ۱۸۹۳ء
- سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، مدیر مولانا جلال الدین عمری
- سہ ماہی ترجمان الاسلام وارانسی۔ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء، مدیر مولانا اسیر ادروی
- تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مشاہیر علی گڑھ حصہ چہارم، مدیر: پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
- ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ مارچ ۲۰۰۰ء
- دامن گلچیں مراد آباد۔ فروری، مارچ، مئی ۱۸۹۹ء
- روز نامہ زمیندار لاہور۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۳ء، مدیر مولانا ظفر علی خاں
- ماہنامہ زندگی، رام پور۔ فروری ۱۹۷۰ء
- سہ ماہی سہیل، علی گڑھ۔ جنوری ۱۹۳۶ء، مدیر رشید احمد صدیقی
- ماہنامہ شمع آگرہ۔ دسمبر ۱۹۲۵ء
- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۸۸۱ء
- ماہنامہ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ۔ اکتوبر ۲۰۱۱ء، مدیر: پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی
- ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۳۱ء، ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۶ء، مارچ ۲۰۲۲ء

•••

ADBI DAIRA
AZAMGARH
E-mail: azmi408@gmail.com
Mob.: +91-9838573645

Price : 450/-